"اکبر الہ آبادی"

از

طالب الہ آبادی

مطبوعہ مطبع انوار احمدی الہ آباد

دفعہ دوم

قیمت فی جلد صہ ر

سیرت خاتم النبیین

مؤلفہ جناب مولوی حافظ سید جلال الدین احمد جعفری زینبی

یہ کتاب اُردو آسان زبان میں لکھی گئی ہے تاکہ ہر شخص جو عربی فارسی نہیں جانتا وہ بھی آسا
سمجھ کر اس سے فائدہ اُٹھائے۔ ۲۰×۲۶ رائل پر یعنی ۱۰ انچہ لمبی ۷ انچہ چوڑی تقطیع
صاف اور روشن خط میں چکنے سفید عمدہ کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔ حجم اس کا ۳۶۰ صفحہ کا
حسب ذیل مضامین ہیں

مقدمہ۔ عرب کا جغرافیہ۔ اہل عرب کے حالات۔ اُن کا سیاسی نظام۔ اُن کی جنگ و غارتگری۔ اُن کے
رسومات۔ اُن کے اخلاق۔ علوم۔ ادیان۔ مکہ معظمہ کا حال۔ حضورؐ کا سلسلۂ نسب۔ آپ کی ولادت۔ آپ کا
شغل تجارت اور حضرت خدیجہؓ سے آپ کا نکاح۔ آپ کی رسالت۔ قریش کی آپ سے مخالفت اور اس کے اسبا
مسلمانوں پر کفار کے مظالم۔ حضرت حمزہؓ اور حضرت عمرؓ کا اسلام لانا۔ حضورؐ کا شعب ابیطالب میں محصور ہو
ابوطالب اور حضرت خدیجہؓ کا انتقال۔ حضورؐ کا قبائل عرب کا دورہ۔ مدینۂ منورہ اور انصار۔ ہجرت کرنے والوں
قریش کی سختیاں۔ حضورؐ کا مدینہ ہجرت کرنا۔ مسجد نبوی اور حجروں کی تعمیر۔ اذان کی ابتدا۔ مہاجرین اور انصار میں
بھائی چارہ۔ اصحاب صفہ۔ مدینہ کے یہود سے معاہدہ۔ قبلہ کا بدلنا۔ سلسلۂ غزوات ۲ھ۔ یہود کی اسلام دشمنی
کعب اشرف کا قتل۔ صلح حدیبیہ۔ سلاطین کی دعوت اسلام۔ حضرت خالدؓ اور حضرت عمرو بن العاص کا اسلام۔
فتح مکہ۔ تبلیغ و اشاعت اسلام۔ وفود عرب۔ مسجد ضرار۔ غزوات نبوی کے اسباب۔ اسلام کا پہلا حج۔ حجۃ الوداع
[illegible]ت کی غرض و غایت۔ حضورؐ کی وفات و تجہیز و تکفین۔ شمائل محمدیہ۔ آپ کے معمولات۔ اخلاق نبوی
ازواج مطہرات۔ اولاد امجاد۔ معجزات۔ شفائے امراض۔ استجابت دعا۔ اشیا میں اضافہ۔ خصائص محمدی۔
خصائص نبوت۔ فضائل اخروی۔ درود بھیجنے کے فضائل۔ اور ایک درود منور۔ ایک منظوم
مناجات منظوم

قیمت فی جلد ۵ مجلد ۶ تاجرین کو کمیشن دیا جائیگا جو بلحاظ قلت و کثرت خریداری کم و بیش
کا خط و کتابت سے طے ہوسکتا ہے۔ جلد پر کمیشن نہیں ہوگا

[illegible]ملن

[illegible] اورس مالک انوار احمدی پریس، الہ آباد

یو پی (ہندوستان)

فہرست اکبر الہ آبادی

مقدمہ

اکبر کا دور حیات ۱۸۴۶ء سے شروع ہوا اور بظاہر ۱۹۲۱ء میں ختم ہوگیا۔ مگر ان کا کلام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک انسان محسوسات سے اثر پذیر ہوتا رہے گا۔

دنیا میں مبارک انسان دوہری زندگی کا مالک ہوتا ہے۔ ایک تو وہ جو ساعتوں اور دنوں میں گنی جاتی ہے۔ اور دوسری وہ جو ہر قید سے آزاد ہے۔

حیات اصلی کیا ہے کب سے شروع ہوتی اور کب تک رہتی ہے؟ یہ دلچسپ مگر اُلجھے ہوئے سوالات ہیں۔ پہلی اور ظاہری زندگی کے لئے ایک زبردست فلسفی فقیہ عالم اور حکیم نے کہا ہے کہ اگر کوئی شخص ساٹھ برس زندہ رہا تو تیس سال یعنی ساری زندگی کا آدھا حصّہ سونے میں گذر جاتا ہے باقی تیس میں سے پانچ سات برس طفولیت کی بے شعوری میں اور پانچ سات سال گرہستی کی بے حسی میں ختم ہو گئے۔ اس طرح گویا غریب دراصل پندرہ سال زندہ رہا۔

اس پندرہ برس میں بھی صرف وہی لمحات اصلی زندگی کے جوہر کہے جا سکتے ہیں جو عمدہ افکار وافعال، خدمت وعبادت یا انکشاف وایجاد میں صرف ہوتے ہیں۔

ذرا حساب تو کیجیے کہ وہ ساٹھ برس والا کے گھنٹہ زندہ رہا۔ کیا آپ کو انگلستان کے شیریں کلام شاعر ٹینیسن (Tennyson) کا یہ مصرعہ یاد نہیں۔

"As thoughe to breathe were life" گویا سانس لینا ہی زندگی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض ایسے لوگ جو سو برس سے زیادہ زندہ رہے وہ بھی مرتے ہی ایسے بھلا دیئے گئے کہ آج کوئی ان کا نام بھی نہیں جانتا۔ یہی نہیں بلکہ اکثر اکہری زندگی والے متنفس گذرے ہیں جن کا عالم شباب میں طوطی بولتا تھا۔ اور جو منزل شباب میں پہونچتے ہی زندہ درگور ہو کر رہ گئے۔

اس کے برخلاف فلاطون، سقراط، شیکسپیر، ملٹن، حافظ، عمر خیام، انیس واقبال

چند روزہ زندگی بسر کر کے ظاہراً اُٹھ گئے۔ مگر ہمارے دلوں میں اب تک زندہ ہیں اور اپنے اثر کے تناسب سے ایک موزوں زمانے تک زندہ رہیں گے۔

اکبر بھی ایسی ہی مبارک ہستیوں میں سے ہیں۔ وہ فطرت کے پیامی تھے۔ لہذا ان کی حیات کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ کوئی انتہا۔ ابتدا اس لئے نہیں ہے کہ تواریخ و سیر و تذکرہ جات کی ورق گردانی اور ازمنۂ اسلاف کی سیر فرمائیے۔ کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا جس میں فطرت کا ایک نہ ایک پیامی موجود نہ ہو۔

فطرت سے زیادہ عالم کا نباض کون ہو سکتا ہے؟ جب دنیا کو منطق۔ فلسفہ اور کلام کی ضرورت ہوئی تو خطۂ یونان سے سقراط، افلاطون اور ارسطاطالیس نے ظہور کیا۔ جب صبح مسیحائی کی حاجت ہوئی تو حضرت عیسیٰ تشریف لائے۔ اسی طرح مختلف زمانوں میں، ماحول فضا و احتیاج کی مناسبت سے اوتار، رسول، اصحاب، رشی، حکیم، بادشاہ، شاعر صناع اور موجد ہوتے آئے ہیں۔

ارتقاء کا تقاضہ یہی ہے کہ تہذیب یافتہ جذبات، اور ترقی یافتہ حسیات کے تناسب سے طریقۂ پیغام رسانی استعمال کیا جائے۔ لہذا مختلف ادوار عالم میں پیام رسانی کے مختلف طریقے کام میں لائے گئے۔ کبھی قوائے روحانی سے مدد لی گئی۔ کبھی فلسفہ و حکمت کے سورج نے جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے کو دور کیا اور کبھی ہلالی تلوار کی آب و تاب نے نخوت و غرور کے کاسے چور چور کر دیئے۔

اکبر بھی اپنے زمانہ کے مصلح ہیں۔ وہ بھی مصلحین عالم کی زنجیر کی ایک کڑی ہیں۔ اسی لئے ان کی حیات کی ابتدا اس وقت سے ہے جب سے فطرت کو عالم میں اپنا پیامی بھیجنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ریاضیات اور دیگر قیاسیات کے حدود ہیں۔ طوفانِ نوح کی داستانیں کس کی آویزۂ گوش نہیں بن چکی ہیں۔ مصر کے آثار قدیمہ کے انکشافات سے تعلیم یافتہ اور اخبار خواں طبقے خوب واقف ہیں۔ سب سمجھتے ہیں کہ دُنیا کئی بار اپنے معراج کمال تک پہونچی۔ نقش دریا کی طرح مٹی اور پھر نئے سر سے اُبھری۔

اسی طرح حیاتِ اکبر کی کوئی انتہا بھی نہیں ہے۔ ان کی قبر کا خاکی نشان دستبردِ زمانہ سے برباد ہو جائے مگر ان کی وہ قبر جو ہر سمجھنے والے کے سینہ میں تمام خارجی اثرات سے محفوظاً موجود ہے۔ آیندہ نسلوں میں سینہ بہ سینہ پشت بہ پشت منتقل ہوتی جائے گی۔

کیا اکبر مر گئے ؟ ہاں عناصرِ ظاہرہ کی ترتیبِ خارجی میں فرق ضرور آگیا۔ ان کا کلام جو اُن کی حیات کا جوہر اور ان کی روح کا عطر ہے زندہ ہے۔

اگر انگلستان کے زبردست شاعر اور بے نظیر فلسفی براؤننگ کا نظریہ درست ہے تو حضرت اکبر ظاہری حیات کے اس منزل سے گذر گئے۔ جس میں امتحانات کی کشمکش تنازع للبقا کی گرم بازاری اور داد و ستد کی ہماہمی رہتی ہے۔ اب وہ ذاتِ واحد سے قریب تر ہو گئے، اور اسی طرح لطیف ترین نفیس ترین درجات میں تہذیب و نشوونما کی منزلیں طے کرتے ہوئے آخر کار وصلِ حقیقی سے سرشار ہو جائیں گے جو مقصودِ حیات ہے۔

اکبر کسی تعارف کے محتاج نہیں! اُردو داں طبقہ خصوصیت کے ساتھ اُن سے واقف ہے وہ شاعر تھے نثار تھے مصلح تھے بزرگ تھے۔ مختلف طبقات ان کے لئے مختلف نظریئے رکھتے ہیں۔ کوئی زبردست سیاسی رکن سمجھتا ہے۔ کسی کے نزدیک ملک و قوم کے مصلح تھے۔ کوئی شاعر محض یا ظریف محض سمجھتا ہے، کوئی تمدن و معاشرت کا رہبر خیال کرتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں۔ اس تصنیف کا مقصدِ اولین یہی ہے کہ اکبر، مکمل اکبر کی تصویر مکمل طور پر آپ کے سامنے پیش کر دی جائے۔

مکمل اکبر سے میری مراد اکبر بہ حیثیت انسان نہیں ہیں بلکہ اکبر بہ حیثیت مصنّف ہیں۔ اکبر مجلسی حیثیت سے کسی سماجی کے لئے دلفریب ہوں میرے لئے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، نہ میں اکبر کی شہری جنسی شوہری یا پدری، یا مالی حیثیت دکھانا چاہتا ہوں۔ حالات، اخلاق اور رفتار مزاج سے بھی صرف وہی منتخب پہلو لئے جائیں گے جن کا اثر کلامِ اکبر پر پایا جن پر کلامِ اکبر کا کوئی اثر ہوا ہو، لہٰذا "مکمل اکبر" صرف "مکمل مصنف" کا مترادف ہے اور کچھ نہیں۔

اکبر کو جزوی حیثیت سے مختلف گروہ جو جو سمجھتے ہیں اکبر وہ سب تھے اور اُن کے مجموعہ سے بھی زیادہ یعنی فطرت کے پیامی تھے۔ ان کی تعلیم کسی خاص زمانہ یا خاص طبقے کے لئے مخصوص رہی ہو

محدود نہ تھی۔ وہ تمام عالم کے لئے خلق وراستی، صدق وصفا کے پیام مجسم ہیں اور رہتی دنیا تک رہیں گے۔

اُن کی شہرت کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ وہ ہر دلعزیز ہیں۔ رُوحانی ذوق رکھنے والوں کے لئے ان کے کلام میں تصوف، علوئے نفس اور تہذیب باطن کے جواہر پارے موجود ہیں ادبی مذاق والوں کے لئے خوش فکری، بذلہ سنجی، زبان وخیال پر قدرت، حُسنِ زبان، صنائع لفظی و معنوی سبھی کچھ ہے۔ مجلسیوں کے لئے معاشرت و تمدن کی پیچیدگیاں سلجھائی گئی ہیں، سیاست، فلسفہ، اور ظرافت پسند طبقوں کے واسطے سیاست کے نازک مسئلے حل کئے گئے ہیں۔ فلسفہ جسم روح کی مو شگافیاں ہوئی ہیں اور ظرافت کے موتی رولے گئے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ملک کے زبردست دماغوں پر ان کا سکہ بیٹھا ہوا ہے۔

سر اقبال اور سر عبد القادر ان کے سامنے سر ارادت جھکاتے ہیں۔ پنڈت بدن موہن مالویہ۔ دیا نرائن نگم۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو۔ صدر الصدور حضرت شیروانی ان کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ مولانا عبد الماجد دریابادی، حسن نظامی، حسرت موہانی، ناطق، اعظم، حفیظ، افسر، احسن، عزیز کے علاوہ اور بہت سے ممتاز حضرات اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے لُطف اندوز و مدح سرا ہوتے ہیں۔

مگر اتنی ہر دلعزیزی کیوں ہے؟ یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں، بورڈ کے امتحانات میں، گراں قدر اخبارات میں مجلات میں، مختلف مجالس ومحافل میں ان کے کلام سے لطف وزینت کا اضافہ کیوں کیا جاتا ہے؟ لوگوں کے دل پر ان کی بلاواسطہ تعلیم کا اتنا گہرا اثر کیوں ہوتا ہے؟ ان کے اشعار لوگوں کو ان کے اور معاصرین کے مقابلہ میں بہت زیادہ کیوں یاد رہتے ہیں؟ ان کی تصانیف اور دواوین کی طباعت اور اس کی مانگ روز افزوں ہے؟ ایک ایک دیوان کی اشاعت متعدد دفعہ کیوں ہو چکی ہے؟ آئے دن مختلف انتخابات کیوں ہوتے رہتے ہیں؟ صرف اس لئے کہ وہ فطرت کے پیامی، عالم کے نباض اور وقت شناس تھے۔ وہ باریک سے باریک بات کو ظریفانہ انداز میں اس طرح ادا کر جاتے تھے کہ اصلی مفہوم ذہن نشین ہو جاتا تھا۔ ان کے کلام کا سب سے بڑا عنصر خوش طبعی، ظرافت اور بذلہ سنجی ہے۔

ان کی ظرافت میں ذکاوت، حاضر جوابی، اور حسن بیان کی چاشنی مناسب مقدار میں موجود ہے جس طرح کڑوی دوائیں شیرینی کی مدد سے مریضوں اور بچوں کو کھلائی پلائی جاتی ہیں اسی طرح اکبر کی نصیحتوں کے گھونٹ بیمار کے گلے کے نیچے ظرافت کی مٹھاس سے غٹا غٹ اترتے چلے جاتے ہیں، دوا کی تلخی محسوس بھی نہیں ہوتی اور اثر پورا پورا ہو جاتا ہے۔ اکبر گہری باتیں اس مزے سے کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو بُرا بھی نہ معلوم ہو۔ مخاطب کے دل پر اثر بھی کر جائے اور عالم کے لئے صحیفۂ عبرت بھی بن جائے۔

بقائے کلام کے دلائل

پہلی دلیل خارجی ہے یعنی ذات شاعر سے جدا ذات مخاطب سے متعلق ہے۔ اکبر کا کلام باقی رہے گا۔ کیوں؟ اس لئے کہ جوہر ظرافت طبع انسانی کا ایک لطیف عنصر ہے۔ ماہرین نفسیات نے ثابت کر دیا ہے کہ تبسم اور ہنسی فطرت انسانی کے خاصے ہیں پھر وہ کلام جو تبسم یا ہنسی پیدا کرے یا ان کے لئے معاون و محرک ہو سکے فانی کیسے ہو سکتا ہے۔

دوسری دلیل داخلی ہے۔ اکبر کے کلام میں صدق و راستی، معاشرت و تمدن، فلسفہ و سیاست، تصوف و تغزل کے جو جواہر پارے موجود ہیں، ان کا اثر عالمگیر ہے اور ان کی ضرورت تمام دُنیا کو ہر زمانہ میں پڑتی رہے گی۔

مطالعہ مصنّف کی اہمیت

بعض مصنّفین ایسے گذرے ہیں جن کا کلام ان کی ذات سے بالکل الگ ایک خاص حیثیت رکھتا ہے جن کی تصانیف کے مطالعہ کے لئے ہم کو خود مصنّف کی سوانح حیات اور خارجی انقلابات کے مطالعہ کی بہت کم ضرورت پڑتی ہے مگر چند نفوس ایسے بھی ہیں جن کے کلام کو ہم اس وقت تک مکمل طور پر سمجھ ہی نہیں سکتے جب تک ہم ان کی حیات سے بھی پُورے پُورے واقف نہ ہو جائیں۔ شیکسپیر، ہومر، خسرو، حافظ، وَلی اور وجدی پہلے طبقہ میں داخل ہیں، انیس

آزاد، حالی، شبلی، سر سید، نذیر احمد، اور اکبر دوسرے گروہ میں شامل ہیں۔ بہر کیف مطالعہ تصنیف کے ساتھ مطالعہ مصنف بھی ضروری ہے۔

تحریر حیات

ابھی تک اُردو میں حیات نویسی کا صحیح مذاق پیدا نہیں ہوا بعض تذکرہ نویس محض نام، ولدیت اور مولد و مدفن پر قناعت کرتے ہیں۔ بعض حیات لکھنے والے صرف تعریف و توصیف کو اپنا اصلی معیار قرار دیتے ہیں اور بعض غیر ضروری حالات کا انبار کر دیا کرتے ہیں۔

حیات لکھنے والوں میں مولانا حالی ایک گراں قدر حیثیت رکھتے ہیں۔ حیات نذیر میں بھی کافی دماغ سوزی کی گئی کسی قدر منطقی ترتیب ہے۔ ولی دکھنی (مطبوعہ اورنگ آباد) کے مصنف نے بھی عرق ریزی کی اور حیات نویسی کے اکثر اجزاء کی پوری پوری داد دی ہے۔ پھر بھی اس کی ضرورت ہے کہ ادب اُردو کے محسنین کی حیات حکیمانہ انداز سے قلمبند کی جائے۔

داخلی اور خارجی شواہد

حیات کے سب سے بڑے عنصر دو ہیں۔ داخلی اور خارجی شواہد۔ یعنی وہ حالات جو خارجی ذرائع سے جمع کئے جائیں اور وہ شواہد جو خود تصنیف و کلام سے اخذ کئے جائیں۔ میں کوشش کروں گا کہ حیات اکبر میں تمام موزوں شواہد جمع ہو جائیں۔

انتخاب سوانح

اس صحیفہ میں اکبر کے صرف وہی حالات جمع کئے گئے ہیں جو خاص اثرات کے حامل ہیں۔ چونکہ میں حیات و کلام اکبر کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتا اس لئے دونوں کا بیان بھی دوش بدوش ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حیات اور کلام ایک دوسرے پر اثر کرتے رہتے ہیں اور ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ ایک رُخ تاریک ہے اور دوسرا روشن، بلکہ جس طرح ہم کسی شے کو فاعلی یا انفعالی حیثیت سے دیکھ سکتے ہیں، اسی طرح حیات و کلام محض

دو نقطۂ خیالی کا نتیجہ ہیں ورنہ ملٹن کے بقول شاعر مجسم شعر ہوتا ہے اور حیات و کلام دونوں ایک دوسرے کے عکس ہوا کرتے ہیں۔

اس وقت تک کلیات اکبر کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں حصہ اوّل طبع دوم میں موصوف نے دیباچہ کے سلسلے میں اپنے کچھ حالات خود لکھے ہیں، لوگوں کے شوق کا تذکرہ کیا ہے کہ وہ لائف اور تصویر بھی چاہتے ہیں۔ ان کی بعض تصویریں بھی ان کی وفات کے بعد ہندوستان کے چند معزز رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ لائف ابھی مکمل طور پر شائع نہیں ہوئی۔ زیر نظر تصنیف اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے جو ۱۹۲۹ء میں بار اوّل شائع ہوئی۔ اور اب ۱۹۴۶ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ زیور طبع سے آراستہ ہو رہا ہے۔

موصوف کو اپنی حیات کا لکھا جانا پسند تھا یا نہیں؟ اس کا جواب ان کے قول و عمل کے موازنہ سے بڑی مشکل سے مل سکتا ہے۔ جب حضرت اکبر اس بارے میں دوسروں کے شوق کا تذکرہ فرماتے ہیں تو لفظ لفظ سے بے نیازی اور حرف حرف سے انکساری ٹپکتی ہے۔ اسلوب بیان اور لہجۂ تحریر سے بے تعلقی ظاہر ہوتی ہے مگر ان کے چہیتے بیٹے عشرت صاحب کا ایک اشتہار جو کسی ایڈیشن کے سرورق کے آخری صفحات پر ہے پکارے گلے کہتا ہے کہ خود جناب مصنف اپنے حالات جمع کر رہے ہیں۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ مصنف کے خود نوشتہ حالات عشرت صاحب کے کتب خانہ سے یا عشرت منزل سے حاصل ہو جائیں مگر ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی خدا جانے ان کی اتنی شدید حفاظت میں کیا راز پنہاں ہے۔

بہرکیف اکبر صاحب کو اپنی حیات کا لکھا جانا ناپسند نہ تھا۔ لوگوں کے اصرار سے سہی، زمانہ کے تقاضہ سے سہی، آیندہ نسلوں کی بہبودی کے خیال سے سہی، راضی ہو گئے تھے کہ حیات لکھی جائے اور انھوں نے اپنے چند حالات خود بھی جمع کر لئے تھے۔

اب ذیل میں مرحوم کے خطوط سے چند اقتباسات پیش کرتا ہوں جن سے بصیرت افروزی سے قطع نظر حیات کے متعلق ان کے اپنے خیالات کا اندازہ ہو سکے گا۔

خطوط بنام منشی شرف الدین احمد خاں صاحب مصنف "خیالات" مؤلف بوعلی سینا وغیرہ (رقعات اکبر صفحہ ۹۶ و ۹۷)

"ہر گاہ آپ مدت سے فکر میں ہیں کہ میری نسبت کچھ لکھیں تو ایک گونہ حق ہو گیا ہے لیکن اشعار مطبوعہ کو جانے دیجئے، پبلک زیادہ تر مشتاق غیر مطبوعہ اشعار کی ہے۔ اشعار مطبوعہ کا ضبط وحصر آپ کو دشوار ہے۔ اکثر پر ریمارک کرنا ہے یہ سب کام میری ہدایت و نگرانی میں ہو سکتے ہیں .... آپ مجموعہ نظم بھیجدیجئے۔ اغلاط کی صحت ہو جائے گی، لائف میں کام آئیگا۔ نواب محسن الملک، مولوی شبلی، اخبار زمانہ، ایڈیٹر مخزن، البشیر کے ایک دوست اور دیگر حضرات نے تحریکیں کیں اور میں خاموش رہا......... اکثر بزرگوں نے از انجملہ البشیر اور حاجی اسمٰعیل خاں صاحب نے مجھ سے استدعا کی کہ میں اپنے حالات سے ان کو مطلع کروں، اور وہ میری سوانح عمری لکھیں، میں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اپنے مُنھ سے اپنی تعریف نہیں ہو سکتی اور یہ ہے بھی ہیچ۔

بھائی شرف الدین! میری لائف درحقیقت بہت عجیب اور رنگا رنگ ہے اور اس سے بہت سے سبق حاصل ہو سکتے ہیں، آپ لکھنے پر اصرار کر رہے ہیں تو اختیار ہے سلسلہ میں کچھ اشعار بھی آجائیں گے۔ آپ کو اس کام کے لئے ہفتہ دو ہفتہ یہاں رہنا چاہئے تاکہ مواد مل سکے۔

خطوط بنام آنریبل سر شیخ عبدالقادر بیرسٹرایٹ لا سابق وزیر تعلیمات و سابق ایڈیٹر مخزن (رقعات اکبر صفحہ ۱۲۲)

۲۰-۱/۱ - " بموجب ارشاد سابق کچھ نوٹ لکھ لئے ہیں کچھ باقی ہیں لیکن روز بروز یہ خیال ہوتا جاتا ہے کہ سب فضول و ہیچ ہے۔ سمجھ کہتی ہے کہ تمھارے لئے فضول و ہیچ ہو جینے والوں کے لئے کیوں ہیچ ہیں۔"

۱۲ر جنوری ۱۹۲۰ء - "میں نے قلم برداشتہ حالات لکھ کر بھیجدیئے ہیں۔ بہت کچھ ہے کہاں تک لکھوں۔ میرے اصول اور طریق عمل تو نظموں کے انتخاب سے ظاہر ہو سکتے ہیں۔"

یہی وجہ ہے کہ میں نے داخلی شواہد پر بہت زیادہ زور دیا ہے اور کوشش کی ہے کہ خطوط و اشعار سے حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالوں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ کلام اکبر ذاتی لگاؤ اور رنگ طبیعت Personal Touch سے مالامال ہے۔

۱۳ر مارچ ۱۹۲۱ء - " حمیدیہ بک ایجنسی سوہدرہ ضلع گجرانوالہ کے مینجر صاحب لائف

کے لئے جان کھائے جاتے ہیں۔"

خط بنام حضرت عزیز لکھنوی (صفحہ ۱۷۶ مکاتیب اکبر)

۷راکتوبر ۱۹۱۹ء۔ "خیال وسعت تحقیق تاکجا اکبر + کہ ہر نگاہ ہے محتاج اک فسانے کی"

دہلی ۱۳ اردسمبر ۱۹۱۹ء۔ "خطیب میں نامہ نگار نے بالکل ناقص و ناتمام مضامین کو غت ربود کردیا۔ نہ میں نے کوئی اسپیچ دی نہ مضمون لکھا تھا۔ مختلف اوقات کی گپ کو اس لڑکے نے اپنے الفاظ میں مفہوم کے موافق لکھ دیا میں بے خبر تھا۔ ابھی خطیب کو دیکھا تو ایک مختصر تحریر تردید میں لکھی۔"

اقتباسات بالا سے ذیل کے نکات اخذ ہوتے ہیں۔

(۱) وہ اپنی اصلی لائف اپنے اشعار میں سمجھتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے۔

(۲) وہ شہرت و نمود کے خیال سے نہیں بلکہ آیندہ نسلوں کی ہدایت کے خیال سے اپنے سوانح حیات کی قدر کرتے تھے۔

(۳) غیر مربوط اور "غلط سلط" واقعات کی نسبت اپنی طرف ہرگز نہیں چاہتے تھے اُمید ہے کہ سوانح نویس اِن نکات کو ملحوظ رکھیں گے۔

اب میں اسی سلسلہ میں مرحوم کے دو شعر جو آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں، درج کرکے اس بحث کو ختم کرتا ہوں کہ خود موصوف کے خیالات حیات نویسی اور سوانح نگاری کے متعلق کیا تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

لکھو لائف میری ایام جوانی کے سوا سب بتاؤں گا تمھیں اقتد ودانی کے سوا

غالباً "ایام جوانی" سے کچھ ایسے شرمناک افعال یا ناگفتہ بہ حالات متعلق نہیں ہیں جن کو موصوف اس انداز سے چھپانا چاہتے ہوں بلکہ میری نگاہ میں اس شعر سے کئی پہلو نکلتے ہیں۔

(۱) میرے ایام جوانی کے واقعات کوئی امتیازی خصوصیت نہیں رکھتے، وہ ایسے ہیں جو قریب قریب ہر شخص پر گذرتے رہتے ہیں۔

(۲) "اقتد ودانی" کی بلاغت بتاتی ہے کہ بعض اُمور بیان کئے جاتے ہیں مگر بعض باتیں مثلاً تقاضائے شباب، کیف بے خودی وغیرہ محسوسات لطیف پر منحصر ہیں۔ اقتد ودانی سے

صاف یہی پہلو نکلتا ہے کہ جب تم پر پڑے گی خود ہی جان جاؤ گے اگر ہم پہلے سے بتا دیں گے تو "وانی" کے لطف میں کمی آجائے گی اور تجربہ کے بغیر حقیقی کیفیت کے احساس کی صلاحیت بھی تم میں پیدا نہ ہوگی۔

(۳) لائف میں وہ حالات ہونے چاہئیں جو سبق آموز ہوں یا مخصوص ہوں، اس حصہ عمر میں عموماً کشتی حیات طوفان جذبات میں رہتی ہے۔ دماغی ارتقاء، اور ذہن و ذکا کی نشوونما پورے طور پر ایام جوانی کے گذر جانے کے بعد ہوا کرتی ہے۔

(۴) ایام جوانی میں افتد ودانی کی سُرخی سے مرحوم نے ایک مثنوی لکھی تھی جس میں صرف سادگی ہے اور روانی وہ بھی ہر شعر میں نہیں ہے۔ نہایت مختصر ہے۔ خاص مواقع بھی نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔ اکبر نے اس کی اشاعت کبھی پسند نہیں کی اسی لئے میں بھی اسے شائع نہیں کرتا بعض اہل مذاق کے سینوں میں وہ اب بھی محفوظ ہے۔

(کلام اکبر الہ آبادی صفحہ ۲) "حکیم محمد شمس الحسن مرحوم نے دوران حیات میں آرزو کی کہ لسان العصر کے حالات میں تازہ خیالات درج صفحات ہوں" لیکن مرحوم نے صرف ایک شعر لکھ کر بھیجدیا جو پوری لائف پر بھاری ہے۔

ہیں معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں
گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے نا گفتنی

اس میں حیات اکبر کی جھلک بھی خاص حد تک موجود ہے، اگر آپ ناگفتنی کے معنی سوقیانہ اور شرمناک نہیں بلکہ غیر متعلق پہلو سمجھیں تو یہ شعر مرحوم کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ اس لئے کہ مملکت شعر میں انھوں نے جو سکے چلائے ہیں جو ایجادات و اختراعات اور اکتشافات کئے ہیں ان سے قطع نظر خود ان کی لائف میں کوئی خاص امتیازی شان نہیں ہے۔

اس شعر میں ذاتی عنصر (Personal Touch) ضرور ہے اور ممکن ہے کہ مرحوم نے یہ شعر یاد شباب کی تحریک سے لکھا ہو مگر استقرا اتنا عالمگیر و پاکیزہ ہے کہ لوگوں کو رنگ زمانہ بھی معلوم ہوجاتا ہے اور سوانح نگار کو بھی ہدایت مل جاتی ہے کہ غیر ضروری حالات کے بیان سے پرہیز کرے۔ آپ ہی انصاف سے بتایئے کہ اس زمانہ کے معزز آدمیوں میں کتنے نفوس واقعی اس قابل ہیں جن کی "گفتنی لائف" "درج گزٹ" سے زائد ہو اور

کتنے سوانح نگار حضرات ایسے ہیں جو اس نکتہ کی صحیح قدر کرتے ہیں۔

کلیات کی اشاعت اور ترتیب

کلیات اکبر کے تین حصص اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ہر حصّہ کئی کئی بار چھپ چکا ہے۔ ملک میں اُردو کتابوں کی مانگ حوصلہ شکن ہے اور اُردو مطبوعات کی داد و ستد بھی ہمت افزا نہیں ہے مگر اکبر کے کلام میں عالمگیری بقا اور ظرافت کی چاشنی اس حد تک ہے کہ ایڈیشن پر ایڈیشن نکلتے ہیں اور ختم ہوتے جاتے ہیں بعض صائب الرائے حضرات کو کلیات کے ہر سہ حصص کی ترتیب کے متعلق شکایت ہے کہ موجودہ نظم کلیات نہ تو منطقی حیثیت سے کوئی وقعت رکھتا ہے نہ سن وار ہے نہ موضوع مبحث اور عنوان کے اعتبار سے مکمل ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اکبر مرحوم کے ورثار اس طرف بہت جلد پُوری توجہ فرمائیں گے۔ خود مصنف کے زمانہ حیات میں لوگوں نے دیوان غالب کی طرح انتخاب کی صلاح دی تھی اور مرحوم کے اِن خطوط سے جو عبدالماجد صاحب، عزیز صاحب اور حسن نظامی صاحب کے نام ہیں، صاف پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس تجویز کو پسند فرمایا تھا۔ کاش ان کی زندگی ہی میں لائف مکمل ہو جاتی انتخاب کلام ہو جاتا اور ترتیب کلیات ہو جاتی، اب ان کی وفات کے بعد حیات نویس کی ذمہ داریاں مقابلۃً نہایت کثیر اور بہت نازک ہو گئی ہیں، بہت سے لطیف اشارات تھے جو صرف مرحوم کے ذہن میں محفوظ تھے۔ یا جن سے دو ایک نفوس اور واقف تھے اب ان میں سے کوئی نہیں ہے خود ایک جگہ سے زیادہ مرحوم نے لوگوں کو لکھا ہے کہ بہت سے اشعار پر ریمارک کرنا ہے، نوٹ لکھنا ہے۔ اب وہ اشعار تشنہ ہی رہ جائیں گے۔

مشکلات

اکبر مرحوم کی لائف لکھنے میں اور کلام کی تنقید کرنے میں میری ذاتی کمی صلاحیت اور کمی قابلیت سے قطع نظر اور دقتیں جو مجھے اُٹھانی پڑی ہیں اُن سے وہ لوگ خوب واقف ہیں جو اس طرح کا کام کر چکے ہیں۔

اس جگہ صرف چند مشکلات کا ذکر اس نظر سے کئے دیتا ہوں کہ ناظرین کی ترچھی نگاہوں، اور ناقدین کی دلدوز نظروں میں لطف و کرم کی چاشنی بھی رہے۔

(۱) اشعار کو Classffy کرنے یعنی جداگانہ عنوان کے ماتحت تقسیم کرنے میں دانتوں پسینہ آگیا ہے۔ تینوں دیوان کئی کئی بار پڑھنے پڑے اور ہر شعر کے مختلف پہلوؤں پر بہت دیر دیر تک غور کرنا پڑا ہے۔

(۲) حالات و واقعات کی فراہمی کے لئے تمام ممکن مواد کا لفظ لفظ پڑھنے کے علاوہ بہت سے حضرات سے ملنا پڑا ہے اور گھنٹوں کی گفتگو کے بعد بعض حالات کا انتخاب اس کی توضیح تصحیح اور تصدیق کرنی پڑی ہے۔

(۳) نثر کی کتابیں جن کے حالات آئندہ صفحات میں ہیں بڑی دشواری سے دستیاب ہوئی ہیں۔

(۴) انتخاب اشعار بھی بہ ظاہر دشوار نہ سہی مگر اکبر ایسے ہمہ داں شاعر کے کلام کے انتخاب میں جو دقتیں ہوئی ہیں، اس کا اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ خود انتخاب کرنا چاہیں اور اُصول و قوانین مقرر کر کے انتخاب کریں۔ ایک معمولی سی دقت یہ ہے کہ ہر شعر سے بہت سے پہلو نکلتے ہیں، سب سے غالب پہلو کون ہے؟ اس کی چھان بین بھی آسان نہیں ہے۔

مجھے امید تھی کہ اگر ورثائے اکبر مرحوم حسب وعدہ امکانی مدد مجھے دیتے تو مشکلات کا پلّہ ایک حد تک ہلکا ہو جاتا۔ مگر میں اب بھی شکوہ سنج نہیں شکر گذار ہوں کہ انھوں نے ہمت افزائی کی اجازت دی اور مسودہ دیکھنے میں جو مدد دی وہ میرے لئے باعث فخر ہے۔ تنبیخ کے مضامین، غیر مطبوعہ کلام کے اجزا اور خود نوشتہ حالات کے نہ ملنے سے ایک گونہ کمی ضرور رہ گئی ہے مگر خیر کبھی نہ کبھی یہ جواہر پارے بھی آفتاب اشاعت کی دھوپ میں چمک ہی جائیں گے۔

شکریہ

اسی سلسلہ میں میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کر دینا چاہتا ہوں جنھوں نے کسی نہ کسی

طور پر میری ہمت افزائی کی ہے اور مجھے مدد دی ہے۔

(۱)۔ سید عشرت حسین صاحب مرحوم ڈپٹی کلکٹر ہردوئی:۔ ان کے احسانات کا ذکر سطور بالا میں ہو چکا ہے۔

(۲)۔ کیپٹن پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب ایم۔ اے، ایم بی ای، صدر شعبہ اُردو جامعہ الہ آباد۔ موصوف نے اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود ہر امکانی مدد مرحمت فرمائی اور گرانقدر مشورے دیئے۔

(۳)۔ خاں صاحب سید زاہد حسین صاحب مرحوم اسسٹنٹ سرجن۔ مرحوم کے حقیقی بھانجے جنھوں نے بہت سے حالات و لطائف بتائے۔

(۴)۔ جناب سید اکبر حسین صاحب ریٹائرڈ سب رجسٹرار۔ جن سے بعض خاص حالات معلوم ہوئے اور کچھ غیر مطبوعہ کلام بھی ملا۔

(۵)۔ جناب سید محمد متین صاحب مرحوم وکیل ہائی کورٹ جن سے اکبر مرحوم کے اُستاد وحید صاحب کے حالات اور بعض قابل قدر واقعات دستیاب ہوئے۔

(۶)۔ جناب سید اسرار احمد صاحب فاضل ادب و دینیات جنھوں نے مرحوم کی نثر کی بعض کتابیں عطا کیں۔

(۷)۔ جناب مولوی سید جلال الدین احمد جعفری زینبی۔ جنھوں نے بڑے حوصلہ اور فراخدلی سے اکبر الہ آبادی کی تحریک و تکمیل و اشاعت میں کافی حصہ لیا۔

جن کتب اور مضامین سے مدد لی گئی اُن کے مصنفین اور مؤلفین کا شکریہ ادا نہ کرنا بھی ادبی حق تلفی ہے

(۱) رسائل "اکبر" الہ آباد

(۲) "تاریخ زبان اردو" از بابو رام سکسینہ

(۳) "اکبر کی شاعری کا آخری دور" دو قسطوں میں۔ عبد الماجد صاحب دریابادی۔

(۴) رسالہ "نگار" اپریل ۲۶ء

(۵) سخن شعر نساخ

(۶) کلام اکبر الہ آبادی حضرت شفق عماد پوری

(۷) خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی حصہ اول

(۸) مکاتیب اکبر بنام عبد الماجد دریابادی
(۹) اسلام کی حالت آیندہ
(۱۰) مرقعات اکبر مرتبہ نصیر ہمایوں
(۱۱) مضامین متعلقہ ہند
(۱۲) مکاتیب اکبر بنام عزیز لکھنوی
مرتبہ محبوب علی صاحب
(۱۳) اکبر وطن پرست شاعر کی حیثیت سے
(۱۴) بزم اکبر

صح
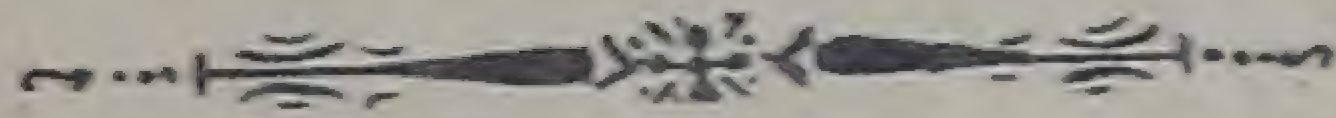
حیات اور کلام کے تین دَور

لسان العصر اکبر کے کلام میں 'کیا معنی' ہر زمانہ کے مصنف اور شاعر کے کلام میں تنزل اور ارتقاء کے مختلف درجات پائے جاتے ہیں۔ ابتدائی کلام کی خصوصیات شباب کے کلام سے اور شباب کے کلام کی امتیازی حیثیات کلام شیب سے جدا ہوتی ہیں۔

اکبر کے یہاں بھی تینوں درجوں کے کلام پائے جاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ حیات انسانی کا ہر دور (طفلی۔ شباب اور شیب) اپنے ذہنی ارتقار، حسیات و جذبات کے جوش و متانت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے بھی تین دور قائم کئے ہیں۔

پہلا دور "صبح" ابتدا آغاز کلام سے اور انتہا ۱۸۷۹ء تک ہے۔

دوسرا دور "دوپہر" ابتدا ۱۸۸۰ء سے اور انتہا ۱۹۰۳ء تک ہے۔

تیسرا دور "شام" ہے، ابتدا ۱۹۰۴ء اور انتہا حضرت اکبر کے وفات سے ہمکنار یعنی ۱۹۲۱ء تک ہے۔

یہ تین دور قائم کرنے میں مجھے سب سے بڑی دقت یہ محسوس ہوئی کہ کلیات اکبر کی ترتیب عجیب طور پر ہوئی ہے۔ مرحوم کے کلام سے ارتقائے ذہنی کا پتہ لگالینا اگر ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے، اس لئے کہ نظم کلیات کا انداز ترتیب ابتدا و انتہا سے بے نیاز ہے یہ نہیں کہ ابتدا میں ابتدا کا کلام ہو یا کلام کی تقسیم منازل حیات یا درجات ارتقاء کے ماتحت کی گئی ہو۔

ان کی تصانیف نثر کی طرز تحریر، سنین اشاعت اور خطوط و کلام کے مطالعہ سے میں جس نتیجہ پر پہونچا ہوں یہ تینوں دور اسی نتیجہ کے حاصل ہیں جو آئین فطرت اور قوانین طبیعی کے مخالف نہیں ہیں۔ انسان بچّہ سے جوان ہوتا ہے، جوان سے بوڑھا ہوتا ہے، مولوی عبدالماجد صاحب دریابادی نے بھی اکبر مرحوم کی شاعری کا دور ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۹ء تک رکھا ہے۔

میں نے صبح دوپہر اور شام کی سرخیاں اس لئے پسند کی ہیں کہ صبح بنارس اور شام اودھ اپنی نظر نوازیوں کے اعتبار سے کشمیر جنت نظیر کی دوپہر سے کسی طرح کم نہیں ہیں جو فطرتیں شوخی جوش اور زور بیان پر دلدادہ ہیں اُن کے لئے "صبح" صبح دلکشا ہے۔ جو بیخودی شباب سرمستی اور بیخبری چاہتے ہیں انھیں "دوپہر" کی سیر میں خاص کیفیت حاصل ہوگی اور جو متانت و سنجیدگی تحقیق فلسفہ اور تصوف کے وارفتہ ہیں اُن کے لئے شفق "شام" کی دلچسپیاں جاذب نگاہ ہونگی۔

میں بہ نفس خود کسی خاص دور کو ترجیح نہیں دیتا اس لئے کہ میرے نزدیک حیات و کلام اکبر میں دو خاص باتیں ہیں ایک تو فردیت ہے Unity اور دوسرے سلسلہ Continuity ہے۔ فردیت کا لفظ میں نے اس مجبوری سے پسند کیا ہے کہ Unity کے لئے اُردو میں اس سے زیادہ اور کوئی جامع لفظ مجھے نہیں مل سکا۔ فردیت سے مراد یہ ہے کہ جیسے انسان حیات کے ہر دور میں انسان رہتا ہے ویسے ہی اکبر کا کلام ہر دور میں کلام اکبر ہی رہا ہے۔ خفیف سی تبدیلیاں تقاضائے ارتقا کی بدولت ظاہر ہوتی گئی ہیں لیکن جوہر کلام جو زبان سے زیادہ خیالات سے تعلق رکھتا ہے اس کی شان میں فرق نہیں آیا اکبر ہر دور اور ہر رنگ میں وہی رہے ہیں جو ان کو ہونا چاہئے تھا سلسلہ بھی غالباً پورے طور پر اس مفہوم کو ادا نہیں کرتا جو Continuity میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قوانین فطرت کے ماتحت جس طرح ایک چھوٹے سے بیج سے پودا، پودے سے پیڑ اور پھر پھل پھول پتیوں والا درخت ہو جاتا ہے۔ اسی طرح حیات و کلام اکبر میں بھی ظاہری نشو و نما آخری سانس تک ہوا کی مگر باطناً کوئی فرق نہیں ہوا۔

تاریخ ادب اُردو، شعر الہند اور دوسرے رائج الوقت تذکروں نے اکبر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ لسان العصر کے متعلق ابھی کم لکھا گیا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ شیکسپیر اور غالب کی طرح موصوف بھی عارضی کم التفاتی کے دور سے گذر رہے ہیں اور وہ زمانہ دور نہیں جب اکبر مرحوم کو بھی وہی ہر دلعزیزی حاصل ہو جائے گی جس کے وہ مستحق ہیں۔

پیدائش

سید اکبر حسین صاحب ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء مطابق شوال المکرم ۱۲۶۱ھ کو موضع بارہ ضلع الٰہ آباد

میں پیدا ہوئے۔ اکبر کی دادی نے جو نہایت روشن ضمیر اور روشن دماغ تھیں خواب میں دیکھا کہ اس بچے کا نام اکبر حسین رکھا جائے (رقعات اکبر مرتبہ ہمایوں) اور زچہ نے بھی دیکھا کہ ایک چاند میری گود میں آگیا ہے۔

وہی چاند ظاہر ہوا اور فصاحت و بلاغت کی بسط و شرح کے دوش بدوش رفتہ رفتہ سارے ہندوستان کی فضا پر چھا گیا۔ اب اس کامل مہر درخشاں کی کرنیں فیض رسانی کے لئے بیتاب ہیں اس میں اور فضائی آفتاب میں فرق ہے۔ فضائی آفتاب دنیائے نباتات، حیوانات، جمادات، انا بیس فطرت اور حیات انسانی کا محسن ہے۔ مگر یہ آفتاب جہالت کی تاریک گھٹاؤں کو دور کرتا ہے۔ عقل و فہم کو جلا دیتا ہے، ضمائر اور قلوب کو آئینہ بناتا ہے، یاس و حسرت کو اُمید اور حوصلہ سے بدل دیتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فیض رسانی کے لئے اپنے مخاطب میں قوت استعداد کو نشو و نما دیتا ہے۔ آفتاب تمام روئے زمین پر چمکتا ہے مگر ہر قطعہ زمین پر اس کا اثر یکساں نہیں ہوتا بلکہ قطعہ زمین کی قابلیت، اثر پذیری اور استعداد فطری کے تناسب سے فیض شعاع بھی بر سر کار رہتا ہے مگر ہمارے آفتاب کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے مخاطب کو پہلے تو اپنی سلاست، ظرافت، موسیقی اور ایک سحر پوشیدہ کی کرنوں سے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے اور مخاطب کے قوائے استدراک و نقد سخن فہمی و نکتہ سنجی کی بتدریج مگر یقینی طور پر تہذیب کرتا رہتا ہے اور جیسے جیسے یہ قوتیں معمول میں نشو و نما پاتی جاتی ہیں ویسے ہی ویسے وہی شعاعیں زیادہ فیض رساں ہوتی جاتی ہیں۔ ہم اکبر کے جس شعر کے معنی شروع میں جس قدر لطیف سمجھتے ہیں کچھ دنوں کے مطالعہ کے بعد اسی شعر کے معانی ہمارے لئے کہیں زیادہ لطیف اور کہیں زیادہ بلند ہو جاتے ہیں۔

ماحول

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی تک دفاتر سرکاری میں اُردو سرکاری اور لازمی زبان نہیں ہوئی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے اراکین اپنی مساعی میں مصروف تھے۔ شمس العلماء حضرت آزاد کے والد محترم کا سب سے پہلا اُردو کا پرچہ "اُردو اخبار" کے نام سے نکل کر بند ہو چکا تھا۔ ذرا فطرت کی متانت دیکھئے، ادھر آزاد ایسا نثار دہلی میں پیدا ہوا۔ سر سید اور حالی قومی تحریکات میں مصروف ہوئے

نذیر احمد و شبلی ملک و ادب کی پرستش و تحقیق میں لگ گئے۔ ناسخ و آتش فصاحت و بلاغت کے دریا بہانے لگے اور ان سب کے ساتھ ہی ساتھ میر انیس کو لکھنؤ اور اکبر کو الٰہ آباد میں فطرت کا پیامی بنا کر بھیجا گیا۔

یہاں بھی شاید کسی لفظ پرست کو دھوکا ہو کہ میں نے انیس و اکبر کو ایک ہی درجہ دیا ہے، ہرگز نہیں، فطرت کا پیامی ہونے کی حیثیت سے بھی میں انیس کو ہمیران سخن میں کامل ترین بلکہ خدائے سخن سمجھتا ہوں، میرے مشاغل اور مصروفیت نے اجازت دی تو "حیات انیس" لکھنے کا ارادہ ہے جس میں ان کے مرتبہ پر مکمل طور سے روشنی ڈالی جائے گی۔

دونوں کی روشیں جدا جدا وہ مرثیہ نویس یہ غزل گو۔ دونوں کا طریقہ پیام رسانی الگ الگ، وہاں متانت اور حکیمانہ مطالعہ فطرت انسانی، یہاں ظرافت و تصوف، وہاں جذبات کی تصویر کشی اور حسیات لطیف کی موقلمی، یہاں جذبات و حسیات کی بولتی ہنستی مورتیں نظر آتی ہیں مگر حقیقت اتنی ضرور ہے کہ دونوں فطرت کے پیامی ہیں۔

یہ دونوں اس محفل میں آئے جہاں ایک طرف تو امیر و داغ، درد و شیفتہ، آزاد و حالی، سید و نذیر، وقار و محسن اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے اور دوسری طرف ہندوستان سیاسی اور ملکی تحریکات کی کشمکش میں پڑا ہوا تھا دونوں کو پیام رسانی کا میدان ملا اور دونوں نے اپنے اپنے فرائض انجام دیئے۔

اُردو شاعری کا نیا دور شروع ہو گیا تھا۔ حالی نے اپنے غیر فانی مسدس کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ آزاد کی طبیعت بھی فطری شاعری کی طرف متوجہ ہو چلی تھی۔

حسب و نسب

اکبر حسین صاحب نجیب الطرفین سید تھے۔ مورث اعلیٰ طہران سے آئے تھے۔ دادا کے متعلق خود مرحوم خواجہ حسن نظامی صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "دادا سُنی سپاہی تھے آگے کا حال معلوم نہیں۔" ذکر المعارف میں پورا شجرہ درج ہے۔

سید اکبر حسین کے والد مولوی سید تفضل حسین صاحب عرف چھوٹے میاں اپنے بڑے بھائی

سید وارث علی شاہ تحصیلدار کی نگرانی میں نائب تحصیلداری کے معزز عہدہ پر ممتاز تھے۔ ان کے قانونی فیصلے کرامت حسین صاحب جج اور خود اکبر حسین صاحب سب جج کے فیصلوں کی طرح اٹل اور پُر مغز ہوتے تھے۔ قابلیت کا یہ عالم تھا کہ عربی اور فارسی کی انتہائی کتابوں کا درس شائقین علم و ادب کو دیا کرتے تھے۔ ریاضیات میں ید طولےٰ حاصل تھا اور خاص شوق تھا، خطائن (عربی ریاضی کے) مشکل ترین قاعدوں کا جدید حل انھیں کی ذات سے منسوب ہے۔ خود اکبر نے دیباچہ کلیات میں ان کی کمال ریاضیات کا اظہار کیا ہے۔ سیرت ایسی پاکیزہ تھی کہ خالص درویش صفت تھے۔ عبادت و ریاضت۔ زہد و اتقا سے نہایت درجہ دلچسپی تھی۔ عرفان و تصوف میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کا انتقال ۱۳۰۳ھ میں ہوا۔

چو شد واصل ذات رب ذات او بجو سال تاریخش از ذات رب
۱۳۰۳ھ

چونکہ اکبر کی ابتدائی تعلیم بھی اسی سرچشمۂ کمال کی مرہون منت تھی لہذا ان کے اشعار میں تصوف و عرفان کی جھلک ہمیشہ رہی اور دور "شام" یا آخری ایام عمر میں اکبر پورے عارف اور صوفی ہو گئے۔ جس کا اندازہ " تصوف اور علوے نفس " کی سرخیوں سے ہو سکتا ہے۔ اُن کی والدہ جگدیش پور ضلع گیا کے ایک نجیب الطرفین زمیندار کی دختر بلند اختر تھیں جن کی اچھوتی تربیت سے اکبر حسین جس حد تک فیض یاب ہوئے اُس حد تک اُن کی زندگی مکمل زندگی رہی، اور حیات کے جن شعبوں پر ان کی نوازشات کا اثر پڑا وہ شعبے قابل قدر حیثیت رکھتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم

اکبر کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، ابھی چار پانچ برس سے زائد کے نہ ہوئے تھے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ افعال و اقوال سے تیزی اور ذہانت کے غیر معمولی آثار ظاہر ہوئے۔

سید اکبر حسین کی ابتدائی تعلیم کا حصہ زیادہ تر خود سید تفضل حسین صاحب جیسے بحر بیکراں کا رہین منت رہا۔ جن کی عالمگیر قابلیت نے معمولی باتوں میں بھی نکات نکالے اور سمجھائے۔ جب سید اکبر حسین صاحب کا سن ۸ و ۹ برس کا ہو گا اُن کی والدہ ۱۸۵۵ء میں بچہ کی تعلیم کے خیال سے الہ آباد آئیں اور محلہ چک پر اپنے اعزا میں رہنے لگیں، اکبر حسین دس بارہ برس

کے سن تک عربی اور فارسی درسیات کی انتہائی کتابیں پڑھ چکے تھے۔ ایک جگہ باپ کی تعلیم کے متعلق فرماتے ہیں۔ "جو پڑھا میں نے وہ اپنے باپ سے"۔ ۱۸۵۶ء میں جمنا مشن اسکول میں داخل ہوئے اور انگریزی کی دو چار کتابیں پڑھنے کے بعد ۱۸۵۹ء میں چھوڑ بیٹھے۔

شوقِ مطالعہ

اکبر کو بچپن ہی سے مطالعہ کا شوق تھا انھوں نے اپنے آپ سے نہ صرف انگریزی کی استعداد بڑھائی بلکہ کلام شعرا کی بھی سیر کی، ان کے بھانجے سید زاہد حسین صاحب کا بیان ہے کہ مجلس شعرا میں جب کبھی ضرورت پڑتی تو اساتذہ فن کے فارسی اور اُردو کلام سے بہت سی سندیں پیش کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ آتش اور ناسخ جن اشعار کی وجہ سے آتش اور ناسخ ہوئے ہیں وہ میرے ناخنوں میں ہیں۔

مطالعہ کا یہی شوق تھا جس نے آخر عمر میں فلسفہ اور تصوف کی سیر میں خاص دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ ان کا درسی کتب خانہ قابل دید ہے، ان کے بعض خطوط سے جو عبدالماجد صاحب کے نام ہیں شوق مطالعہ کا پتہ چلتا ہے، ساتھ ہی ساتھ ذوق تحقیق بھی بہت تھا۔ اس زمانے کے مشاعرے آج کے مشاعروں سے بالکل مختلف طرز کے ہوتے جہاں نہایت آزادی سے زبان اور خیالات پر تنقیدیں ہوتی تھیں۔ اکبر حسین صاحب بھی ان مشاعروں میں شریک ہوتے تھے جہاں ان کی حیثیت اچھی خاصی تھی، خوب نوک جھونک ہوا کرتی تھی۔ آخر عمر میں مل اور سنسپر وغیرہ کے کتابوں کا عمیق مطالعہ کرنے لگے تھے اور ان کے مطالب پر آزادی سے گفتگو اور تبادلہ خیالات کر لیا کرتے تھے۔

شوقِ تصویر

ریبرن اور اکبر کے نام سے سید عشرت حسین صاحب نے ایک مختصر سا رسالہ پانیر پریس الہ آباد سے چھپوا کر شائع کیا ہے: میں اس جگہ صرف اس نظر سے ذکر کر رہا ہوں کہ آپ کو موصوف کے شوق مطالعہ بعد نظری اور ذوق تصوری کا کچھ اندازہ ہو جائے۔ سرورق دبیز ہے؛

شروع میں دو صفحہ کا تعارف تمہید کے نام سے ہے۔

اس رسالہ میں یورپ کے مشہور مصور ریبرن کی سات شاہکار تصویریں آرٹ پیپر پر چھپی ہیں اور ہر تصویر کے مقابل ایک یا زائد شعر جو اس تصویر کے متعلق ہیں درج کئے گئے ہیں۔

"مگر معلوم نہیں کس مصلحت سے تصویریں سیاہ سفید چھپی ہیں جن سے دوہری کمی ہوگئی ہے ایک تو یہ کہ اصلی تصویروں میں جو خاص رنگ خاص اثرات کے حامل ہیں ان کے نہ ہونے سے ریبرن کے کمال کا پورا اثر دیکھنے والے پر نہیں ہوتا اور دوسرے اکبر کے اشعار جو رنگیں تصویروں کے اثر کا نتیجہ ہیں وہ بھی سادہ تصویروں کے ساتھ بہت پھیکے ہو جاتے ہیں اور الفاظ اِن خاص جذبات کی دوبارہ تحریک نہیں کر سکتے جن کے ماتحت وہ خیالات رنگین تصویریں دیکھکر شاعر کے دماغ میں آئے تھے۔ بہرطور رسالہ قابل دید ہے۔

شاعری کی ابتدا

اکبر حسین نے کس زمانہ سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اس کے متعلق کسی حتمی فیصلہ کی گنجائش نہیں ہے۔

ان کے حقیقی بھانجے سید زاہد حسین صاحب کا بیان ہے کہ مرحوم نے خود ان سے فرمایا کہ "میں گیارہ برس کا تھا جب سے شعر کہتا ہوں، میرے چچا وارث علی صاحب نے ایک بار مجھے بلاکر پوچھا" بیٹا شعر کہتے ہو؟" میں ادب کی وجہ سے خاموش رہا۔ خود ہی فرمانے لگے، اچھا ایک مصرعہ ہم کہتے ہیں ایک تم کہو۔ انھوں نے ایک مصرعہ کہا اور جیسے علی حزیں نے اپنے والد کے سامنے صائب کے ایک شعر کے جواب میں تین شعر کہے تھے، اکبر نے بھی دوسرا مصرعہ فوراً کہہ دیا۔ چچا بڑے خوش ہوئے۔ افسوس ہے کہ باوجود کوشش زاہد صاحب کو وہ مصرعے یاد نہیں آئے۔

کلیات اکبر حصہ اوّل طبع ہفتم صفحہ ۱۲۴ ملاحظہ فرمایئے، وسط صفحہ میں دو شعر ہیں، عمر ۱۷ سال لکھی ہوئی ہے، خدا جانے اس کے بعد کی غزلیں کب کی ہیں، بہرطور ۱۸۶۳ء سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔

چشم عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتاب واشک   آپ یوں دیکھیں تماشا جان کر سیماب واشک

سالے کہ نکوز نو بہارش پیدا - ابتدائے کلام دیکھیے اور ایسی مشکل زمین میں اتنا صاف شعر نکالا ہے، خود اسی زمین میں فکر کیجیے تو وقت کا انداز ہو۔

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اسے کرتے خراب　　جانتے یکساں اگر ہم گوہر نایاب و اشک

دوسرا شعر بھی نہایت صاف ہے۔

صفحہ ۱۱۵ پر ایک سہرا ہے۔ سر پر سہرا باہر سہرا جس میں ذوق اور غالب کے مشہور سہرے ہیں ۱۸۶۶ء یعنی ۲۰ برس کی عمر میں یہ سہرا کہا تھا۔

کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

کس قدر جوش مسرت میں ہے سر پر سہرا　　خود ہے خوشبو کی طرح جامے سے باہر سہرا

یہ طراوت عرق رخ کی نہیں ہے اس میں　　آب آئینۂ خورشید میں ہے تر سہرا

صفحہ ۱۱۶۔ "یہ پہلی غزل ہے جو مشاعرے میں پڑھی گئی اور پبلک نے اکبر کا نوٹس لیا اُسوقت اکیسواں سال تھا۔" یعنی ۱۸۶۷ء۔ فرماتے ہیں۔

سمجھے وہی اس کو جو ہے دیوانہ کسی کا　　اکبر یہ غزل ہے مری افسانہ کسی کا

۲۳ شعر کی غزل ہے تصوف کی چھوٹ چاروں طرف پڑ رہی ہے۔ ابتدائے مشق اور ایسے صاف شعر نکال لینا معمولی بات نہیں ہے۔

صفحہ ۲۸۔ "یہ دوسری غزل ہے جو اکبر نے مشاعرے میں پڑھی"۔

مبارک میکشو موسم پھر آیا بادہ خواری کا　　چمن میں شور ہے پھر آمد فصل بہاری کا

بہت کافی ترقی ہے۔

صفحہ ۱۲۴ عمر ۱۹ سال ۱۸۶۴ء

فصل گل آتے ہی اکبر ہو گئے بیہوش آپ　　کھولئے آنکھوں کو صاحب جام صہبا لیجے

صفحہ ۱۲۱ ۱۸۷۴ء یا ۱۸۷۵ء اٹھائیسواں برس تھا۔

کام آتا ہے جو وصف روئے دلبر میں چراغ　　اوج پر رہتا ہے ہر محفل میں ہر گھر میں چراغ

۲۱ شعر کی نہایت پاکیزہ اور سیر غزل کہی ہے۔

صفحہ ۱۲۴ ۱۸۷۱ء۔ ۲۵ سال کی عمر میں کہی۔

وہ آئے بھی لب بالیں تو ایسے وقت میں آئے　　کہ فرط ضعف سے ہم کر نہیں سکتے اشارہ تک

اس کی ردیف کیسی ٹیڑھی ہے اور شعر کس قدر درد انگیز ہے۔

بہر طور یہ طے ہے کہ سترہ سال کی عمر سے ایسا کہنے لگے تھے جسے خود انھوں نے اپنے کلیات میں جگہ دی۔

ابتدائے کلام میں نو مشقی ضرور تھی مگر صفائی بھی کافی تھی اور زور طبیعت روز بروز رنگ دکھاتا جاتا تھا۔ آتش کے سلسلہ میں تھے۔ وحید الدین صاحب وحید سے تلمذ تھا جو بشیر صاحب کے شاگرد تھے، بشیر صاحب خواجہ آتش صاحب کے شاگرد تھے۔

اکبر حسین صاحب کو منشی وحید صاحب کی شاگردی پر فخر تھا اور اپنے اُستاد کو خدا جانے کیا سمجھتے تھے، ایک جگہ فرماتے ہیں۔

اُستادی وحید میں جس کو کلام ہو　　تیار اس سے بحث کو اکبر ہے آج کل

اور عملاً بھی اکثر اوقات جو اعتراضات وحید صاحب سے نہ اُٹھتے تھے ان کا جواب حتی الوسع خود دیا کرتے تھے۔ وحید کے معزز شاگردوں میں کچھ دنوں بعد منشی امین الدین قیصر صاحب دیوان مطبوعہ کا نام بھی شامل ہو گیا۔ وحید صاحب کا رنگ کلام سلیس اور فصیح ہونے کی وجہ سے عام طور پر بہت مقبول تھا اور بعض غزلیں ذوق کی غزلوں کی طرح گلی کوچہ میں گائی جاتی تھیں اور کہیں کہیں اب بھی گائی جاتی ہیں مگر مشاعروں میں ان پر اکثر اعتراضات ہوتے تھے۔ مثلاً ایک دفعہ دریاباد کے مشاعرے میں انھوں نے ایک مطلع پڑھا۔

بلبل شیدا کو دکھلا دو تماشا پانوں میں　　تم زر گل کا پہن لو آج توڑا پانوں میں

اس پر دو اعتراضات ہوئے (۱) یہ کہ میں غلط ہے کا ہونا چاہئے (۲) دکھلانا متروک ہے۔

اسی طرح اس مطلع پر بھی اعتراضات کی بوچھار ہوئی ہے۔

وہ اگلی سی اب مے پرستی نہیں　　گھٹا جھومتی ہے برستی نہیں

اس میں نکتہ چیں حضرات صوری اور معنوی دونوں 'کمی' بتاتے ہیں۔

سنہ ۱۸۸۱ء کے بعد جب اکبر حسین صاحب منصف ہو کر علیگڈھ چلے گئے، الہ آباد میں ذوالقدر جنگ آگئے۔ دریاباد کے رؤسا نے اپنی جائدادیں وقف کیں اور مشاعروں کی جگہ

قصیدہ خوانی کی محفلیں اور مرثیوں کی مجلسیں ہونے لگیں تو وحید صاحب بھی گوشۂ عافیت میں اپنے گھر پر بیٹھ گئے جہاں ۱۱ رمضان المبارک ۱۸۹۲ء میں ان کا انتقال ہوگیا۔
ان کی تاریخ اس مصرعے سے نکلتی ہے۔ ع شاعر خوش مقال مرد = ۱۸۹۲ء
وحید صاحب کے آٹھ ضخیم دیوان ہیں مگر مطبوعہ کوئی نہیں ہے۔ ان کے نواسوں کے پاس محفوظ ہیں اور کچھ کلام پٹنہ کے بعض شاگردوں کے پاس ہے۔ سنا ہے انجمن ترقی اردو والے دیوان وحید شائع کرنے کی فکر میں ہیں۔

وحید صاحب کے چند شعر نمونۃً پیش کئے جاتے ہیں تاکہ ارباب نظر ان کے مذاق طبیعت سے آشنا ہوجائیں اور دیکھ لیں کہ لسان العصر کے ابتدائی کلام پر اس کا کتنا اثر پڑا ہے اگرچہ اکبر کی جدت پسند طبیعت کی روش ہمیشہ جدا رہی مگر شروع کی غزلوں میں وحید کا رنگ غالب تھا

(۱)

کس وقت تیرے رخ پر زلفِ دوتا نہیں ہے ‏ ‏ کب روشنی کی، دشمن کالی گھٹا نہیں ہے
قاصد کی جان جائے پرزے کریں وہ خط کے ‏ ‏ تقدیر میں ہماری کیا کچھ لکھا نہیں ہے

(۲)

میں نے مانا کہ تمھیں کام تھا فرصت بھی نہ تھی ‏ ‏ دور سے شکل دکھا جاتے یہ صورت بھی نہ تھی
جان دی ہجر میں تم نے تو بہت خوب کیا ‏ ‏ ان سے ملنے کی وحید اب کوئی صورت بھی نہ تھی

(۳)

اٹھی ہیں ساقی کالی گھٹا دل کو ہمارے لہرا گئی ہیں
بھر دے شراب کہنہ سے ساغر اگلی ہوائیں پھر آگئی ہیں
بجلی تڑپ کر ٹوٹی زمین پر دکھلائی کیا کیا نیرنگ سازی
یاد آگیا ان آنکھوں کا جادو نیچی نگاہیں تڑپا گئی ہیں
فصل بہاراں آئی ہے کیسی پھولا پھلا ہے گلزار عالم
نخل تمنا کی ہے خرابی شاخیں تک اس کی بل کھا گئی ہیں

(۴)

وہ ملے ہم کو فنا کا رنگ دکھلانے کے بعد | راہ پر تقدیر بھی آئی تو مٹ جانے کے بعد
ان کو کچھ تسکین دل ہوتی جو تڑپانے کے بعد | سرد ہو جاتے ہم ایسے ذبح ہو جانے کے بعد
قبر میں کیا کیا فرشتوں کو تھے ارمان سوال | کچھ نہ پوچھا مجھ سے تیرا نام بتلانے کے بعد

وقت مجھ پر دو کٹھن گذرے ہیں ساری عمر میں
اک ترے آنے سے پہلے اک ترے جانے کے بعد

اکبر کے اشغال زندگی ۱۸۵۹ء سے ۱۸۷۹ء تک
نوکریاں۔ وکالت۔ مشاعرے

اشغال زندگی میں سب سے پہلے میں نے نوکریوں کو لیا ہے۔ ان کے ذاتی حالات کا ذکر منظور نہیں۔ محض اخلاقی اور ذہنی کیفیات کی تصویر کشی کرنا چاہتا ہوں۔

(۱)۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ جمنا مشن میں انھوں نے انگریزی کی دو چار کتابیں پڑھ لی تھیں، جی نہیں لگا، یا کچھ وجوہ ایسے ہوئے کہ ترک تعلیم کر دیا۔ جمنا مشن اسکول کے پاس دریائے جمنا پر پل بن رہا تھا۔ یہ پل دو حصّوں میں ہے۔ کچھ پہلے کچھ بعد کو بنایا گیا اور بہت مضبوط بنایا گیا ہے ایک حصہ پر نینی کی طرف سے آمد و رفت محض پاپیادہ حضرات کی ہوتی ہے۔ دوسرے حصّہ سے بیل گاڑیاں، یکّہ، بگھی سب آتے جاتے ہیں۔ لداؤ کے اوپر سے دونوں حصّہ پر ریل آتی جاتی رہتی ہے۔ پتھر مرزا پور سے آتے تھے جن کی پیمائش اکبر صاحب کے سپرد تھی۔

(۲)۔ جمنا برج سے گھبرا کر چلے تو الہ آباد کے اسٹیشن پر ریلوے مالگدام میں بیس[۲۰] روپیہ پر نوکر ہوئے۔ اس زمانہ کے تفصیلی حالات معلوم نہیں۔

(۳)۔ تھوڑے دنوں کے بعد اس نوکری سے بھی جی اُکتا گیا۔ آخر سال میں چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو گئے۔ اب فکر ہوئی کہ کچہری میں کوئی جگہ تلاش کرنی چاہیئے۔

اکبر نے ایک عرضی لکھی اور سوال خوانی کے وقت پیشکار کو اور عرضیوں کے ساتھ دیدیا۔

تاریخ حاضری کے دن جب گئے تو کلکٹر صاحب نے صورت دیکھتے ہی پہچان لیا اس لئے کہ اس وقت ۱۳ برس کا سن تھا سب سے نوعمر تھے مسکرائے اور کہنے لگے اس بچہ نے ایک ذرا سا پرچہ لکھ کر دیدیا وہ اِن پوری پوری عرضیوں میں کھو گیا ہے۔ ہم مجبور ہیں کیا کریں۔ لسان العصر چپکے وہاں سے واپس ہوئے۔ بجائے انھوں نے کچھ چھیڑا یا صاحب کے بلڈاگ نے آپ ہی آپ ان کو دوڑا لیا، پاس ہی ایک درخت تھا اکبر جھٹ سے اُوپر چڑھ گئے مگر کتا ہے کہ تنے کے پاس بھونکتا جا رہا ہے۔ صاحب کے بہرے نے آکر کتے کو چپ کیا مگر اکبر صاحب ہیں کہ نہیں اُترتے " تم جب تک اس بدتمیز کو باندھو گے نہیں اور سزا نہ دو گے میں نیچے نہ اتروں گا" یہاں تک شور ہوا کہ صاحب خود نکل آئے، میم صاحب بھی آئیں ہجوم ہو گیا۔ سب اکبر کی طفلی اور صاف گوئی پر ہنستے رہے۔ آخر کتا باندھا گیا، صاحب نے خود اطمینان دلایا تب درخت سے اترے۔ اس لطیفے سے کم سنی، صاف گوئی، عزم اور استقلال کے سبق حاصل ہوتے ہیں۔

بہرطور آپ گھر تشریف لائے اور بجائے اس کے کہ شکستہ دل ہو کر بیٹھ جاتے۔ بانس کے کاغذ کا ایک بہت بڑا تاؤ بازار سے خریدا اتنا بڑا جتنا مدرسوں میں ہندوستان کے نقشہ کا کاغذ ہوتا ہے ایک مشک بید خریدا بہت موٹا سا قط لگایا اور انگلی انگلی بھر کے موٹے موٹے حروف سے عرضی لکھی اور کاغذ کا پلندہ تیار کر لیا۔

دوسرے روز سوال خوانی کے وقت پہنچ کر بلا کسی توسط کے پوری عرضی صاحب کے میز پر پھیلا دی عرضی نے پوری میز ڈھانک لی بلکہ کچھ کاغذ ادھر اُدھر بھی لٹکتا رہ گیا۔ ابھی بات تازہ تھی صاحب کو "ایک ذرا سا پرچے والا" قصہ یاد تھا بہت ہنسے اور اسی وقت نقل نویس مقرر کر دیا۔ کمسنی اور ظرافت کی وجہ سے صاحب کی نظر عنایت ان کی طرف رہتی تھی۔ جب انھوں نے بات چیت سے دیکھا کہ اکبر نہایت سنجیدہ اور قابل ہیں اور اطلاعنامے، پروانے، حکم احکام سب بے تکلف، قلم برداشتہ لکھ سکتے ہیں تو صاحب نے کہا انگریزی کی قابلیت بڑھاؤ اور نائب تحصیلداری کے لئے تیاریاں کرو۔

وکالت

دو برس کے بعد صاحب کا تبادلہ ہو گیا اور اکبر نے بھی نوکری چھوڑ دی۔ ۱۸۶۶ء کے قریب

خیال آیا کہ وکالت کا امتحان دیدو۔ اس زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ وکالت کا امتحان جو درجہ اول میں پاس کرتا تھا، اس کو ہائی کورٹ کی اجازت ملتی تھی جو درجہ دوم پاس کرتا وہ سشن ججی تک کے مقدمات لے سکتا تھا اور جو تیسرے درجہ میں کامیاب ہوتا تھا وہ صرف وکیل منصفی ہوتا تھا۔

اکبر کی انگریزی تعلیم بہت معمولی ہوئی تھی۔ چند ابتدائی کتابیں پڑھی تھیں اور وکالت کے امتحان میں تعزیرات ہند اور قانون شہادت ایسی مشکل کتابیں داخل تھیں جن پر اس وقت تک صدہا شرحیں لکھی گئی ہیں اور بی۔ اے تک پڑھنے کے بعد ان کتابوں کے سبق وکالت کے درجوں میں دو برس تک ہوتے رہتے ہیں۔ بہرکیف ایک روز اکبر اپنے ایک معزز رشتہ دار سراج الدین حیدر صاحب سے ملے اور کہا "حضور آپ مجھے تعزیرات ہند اور قانون شہادت شام کو دیدیا کیجئے میں صبح کو واپس کر دیا کروں گا۔

سراج صاحب واقف تھے، پوچھا بھائی کیا کروگے۔ کہا کچھ نہیں دیکھوں گا اس میں کیا لکھا ہے۔ اس پر سراج صاحب کو بے ساختہ ہنسی آگئی کہنے لگے اس خبط کو جانے دو اس کی عبارت مشکل ہے اور معانی بہت زیادہ پیچیدہ ہیں۔ آخر اکبر کے اصرار سے مجبور ہو کر انھوں نے دونوں کتابیں دیدیں۔ صبح کو اکبر نے واپس کیں۔ سراج صاحب نے پوچھا، کچھ پڑھا کچھ سمجھے، کہنے لگے، ہاں پچاس پچاس صفحات پڑھے سمجھ میں آتی ہے آپ کہیں سے کچھ پوچھئے تو معلوم ہو کہ واقعی میں سمجھا ہوں یا نہیں۔

سراج صاحب نے کتاب کھولی پہلی دفعہ جس دفعہ پر نظر پڑی پوچھ لیا۔ اکبر نے اس دفعہ کی پوری پوری عبارت معہ علامات کے بتادی اور اس کا ترجمہ بھی کر دیا۔ سراج صاحب دنگ رہ گئے اور واقعی ہزار دو ہزار میں اس ذکاوت، یادداشت اور حافظ کا آدمی ایک دو سے زیادہ نہیں نکلتا۔

وکالت کے امتحان میں ایک مجسٹریٹ بھی شامل تھے۔ انھوں نے اکبر کی قابل رشک ذہانت اور معلومات کثیرہ سے متاثر ہو کر ضلع کے کلکٹر سے گفتگو کی۔ کلکٹر نے اکبر حسین صاحب کو بلوا کر خود بات چیت کی تو جو کچھ سنا تھا مخاطب کو اس سے کہیں زیادہ پایا۔ فوراً بارہ کی تحصیلداری میں بھیجدیا مگر دیہات میں نہ شعر و سخن کے چرچے تھے نہ دوست احباب کی مجلسیں تھیں، سال ہی

دو سال میں طبیعت اکتا گئی۔ خود فرماتے ہیں۔

نہ پروانہ سے محفل اور نہ بلبل سے چمن چھوٹا — مجھی سے جلسہ رنگیں یاران وطن چھوٹا

روز روز چھٹیاں لینے پر تحصیل والوں کے تیور بگڑے تو استعفا دے کر گھر چلے آئے۔

۱۸۷۰ء میں اپنے ایک عزیز کی تحریک سے جو ہائی کورٹ میں رجسٹرار تھے، لسان العصر مثل خواں مقرر ہو گئے۔ مگر اس دوران میں بھی کبھی مطالعہ سے غافل نہیں رہے۔ مثل مشہور ہے کہ 'کرتے کی بدیا' ہائی کورٹ کے مثل خوانی کے سلسلہ میں ذہن و ذکاوت کے فیض سے قانون دانی اور انگریزی ایسی بڑھ گئی کہ انھوں نے ہائی کورٹ کی وکالت کا امتحان پاس کر لیا۔ سات برس تک الہ آباد، گونڈہ، گورکھپور اور آگرہ میں وکالت کرتے رہے۔ خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔

شعر گوئی کی وکالت میں مجھے فرصت کہاں — یہ بھی اکبر خاطر احباب گورکھپور رہے

آگرہ ۱۸۷۴ء کلیات اکبر حصہ اوّل دور اوّل صفحہ ۱۱۳ و ۱۱۴

تو ہے وہ برق تجلی کہ ترا نقش قدم — روکش آئینہ مہر جہانتاب ہوا

چشم معنی سے جو کی سیر طلسمات جہاں — پتا پتا مجھے اک گلشن ایجاد ہوا

قطرے قطرے میں ہوئی وسعت دریا پیدا — ذرہ ذرہ صفت مہر جہانتاب ہوا

۱۸۷۳ء الہ آباد۔

کیسی کیسی وہ لگاوٹ کی نظر کرتے ہیں — دھوکے کھاتا ہے ہمارا دل ناداں کیا کیا

گونڈہ

بڑھا ہے خرچ اس قدر ہمارا کہ ہیں ہمارے حواس غائب

جو بیس آئے تو بیس غائب پچاس آئے پچاس غائب

آگرہ کے متعلق دو لطیفے صفحہ ۲۵۵ حصہ اوّل

شو میکری شروع جو کی اک عزیز نے — جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے

پوچھا کہ بھائی تم تو تھے تلوار کے دھنی — مورث تمھارے آئے تھے غزنین و غور سے

کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات نوک کی — روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

دوسرا لطیفہ

صہبا صاحب ایک درویش صفت مگر باذاق شاعر تھے۔ اکبر کے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ ایک دن اکبر نے کہا بھائی صاحب نماز عشا محلہ کی مسجد میں پڑھ لیا کیجئے میں بھی آجایا کروں گا۔ اس کے بعد دونوں اُٹھ کر گھر چلے آئیں گے ذرا لطف صحبت رہے گا۔ صبح کو صہبا صاحب آئے تو کہنے لگے بندہ نواز معاف کیجئے گا میں شب کو حاضر نہ ہو سکا، بات یہ ہے کہ مسجد میں داخل ہوا تو لق و دق عمارت بھائیں بھائیں کر رہی ہے۔ وہ سناٹا وہ وحشت وہ ویرانی تھی کہ توبہ توبہ۔ اکبر صاحب ایک ذرا خاموش ہو گئے، مسکرائے اور اسی وقت ایک شعر کہہ دیا:-

شیخ جی رات کو مسجد میں نہیں جاتے ہیں   یعنی ڈرتے ہیں کہ بیٹھا کہیں اللہ نہ ہو

ایک تو شیخ کی پھبتی صہبا صاحب پر پھبی خوب دوسرے 'کہیں اللہ نہ ہو' کے پردہ میں صہبا صاحب کو کیا معقول جواب دیا ہے۔ وکالت کے دوران میں ان کے منشی صاحب کو وکالت منصفی پاس کرنے کا خبط ہوا اور حالت یہ تھی کہ "گردگاں برگنبد" کا معاملہ تھا۔ تمام نصاب ختم کر چکے تو اکبر صاحب کے پاس ایک دن حاضر ہوئے اور کہنے لگے، حضور جہاں سے چاہیں امتحان لے لیں۔ اکبر کی فطرت میں خوش دلی کا عنصر غالب ترین تھا، ایک ذرا سے سکوت کے بعد پوچھا بھائی اگر کوئی کسی کے منہ میں زبردستی اپنا ہاتھ ٹھوس دے تو کون سی دفعہ کا مجرم ہوا۔ منشی جی نے فوراً جواب دیا "حضور یہ تو مداخلت بیجا بخانہ دیگر" ہے۔ مسکرا کر چپ ہو رہے۔

مشاعرے

دریاباد (الہ آباد) میں مشاعرے کے اکھاڑے ہوتے تھے جن میں ایک طرف تو ناسخ کے شاگرد دوسری طرف قلق کے تلامذہ، ایک طرف منشی میر درد کے شاگرد اور دوسری طرف وحید اور ان کے شاگردوں کا مجمع ہوتا تھا۔ آپس میں خوب چشمک ہوتی تھیں حکیم فضل حسین صاحب فروغ قلق کے بھانجے اور شاگرد بھی رہتے تھے۔

لسان العصر بھی ان مشاعروں میں اس طور پر شریک ہوتے تھے کہ سر پر سپاہیانہ صافہ بندھا ہوا، بدن میں گہرے رنگ کا قمیص آب رواں یا اور ہلکے ہلکے کپڑے کی چکن سے جھلکتا ہوا

ڈاب میں تلوار لگی ہوئی، خواجہ آتش کی پیروی تھی۔

امتحانی طرحیں تقسیم ہوتی تھیں۔

ایک مرتبہ مشاعرے سے صرف ایک دن پہلے شام کے وقت وحید صاحب گھبرائے ہوئے بیٹھے تھے، اکبر پہنچ گئے پوچھا، حضور مزاج کیسا ہے۔ وحید صاحب نے کہا بھئی کیا کہوں لوگوں نے میری آبرو لینے کے لئے کل جلسۂ مشاعرہ میں بلایا ہے اور ابھی ابھی مصرعہ طرح بھیجا ہے۔ مائل ہوں، قائل ہوں ؎ ازل سے کشتۂ تیغ نگاہ ناز قاتل ہوں۔

عرض کیا حضور تردد کیسا پہاڑ ایسی رات باقی ہے فکر کیجیے میں تو ساری رات جاگوں گا کچھ شعر ہو ہی جائیں گے۔ غرض دوسرے روز خوب تیار ہو کر پہنچے۔ وحید صاحب نے بھی غزل پڑھی۔ اکبر نے بھی معرکۃ الآرا غزلیں پڑھیں۔ سہ غزلہ کہا تھا۔ ۲۷ شعر ایک سے ایک اچھے نکالے تھے، ملاحظہ ہوں صفحات ۱۲۸ و ۱۲۹، ۱۳۰ و ۱۳۱ کلیات حصہ اوّل۔

خودی بھی مجھ سے جب واقف نہ تھی میں تب سے بسمل ہوں
ازل سے کشتۂ تیغ نگاہ ناز قاتل ہوں

نمونہ کے کچھ شعر ملاحظہ ہوں۔

زمینِ شعر جس سے آسماں بن جائے اے اکبر
علوئے طبع سے ایسی غزل پڑھتے یہ مائل ہوں

جو لذت آشنائے دردِ الفت ہے میں وہ دل ہوں
اجل جس کو قیامت تک نہ آئیگی وہ بسمل ہوں

اجل سے پوچھتا ہے ہر نفس جو باہر آتا ہے
اجازت ہو اگر تیری تو پھر سینہ میں داخل ہوں

درِ گنجینۂ اسرارِ معنی کھول دو اکبر
بس اب پیرِ خرد اقرار کرتا ہے کہ جاہل ہوں

کہیں دل ہوں کہیں میں باعثِ بیتابیِ دل ہوں
کہیں اندازِ بسمل ہوں کہیں میں نازِ قاتل ہوں

یہ دریائے معانی جوش پر ہے دل میں اے اکبر
مگر ساکت ہوں جبتک آپ میں آنے کے قابل ہوں

اس دن مشاعرے میں اکبر کا رنگ رہا مگر حکیم فضل حسین صاحب فروغ ایک مرد بزرگ تھے قلق کے بھانجے اور شاگرد وہ اکبر کی تعریف اس انداز سے کرتے کہ ہر اچھے شعر پر وحید صاحب کیطرف مخاطب ہو کر داد دیتے تھے۔ مطلب یہ تھا کہ آپ ہی نے یہ شعر کہکر دیدیئے ہیں۔ منشی تنیر کے ایک شاگرد نیر تخلص کرتے تھے وہ غالباً جولاہے یا کنجڑے تھے انھوں نے بھی فروغ صاحب کی دیکھا دیکھی وہی رنگ اختیار کیا کہ وحید صاحب کو مخاطب کر کے شعر کی داد دینے لگے۔

آپس میں چشمکیں ہوئیں اور طے یہ ہوا کہ اسی وقت مشاعروں میں ایک نئی طرح دی جائے اور دو گھنٹہ میں لوگ شعر کہہ کر پڑھیں۔ برہم نہیں ہوتا۔ کم نہیں ہوتا۔ طرح ہوئی۔

لسان العصر نے خوب خوب داد دی نہایت لاجواب غزل پڑھی۔ مطلع میں فروغ اور نیر دونوں کو لے ڈالا۔

فروغ کم بضاعت رونق عالم نہیں ہوتا — مہِ نَو بدر ہو کر نیرِ اعظم نہیں ہوتا

ایک دوسرے مشاعرے کا ذکر ہے، ایک بزرگ صورت شاعر نے ایک شعر پڑھا۔ توسن میں۔ آہن میں، طرح تھی۔

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھکو اس طرح باندھیں — کہ رسی ہاتھ میں اُن کے ہو پھندا میری گردن میں

لوگوں نے خوب خوب تعریفیں کیں کئی بار یہ شعر پڑھا۔

اکبر نے عرض کی سبحان اللہ کیا شعر فرمایا ہے مگر حضور یہ شعر تو قطعہ بند تھا وہ دوسرا شعر بھی پڑھ دیجئے تو مکمل لطف ہو جائے۔ شاعر نے گھور کر دیکھا کہ ایک بچہ شوخیاں کرتا ہے۔ مُنہ بنا کر کہنے لگے مجھے تو یاد نہیں۔

اکبر کہنے لگے حضور بھول گئے ہوں گے آپ کی اجازت سے میں پڑھے دیتا ہوں اور بلا انتظار پڑھنے لگے۔

میں راضی قتل پر ہوں گر وہ مجھ کو اس طرح باندھیں — کہ رسی ہاتھ میں ہو اور پھندا میری گردن میں
مکاں اغیار سے خالی ہو مجمع دوستوں کا ہو — کمر سے باندھ کر دامن نچا دیں اپنی آنگن میں

مشاعرہ کا مشاعرہ اس جدت اور زود گوئی پر لوٹ گیا۔ شعر واقعی شاعر کے رنگ میں تھا۔ معشوق پورا مداری بن گیا اور جو کمی رہ گئی تھی پوری ہو گئی۔ شاعر صاحب بہت کھسیانے ہوئے بہت جھینپے، بہت بگڑے مگر کرتے کیا!

اکبر آپ اپنی نگاہ میں

رسالہ اُردو بابت اکتوبر ۱۹۲۳ء صفحہ ۱۵۵ "اکبر کا آخری دورِ شاعری" (عبدالماجد صاحب دریابادی)

"وہ خود (لسان العصر) اپنے کلام کو دوسروں کے کلام سے ممتاز پاتے تھے۔ ایک جگہ

اس فرق کو یوں ظاہر کرتے ہیں۔
میں اپنے آپ میں ان شاعروں میں فرق کرتا ہوں سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں
عجیب شعر فرمایا ہے اپنی طرز سخن کے لئے چند لفظوں میں ثابت کر دیا ہے کہ :۔
۱۔"سب سے جدا روش مرے باغ سخن کی ہے" وہ اپنے رنگ کے موجد و آخر ہوئے ہیں
ان کے حیات میں بھی اور بعد حیات بھی لوگوں نے ان کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی جسمیں
ڈاکٹر اقبال صاحب بھی تھے مگر سب کے سب ناکام رہے، کیوں ؟
(۱) اکبر کو جب تمام اصناف سخن اور زبان پر قدرت ہو چکی تھی کہنہ مشقی آچکی تھی اس وقت
انھوں نے یہ رنگ اختیار کیا۔
(۲) لوگوں نے بعض خصوصیات ظرافت کا خیال نہیں کیا۔
(۳) استقرار نہیں کیا اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ :۔

این سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

۲۔آورد و آمد کا فرق دکھایا ہے۔
۳۔ملٹن کے نظریہ شعر کو کس خوبی سے ثابت کر دیا ہے کہ شاعر کو مجسم شعر ہونا چاہئے۔
۴۔شعر ان کے لئے محض تفریح کی چیز نہ تھی بلکہ ارسطو ایسے فلسفی کے نقطۂ نگاہ سے
الفاظ سیرت انسان کا آئینہ ہیں۔ سیرت کی تحریک سے الفاظ درست ہوتے ہیں اور الفاظ کے
اثر سے سیرت درست ہوتی ہے۔
اس شعر کے لطف و کیفیت سے متاثر ہو کر میری سمجھ میں جو مطالب آئے ہیں نے لکھدیئے
ذرا خود اکبر صاحب کی تشریح معانی ملاحظہ فرمایئے۔ مکاتیب اکبر بنام عزیز لکھنوی صفحہ ۱۷۲
نمبر ۱۸۳۔
آپ کا یہ فرمانا کہ میں شعر اپنے لئے کہتا ہوں۔ مجھ کو جس سبب سے پسند آیا اس کی تفصیل ذرا
مشکل ہے۔ میرا مصرعہ شاید آپ کو یاد ہو ع۔ سخن ان سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں۔
دوسرا پہلو یہ ہے۔ بلبل اگر کہے میں اپنے لئے گاتا ہوں۔ گراموفون اوروں کے لئے گاتا ہے۔
تقلید ہے تو اس کا کہنا بیجا نہ ہوگا۔

تیسرا پہلو یہ ہے۔ ایک شخص گنگنا رہا ہے، اپنا دل بہلا رہا ہے۔ وہ اپنے لئے گاتا ہے۔ تان سین اکبر کے حضور میں گا رہے ہیں۔ یہ اور کے لئے گاتے ہیں۔ سامع اہل دل کو روکتا نہیں لیکن ہر ایک کو اس کی طلب نہیں ہے۔

چوتھا پہلو۔ خاکسار ہوں۔ مبتدی ہوں۔ اپنے لئے کہتا ہوں۔ خود ہی کامل نہیں ہوں جب آپ کی طرح کامل ہو جاؤں گا اُس وقت کہدوں گا کہ پبلک کے لئے کہہ رہا ہوں" اگر در خانہ کس است یک حرف بس است۔"

غرور انھیں ہے تو مجھکو بھی ناز ہے اکبر سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

خواہ سیاسی رنگ میں دیکھئے خواہ عرفان و تصوف کی طرف لے جایئے خواہ صرف عاشقانہ سمجھئے۔ جناب اکبر کا ایک روشن پہلو یعنی خدا پر اعتماد اس شعر سے روشن ہوتا ہے۔

ملا جو خانہ تن خاک میں تو ملنے دو یہ رنج کیا ہے کہ زندان آب و گل نہ رہا

اس شعر سے راضی بہ رضا ہونے اور فلسفۂ حیات کے متعلق شاعر کے نظریہ پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے نزدیک موت ایک نعمت ہے جس کی بدولت لطیف روح کو مٹی پانی کے کثیف قید سے رہائی ہوتی ہے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ لوگ موت پر افسوس کیوں کرتے ہیں اُن کو خوش ہونا چاہئے۔

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

واقعاً حضرت اکبر اپنی ساری عمر بے نیاز اغراض رہے۔

جو محفل میں اکبر نے کھولی زباں گلستاں میں بلبل چہکنے لگا

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے اور بیان کرتے ہیں کہ پڑھنا بھی سحر تھا۔ کلام بھی جادو تھا۔

جو شوق مستی ہو دل کے اندر تو آپ سنئے کلام اکبر
اگر ہو ذوقِ شراب و ساغر تو پیجئے بزم جم میں آکر

"بزم جم" کی تخصیص سے اپنے کلام کا مرتبہ ظاہر کر دیا ہے۔ طبیعت کا میلان "شوق مستی" سے ظاہر کیا ہے۔

ذی علم مصنّف ہو رہے حامی ملّت ارمان نہیں ہے کوئی اس ارماں سے بہتر

اس شعر سے صحیح آئیڈیل اور ایم مقصد اصلی اور معیار حیات قائم کر دیا ہے۔

تحیر آپ کی غزلوں پہ آتا ہے مجھے اکبر — بتوں پہ آپ مرتے ہیں کہ شیطانوں سے لڑتے ہیں

اکبر کی برائی اچھائی تو پوچھ محلہ والوں سے — نظم ان کی سنی ہے البتہ ہاں شعر تو اچھے کہتے ہیں

جن کو محض اکبر سے بلحاظ شاعر و مصنف کے عقیدت ہے وہ آخری ٹکڑے کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔

یار کے دل میں اثر ہو یہ ہے مقصود کلام — اس کی پرواہ نہیں محفل میں اگر واہ نہ ہو

مصنف کے نزدیک اصلیت کی قدر ہے۔ نمایش ہیچ ہے، اثر کے سامنے واہ کی کوئی قدر نہیں۔

بند کر اپنی زباں ترک سخن کر اکبر — اب مری بات کی دنیا کو ضرورت نہ رہی

ذکی الحسی اور زمانہ کی غیر منصفانہ رویہ کی تصویر ہے۔

بار خاطر ہو تو واعظ کا بھی ارشاد برا — دل کو بھا جائے تو اکبر کی خرافات اچھی

اس سے مطالعہ فطرت انسانی کا پتہ چلتا ہے۔

کر دیا کنج قناعت میں بسر اکبر نے — عزت دل تو سلامت رہی دولت نہ سہی

کاش ناظرین بھی "عزتِ دل" اور دولت کی قیمت کا فرق سمجھ لیں۔

کام کی بات جو کہنی ہو وہ کہہ لو اکبر — دم میں چھن جائیگی یہ طاقت گویائی بھی

صاف ظاہر ہے کہ حیات کا فرض یہی ہے کہ خلق خدا سے کام کی بات کہی جائے۔

بتخانہ میں کچھ فیض نہ ہوگا تمھیں اکبر — تم یاں بھی بجز ذکر خدا کچھ نہیں کرتے

شوق عبادت اور تغزل کی معنوی خوبیوں کی طرف بلیغ اشارہ ہے۔

محل شکر ہیں اکبر یہ درفشاں نظمیں — ہر ایک زبان کو یہ موتی عطا نہیں ہوتے

فضل خدا کا شامل ہونا نہایت ضروری ہے۔

قلعی بھی ریا کار کی کھلتی رہے اکبر — طعنوں سے مگر طرز تہذب بھی نہ چھوٹے

اپنی تعریفیہ شاعری کی حقیقت بیان کی ہے، افسوس ہے کہ عبد الماجد صاحب نے جس وقت بعض مذہبی اور سیاسی معاملات میں خموشی یا احتیاط کی بنا پر اکبر کے دامن روش پر کمزوری اخلاق

کا دھبّہ لگایا ہے۔ وہاں اس شعر کے لطیف کنایوں سے چشم پوشی کرگئے ہیں اگر طعنے مہذب نہ رہ جائیں تو کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو الٹا ہوتا ہے۔

کیا کام چلے ان کی توجہ نہیں اکبر　　اب کہئے خوشامد کی تو وہ کی نہیں جاتی

مرحوم کو عمر بھر خوشامد سے نفرت رہی۔

نظم اکبر سے بلاغت سیکھ لیں ارباب عشق　　اصطلاحات جنوں میں بے بہا فرہنگ ہے

جو لوگ محض سطحی معنوں پر جاتے ہیں اُن کو تنبیہ ہے۔

ہو دعوی توحید مبارک تمھیں اکبر　　ثابت بھی کرو اس کو مگر طرز عمل سے

اپنی عملی زندگی کا پہلو دکھایا گیا ہے۔ مرحوم نماز روزہ اور تلاوت کے عمر بھر پابند رہے۔ (خطوط و مکاتیب ملاحظہ ہوں۔)

پند اکبر کو دیں گے کیا ناصح　　گُل کو کیا باغباں سنواریں گے

اکبر خود اپنی خوبیوں سے کافی باخبر ہیں اور جانتے ہیں کہ جو چیز حسین اور مکمل ہے، اُس میں کسی طرح کی زیادتی ہو ہی نہیں سکتی، اس لئے کہ زیادتی ہمیشہ کمی کا حال بتاتی ہے جو دلیل نقص ہے۔

وہ رنگ بزم اکبر اب کہاں بہتر ہے اُٹھ جاؤ　　یہی بس ایک تدبیر سکون جان محزوں ہے

انقلاب آسماں دکھایا گیا ہے۔

فتنے مسجد میں اُٹھتے ہیں اکبر　　دیر میں بیٹھ ترک دین کرکے

ممکن ہے کہ مسلمانوں کی خانہ جنگیوں کی طرف اشارہ ہو یا ترکستان کے انقلاب کی طرف۔

اِن بتان بیوفا کے حسن کا دلدادہ ہے　　غکر ہے اکبر کی رنگین دل نہایت سادہ ہے

کلام و حیات کا مکمل تبصرہ ہے۔

حکم اکبر کو ہوا ہے کہ کرو ترک سخن　　خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

شعر گوئی ترک کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے بے بنیاد شہادت پر حکم ہوا تھا۔ دوسرے مصرعہ سے اپنے حیات و کلام کی یکدلی دکھائی ہے۔

گذر چکا ہے مرا کام ضبط سے اکبر　　میں راز عشق اب اپنا چھپا نہیں سکتا

عرفان کے اس درجہ تک پہونچ گئے ہیں جب خموشی باقی نہیں رہ سکتی۔ بے چینی کی کیفیت کو کیسے عمدہ لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔

وہ چشم ہوں کہ جو ہے محو جلوہ توحید　　وہ دل ہوں جس میں تجلی ہے نور عرفاں کی

اکبر کی پوری سرگذشت اسی ایک شعر میں مضمر ہے۔

وہ بات ہوں کہ جولائی ہے جوش میں دل کو　　وہ حال ہوں جسے سُن سُن کے وجد آتا ہے
کیونکر نہ شعر اکبر آئے پسند سب کو　　یہ رنگ ہی نیا ہے کوچہ ہی دوسرا ہے

"سخن سے میں سنورتا ہوں" کی مزید تشریح ہے۔

جدّت ہو فکر میں تو توارد کبھی نہ ہو　　مضمون کیوں لڑیں جو طبیعت لڑی رہی

احتیاط، فکر، اختراع سب کچھ ایک ہی شعر سے ظاہر کر دیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اکبر کے یہاں توارد کالعدم ہیں۔

حشر تک اب ہاتھ آنے کے نہیں مضمون حشر　　تم نے اے اکبر کوئی پہلو نہ چھوڑا حشر کا

نمونہ حشر کا اور دھڑ کا حشر کا اس زمین اکبر نے ۱۸ شعر کی غزل کہی ہے جس کا مقطع یہہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فکر کلام میں کس قدر محنت کرتے تھے۔

رہی ہر کام میں ہر وقت مسبب پہ نگاہ　　اپنا منظر نہ کبھی عالم اسباب ہوا

خطوط مطبوعہ سے بھی اس عقیدہ کا پتہ چلتا ہے۔

وہ گل رنگیں ہوں میں پیدا ہے جس سے رنگ یار　　رنگ وہ ہوں جس میں پنہاں ہو گئی ہے بوئے دوست
میں وہ آئینہ ہوں اس حیرت سرائے دہر میں　　جس میں جوہر کے عوض رہتا ہے عکس روئے دوست
معرا ہوں ہنر سے میں سراپا عیب ہوں اکبر　　عنایت ہے احبا کی اگر اچھا سمجھتے ہیں

انکساری کا کتنا لطیف اظہار ہے۔

نخل حسرت وہ ہوں میں جس کو ہیں یکساں چار فصل　　وہ شجر ہوں باغ عالم میں جو پھلتا ہی نہیں
وہ تمنا ہوں جو رہتی ہے ہمیشہ جی کے ساتھ　　حوصلہ وہ ہوں جو دنیا میں نکلتا ہی نہیں
رنگ وہ ہوں جو زمانے کے ہے باہر رنگ سے　　وہ زمانہ ہوں جو رنگ اپنا بدلتا ہی نہیں
شوق وہ ہوں وسعت دل جس کے آگے تنگ ہے　　حرف مطلب وہ ہوں جو منہ سے نکلتا ہی نہیں

اکبرؔ کے لئے الفاظ محض لباس ہیں اصل شے خیال و مضمون ہے۔

ڈال دے جان معانی میں وہ اُردو یہ ہے　　کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے

اپنی زبان کے متعلق ارشاد ہے۔

جناب اکبرؔ سے کوئی کہدے کہ لوگ بیٹھے ہیں ہر طرح کے
اس انجمن میں اور ایسی باتیں یہ آپ کیا قہر کر رہے ہیں

اپنی فطری احتیاط کا اعلان ہے اور اس بات کی ندامت بھی ہے کہ ہر بات کا ایک محل ہوا کرتا ہے۔ حکومت کے محکمۂ "خفیہ" کے اراکین کی طرف بھی اشارہ ہے۔

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبرؔ
مگر معانی ہیں ایسے روشن کہ نور کی طرح چھن رہے ہیں

واقعہ بھی یہی ہے کہ اکبرؔ کا مفہوم صاحبِ نظر سے کبھی پوشیدہ نہیں رہتا۔

میں نے کہا اکبرؔ میں کوئی رنگ نہیں ہے　　کہنے لگے شعر اس کے جو سُن لو تو پھڑک جاؤ

نکتہ چینوں کا جواب ہے۔

بعد پنشن کے تصنع سے مجھے ساز نہیں　　ہوں جو بے شغل تو اکبرؔ یہ کوئی راز نہیں

۱۹۰۳ء کے بعد کی زندگی کا مرقع ہے۔ تصنع اور نمائش سے ہمیشہ احتراز فرماتے تھے۔

سخن شناس سے میں چاہتا ہوں دادِ سخن　　خوشی کے واسطے کافی ہے مجھ کو واہ فقط

اگرچہ مضمون نیا نہیں مگر ایجاز سے دوسرا پہلو بھی نکل آتا ہے یعنی سخن شناس کی واہ کافی ہے اور ناشناس کی داد خواہ جوہر کے ساتھ ہو یا نہایت جوش و خروش سے ہو کافی نہیں۔

رقیبوں نے بہت نظمیں پڑھیں اور درفشانی کی　　میں اشک آنکھوں میں بھر لایا بلاغت اسکو کہتے ہیں

اگر زبانی دعوے جذبات سے خالی ہوں تو بیکار ہیں۔

مرے سازِ سخن سے پست فطرت کو تنغص ہے　　پیا تو بے سرا سمجھا گیا بزمِ شغالاں میں

کیا اچھی تعریض ہے۔ وجہ کیسی معقول ہے۔

فتوائے کفر دینا واعظ کی بے حسی ہے　　یہ عشقِ بت نہیں ہے اکبرؔ کی پالسی ہے

اپنی احتیاط کے اصلی مقصد کو دکھایا ہے۔

دل وہ ہوں جس میں چھپے ہیں خار حسرت سینکڑوں
خار حسرت وہ ہوں جو دل سے نکلتا ہی نہیں
نقد سودا وہ ہوں جو رائج نہیں بازار میں
سکۂ داغ جنوں وہ ہوں جو چلتا ہی نہیں

ان اشعار میں یاس و حسرت سے قطع نظر "زمانہ" میں اور "اپنے" میں یہ فرق محسوس کرتے تھے اس کو ظاہر کر دیا ہے۔

ہجوم آہ سوزاں سے خیال روئے تاباں سے
فروغ بزم ماتم ہوں چراغ خانۂ دل ہوں
حجاب روئے قاتل سے غم ناکامی دل سے
نگاہ چشم حسرت ہوں شہید ناز قاتل ہوں
ہوائے باغ عالم سے جفائے خنجر غم سے
بقائے رنگ عشرت ہوں وفائے روح بسمل ہوں
وفور شوق ماتم سے صدائے نالۂ غم سے
شریک حال حسرت ہوں شکست شیشۂ دل ہوں
بلائے یاد گیسو سے خیال تیغ ابرو سے
ظہور جوش سودا ہوں گواہ حال بسمل ہوں
لب پیمانۂ دل سے وفور شوق کامل سے
حریص لذت غم ہوں لب اظہار سائل ہوں
خیال حسن صورت سے ہجوم درد الفت سے
ہمائے اوج معنی ہوں نشان عشق کامل ہوں
علوئے جوش ہستی سے صفائے طبع عالی سے
فدائے فکر اکبرؔ ہوں نثار شعر مشکل ہوں

کہیں دل ہوں کہیں میں باعث بیتابی دل ہوں
کہیں انداز بسمل ہوں کہیں میں ناز قاتل ہوں
کہیں تمکین خوبی ہوں کہیں بیگانۂ اُلفت
کہیں رنگ رخ گل ہوں کہیں شور عنادل ہوں
کہیں عاشق کا مطلب ہوں کہیں معشوق کی خواہش
کہیں مجبور مطلق ہوں کہیں مختار کامل ہوں
کہیں ہوں گوہر مقصد کہیں دامن تمنا کا
کہیں ہمت کریموں کی کہیں امید سائل ہوں
کہیں ہوں ولولہ دل کا کہیں ہوں ضبط عاقل کا
روانی میں کہیں دریا کہیں رکنے میں ساحل ہوں
یہ دریائے روانی جوش پر ہے دل میں اے اکبرؔ
مگر ساکت ہوں جب تک آپ میں آنے کے قابل ہوں

کیا کرتا ہوں موزوں وصف اُن کے روئے روشن کا
مرا ہر شعر اکبرؔ نور کے سانچے میں ڈھلتا ہے

کیا اچھی دلیل پیدا کی ہے۔ حسن کا حقیقی معیار ہمیشہ لفظوں کی سطح سے کہیں بلند ہوا کرتا ہے۔

فکر اکبرؔ گل مضموں کا دکھا کر جلوہ
محفل شعر میں رنگ اپنا دکھا دیتی ہے

شیخ سید سے تو خالی نہیں ذکر شاعر ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکر شاعر

میں خود حیران تھا کہ اکبر صاحب اپنے اشعار میں بُدھو، وفاتی، جمن، سید وغیرہ کو کثرت سے کیوں استعمال کرتے ہیں۔ اس شعر سے میری تشفی ہو گئی۔ بات یہ ہے کہ مشاہدہ کے وقت انفرادی واقعات سے اثر ضرور لیتے ہیں، مگر استقرار کر کے محض اصُول کو نظم میں پیش کرتے ہیں چونکہ اُصول بنفسہ بہت لطیف ہوتے ہیں لہٰذا مجسم شکل کشی یا نقش نگاری کے لئے انھوں نے ہر قسم کے گروہ کے لئے ایک نمایندہ مقرر کر لیا ہے۔

باقی نہیں رہی اب دنیا سے گرم جوشی اب میں ہوں اور عزلت اور عالم خموشی

ہاشم مرحوم اور اکبری بیگم کی موت کے بعد یہی عالم ہو گیا تھا

خدا کے واسطے اکبر کوئی ذکر اور ہی چھیڑو سُنی باتوں کا کیا سننا کہی باتوں کا کیا کہنا

جدّت اور ندرت خیال کی طرف اشارہ ہے۔

صاحب کی سی محفل تو میّسر نہیں لیکن صد شکر کہ اکبر کے بھی احباب بہت ہیں

اپنی ہر دلعزیزی اور کثیر الاحبابی کا ذکر ہے۔

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ و برہمن دونوں موافق اپنے پاتے ہیں مرا چلن دونوں

ترانے میرے ہم آہنگ دیر و کعبہ ہیں یکساں لبوں پر میرے موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں

مجھے اُلفت ہے سُنی سے بھی شیعہ سے بھی یاری ہے اکھاڑے میں دکھا سکتے ہیں دلکش بانکپن دونوں

مجھے ہوٹل بھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دُوارا بھی تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد اور مٹن دونوں

مذہبی بے تعصبی اور معاشرتی رواداری کی تصویریں کھینچی ہیں۔

بزم اکبر دانش آموز و نشاط انگیز ہے ہر سخن اس کا لطیف و خوب معنی خیز ہے

بالارادہ اس سے جو کرتا ہے اعراض و گریز ناتواں بیں وہ ہے یا کودن ہے یا انگیز ہے

روشنی جن میں نئی ہے وہ مری سنتے نہیں لاکھ سمجھاؤ کہ صاحب ہے یہ فانی روشنی

انجم و شمس و قمر لیکن ہیں مرے ہم طریق وضع پر قائم ہیں ان میں ہے پرانی روشنی

اپنے رکھ رکھاؤ اور وضعداری کا ذکر ہے۔

نظم اکبر ہے دافع جادو و کفر ماشاء اللہ شاعری ہے تو یہ ہے

اپنے کلام کا اثر اور اس میں اصلاح دل و دماغ کا جو جوہر موجود ہے اس کا اظہار کیا ہے۔

کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اِس زمانے میں ۔۔۔ رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں

رقیب اور اس زمانے نے عجیب لطیفہ پیدا کر دیا ہے۔ ذکر حق سے اکبر بہت کم غافل رہتے تھے۔

اکبر مجھے شک نہیں تیری تیزی میں ۔۔۔ اور تیرے بیان کی دلاویزی میں

شیطان عربی سے ہند میں ہے بیخوف ۔۔۔ لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

بیان کی دلکشی ظاہر ہے۔ مغربی تمدن کا اثر ہندوستان پر دکھایا گیا ہے۔

اکبر کا نغمہ قوم کے حق میں مفید ہے ۔۔۔ دل کو تو گرم رکھتا ہے وہ بے سُرا سہی

قوم پرستی کو اکبر نے فریضۂ زندگی اور حاصل شاعری قرار دیا تھا۔

واہ اکبر بس سقیم کول ہو کر رہ گئے ۔۔۔ خود فروشی کی نہیں انمول ہو کر رہ گئے

اکبر کی طرز زندگی کا ایک دلچسپ مرقع ہے۔

راحت جان ہے میری نظم دلاویز اکبر ۔۔۔ تندرستی رہے ایمان رہے جان رہے

واقعی کلام کی سیر سے روح کو لذت حاصل ہوتی ہے۔ سکون ملتا ہے۔ دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھلتی ہے۔ یاس امید سے اور حسرت ولولہ سے بدل جاتی ہے۔

کلیات حصّۂ دوئم

غم دہر سے بچاتا ہے بشر کو مست رہنا ۔۔۔ مجھے شاعری نہ آتی تو میں بادہ نوش ہوتا

مئے تصوف اور میخانۂ عرفاں کی بے خودی کس مزے سے بیان کی ہے۔ غالب کے شعر کے ساتھ پڑھیے تو پورا لطف آجائے۔

غالب ؎ یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب ۔۔۔ تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عشق کے فن میں ہے اکبر کا بھی درجہ عالی ۔۔۔ عیب کچھ اس میں نہیں ضبط نہ کرنے کے سوا

عرفان کی بلند منزلوں پر پہنچ چکے ہیں۔ بعض جگہ نکات تصوف جو بے ساختہ زبان سے نکل جاتے ہیں ان کو اپنی لغزش سمجھتے ہیں۔

سانس لینے میں بھی اے اکبر کر و اب احتیاط ۔۔۔ موقع فریاد و آہ بے تامل ہو چکا

حافظ شیرازی کے اشعار کی طرح سیاسی، مدنی، ملکی، عرفانی، مجازی، حقیقی جس رنگ میں اس شعر کو سمجھئے ہر طرح مطلب حاصل ہے یعنی فطری احتیاط اکبر میں بہت تھی جس کو خود مرحوم نے حسن نظامی کے پاس جو خطوط بھیجے ہیں ان میں اپنی حد اعتدال سے بڑھی ہوئی احتیاط کو 'وہم' کے نام سے یاد کیا ہے۔

اُن کے پرچے کے لئے اکبر نے کہدی یہ غزل ۔۔۔ شکر ہے اُترا تقاضا حضرت آزاد کا

آزاد سے غالباً ابوالکلام آزاد کی ذات مراد ہے۔ اس تقاضا اُترنے کی تائید مرحوم کے خطوط سے بھی ہوتی ہے۔ اکثر مدیران اخبار و رسائل کے تقاضوں سے پریشان ہو جاتے تھے۔

شعر غیروں کے اسے مطلق نہیں آئے پسند ۔۔۔ حضرت اکبر کو بالآخر طلب کرنا پڑا

اس جگہ اپنے اور دوسرے میں فرق دکھایا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کر دی ہے کہ

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی ۔۔۔ کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتوں میں نہاں ہو کر

اکبر تری باتیں کبھی ہوتی ہیں نہیں ختم ۔۔۔ کیا حال ہے تراکہ بیاں ہو نہیں سکتا

اپنی پرگوئی کے لئے کیسا اچھا پہلو تلاش کیا ہے۔

اس میں برائی کیا تھی جو میں نے ۔۔۔ احیائے رسم دیرینہ چاہا

وہ رسم قدیم کو از سر نو زندہ کرنا چاہتے تھے۔

وہاں الفاظ خفزرہ ہیں یاں معنی بے منزل پر ۔۔۔ زباں کا ان کو دعویٰ ہے تو مجھکو ناز ہے دل پر

کیا کام چلے کیا بات بنے کیا رنگ جمے کون اسکی سنے ۔۔۔ ہے اکبر بیکس ایک طرف اور ساری خدائی ایک طرف

گوشہائے 'ناشنو' کی شکایت ہے۔

کہتے ہیں دوست اکبر کو دیکھکر بحسرت ۔۔۔ ہے اس کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

لوگوں کو مرحوم سے جو الفت و ارادت تھی اور ان کی نگاہوں میں جو عزت و مرتبت تھی یہ شعر اس کا ترجمان ہے۔

قابل قدر طبیعت ہے ہماری اکبر ۔۔۔ ہیں مصیبت میں اور اللہ سے خوش رہتے ہیں

جو لوگ مجبوری کا نام صبر رکھتے ہیں ان کو ہدایت ہے کہ صبر ہنسی خوشی راضی برضا رہنے کا نام ہے۔

اگر چاہو نکالو عیب تم اچھے سے اچھے میں
اگر ڈھونڈھو تو اکبرؔ میں بھی پاؤ گے ہنر کوئی

قاعدہ ہے کہ خود حضرت انسان جب کبھی برائیاں نکالنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں تو ان کی نگاہ میں کسی میں کوئی اچھائی نظر ہی نہیں آتی۔

الفاظ ہیں محل پر معنی مکان پر ہیں
اس وقت نظم اکبرؔ فطرت سے ہے قریں تر

'محل پر' کے معنی موقع محل کے ہیں۔ 'مکان پر' کے معنی بلند درجات کے ہیں۔ اکبرؔ نے کوشش کی ہے کہ ان کی شاعری غیر فطری نہ ہونے پائے۔ یہی وجہ ہے کہ عالمگیر اثر ہوتا ہے۔

میرے حقوق بھی کچھ اُردو زبان پر ہیں
اُمید ہے دعا کی اہل سخن سے اکبرؔ

کس مزے سے کہا ہے حقوق کیا احسانات ہیں۔ دیکھئے اب اہل سخن کیا قدر کرتے ہیں۔

ہم اپنے دل میں ہیں کہتے ہمیں تو کچھ بھی نہیں
وہ کہتے ہیں کہ تمھیں ہو جو کچھ ہوا اے اکبرؔ

سعدی کے اس شعر کے ساتھ پڑھیے ؎

اسپ طرب خویش بافلاک رساند
آنکس کہ بداند و نداند کہ بداند

یہ شیشے بادۂ مضموں کے کتنے تیز اترتے ہیں
مرے الفاظ کا رنگ آج مشتاق سخن دیکھیں

صرف آج ہی نہیں ہمیشہ ایسے ہی تیز اترتے ہیں۔

ان کی خواہش ہے کہ لفظوں کی بھی تکرار نہ ہو
جنگ جوئی فصحا رکھ نہیں سکتے جائز

آپ اکبرؔ کے یہاں کبھی تکرار لفظی نہ پائیں گے۔

بے بصیرت نہیں جو ان کا خریدار نہ ہو
قیمت دل تو گھٹانے کا نہیں میں اکبرؔ

بعض لوگ طلب دولت میں اپنا ادبی معیار گھٹا دیتے ہیں۔ اکبرؔ کو یہ طریقہ ناپسند ہے۔

گوشہ میں جا کے بیٹھو اور جام و سبو لو
ھنگامۂ جہاں سے آزردہ ہو کے اکبرؔ

آخر عمر میں عزلت نشینی ہو گئی تھی۔

دل لگانا ہی پڑا اب بُت گمراہ کے ساتھ
دوست کہتے ہیں تغزل نہیں تجھ میں اکبرؔ

اکثر حضرات کا اور خصوصاً الہ آباد والوں کا اعتراض ہے کہ اکبرؔ کی غزلیں بہت پھیکی ہیں یعنی ان میں حسن و عشق، دیر و حرم کی وہ چاشنی نہیں گرما گرمی نہیں جو اَوروں کے کلام میں ہے کیسا اچھا جواب دیا ہے ایک گمراہ کے لفظ سے خاموش کر دیا ہے۔

مست ہے نغمۂ بلبل سے چمن میں اکبر　　آپ محفل میں سنیں راگ مزامیر کے ساتھ

فطری اور مصنوعی موسیقی کا فرق دکھایا ہے اور فطرت پرستی کی نقاب کا ایک گوشہ الٹ دیا ہے۔

میں ہوں کیا چیز جو اس طرز پہ جاؤں اکبر　　ناسخ و ذوق بھی جب چل نہ سکے میر کے ساتھ

کیا ہوا کوئی جو اکبر کا ہم آہنگ نہیں　　باغ میں نغمۂ بلبل بھی نہیں ساز کے ساتھ

گلستانِ سخن ہے بزم ساقی فیض معنی سے　　زبان خامہ اکبر ہے یا منقار بلبل ہے

ترے بعد اکبر کہاں ایسی نظمیں　　وہ دل ہی نہ ہوں گے کہ یہ آہ نکلے

کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں۔

ہر عمل تیرا ہے اکبر تابع عزم حریف　　جب یہ موقع ہو تو بھائی کچھ نہ کرنا چاہیئے

اپنی احتیاط کی وجہ بتاتے ہیں "دیوار ہم گوش دارد"

جامہ زیبوں کی نظر بھی دلق اکبر پر پڑی　　شان ہی کچھ اور تھی اس خرقہ پارینہ کی

ملک کے صاحب نظروں نے جب اکبر کو "لسان العصر" کا خطاب دیا اس وقت کا شعر ہے صلاحیت اور قابلیت کلام کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

سکہ ہے کھرا میرے سخن کا　　سب نے اس کو پرکھ لیا ہے

بھلا دو میرے منہ سے بات اگر کوئی بری نکلی　　یہ بے دردی ہے کہنا آہ بسمل بے سری نکلی

تنگ نظر نکتہ چینوں کو بتایا ہے "نالہ پابند نے نہیں ہے"

کیا ضرورت رہ الفت میں سخن سازی کی　　صدق کافی ہے بس اکبر اثر دل کے لئے

شوق صداقت کا اظہار ہے۔

حضرت اکبر کے استقلال کا ہوں معترف　　تا بمرگ اس پر رہے قائم جو دل میں ٹھان لی

شعر ترا اکبر کے سن اے سامع عالی دماغ　　قدر کر اے آسماں اس ابر گوہر بار کی

خموشی سے طریق راست پر قائم رہ اے اکبر　　نہ جا گفت و شنود دہر پر دنیا ہے بکتی ہے

استقلال کی دوسری تصویر ہے۔

شاعری میرے لئے آساں نہیں　　جھوٹ سے واللہ نفرت ہے مجھے

زور رندی ہے نصیب دیگراں　　شاعری کی صرف قوت ہے مجھے

دونوں شعر انتہا کے بلیغ ہیں بار بار پڑھیے اور محظوظ ہو جیے۔

نغمہ یورپ سے میں واقف نہیں — دیس ہی کی یاد ہے بس گت مجھے

بت زہرہ جبیں نے بھیرویں چھیڑی ہے اے اکبر — نماز صبح کو اس وقت تو محفل سے اُٹھتا ہے

شان استعجاب دیکھیے، ایک پہلو یہ بھی ہے کہ صبح کو فلک پر رقاصۂ آسمان نغمہ باریوں میں مصروف ہے۔

کچھ ایسی دل فریبی ہوتی ہے اشعار اکبر میں — کہ شور مرحبا ہر گوشۂ محفل سے اُٹھتا ہے

اپنے کلام کی عالمگیری کا بیان ہے۔

ناواقف وزن شعر مجھکو جو کہے — اس کے آگے ضرور ہے چپ رہنا

بلبل کو بھی بے سراوہ کہدے گا کبھی — ایسے سنجیدہ شخص کا کیا کہنا

ایک طرف تو اپنی معلومات عروض و بدیع کا اظہار ہے دوسری طرف ایک کلیہ بیان کیا ہے کہ اوزان عالم صرف طبع موزوں کا نتیجہ ہیں جو شخص فطرتاً موزوں طبع ہے وہ ناواقف وزن نہیں ہو سکتا۔

مستی اکبر کی رقص مس سے نہ رُکی — بھونرے پہ نہ ہو سکی بھنبھیری غالب

مغربی تمدن اور نئی روشنی سے اکبر کا دامن ہمیشہ پاک رہا ہے۔

اکبر کے کلام میں مزا کچھ بھی نہیں — گو اس نے بہت کہا کہا کچھ بھی نہیں

زلف و کمر بتاں کا مفقود ہے ذکر — شیطان پر طعن کے سوا کچھ بھی نہیں

نہ دل پستا ہے بسکٹ پر نہ میں پوری سے لچتا ہوں — مذاقی حاشیہ کو چھوڑ کر دونوں سے بچتا ہوں

اعتدال پسندی کا ذکر ہے۔

ابر فکر آپ کا برسا تو بہت اے اکبر — اعتراضات کی احباب میں بوچھار نہ ہو

روح پرور نہ سہی نشہ ذرا تیز تو ہے — نوجواں کے لئے ولولہ انگیز تو ہے

نہ سہی معنی قومی فقط الفاظ سہی — چند احباب کا اک شغل دلاویز تو ہے

پہلے تیسرے مصرعہ کو میں نے یوں سنا تھا "ہم نے مانا کہ نہیں کچھ بھی کلام اکبر"۔ نوجوانوں کی تخصیص نہایت صحیح ہے۔ طبقہ طلبار میں اکبر کا کلام خصوصیت سے مقبول ہے۔

آزاد ہوں نہیں ہے کوئی مدعائے خاص | جس رُخ پہ قافیہ مرا مطلب بھی ہے وہی
مذہب کو شاعروں کے نہ پوچھو جناب شیخ | جس وقت جو خیال ہے مذہب بھی ہے وہی
پیری و افسردگی سب کچھ سہی اکبر مگر | ظلم ہے تیری خموشی شوخی گفتار پر
بجز خطائے نظر اور سہو کاتب کے | کچھ اعتراض اگر ہیں تو سود مند نہیں

بیجا اعتراضات کی طرف اشارہ ہے۔

مری طرز فغاں کی بوالہوس تقلید کرتے ہیں | خجل ہونگے اثر کی بھی اگر امید کرتے ہیں

اکبر کی ہر دلعزیزی کے رشک سے اور طلب شہرت کے تقاضہ سے بعض حضرات نے اکبر ہی کے مخصوص رنگ میں شعر کہنے شروع کئے تھے مگر دل سے نکلے ہوئے نالوں میں اور بنائے ہوئے رونے کے اثر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب | یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی
ٹھیک پڑھ سکتا نہیں کہتا ہے ناموزوں مجھے | خود زباں معترض ہی خارج از تقطیع ہے

اسی طرح کے اکثر اتفاق مرحوم کو پیش آتے تھے۔

اشعار غیر سے تو مجھے کم سند ملی | من گفتم و محاورہ شد سے مدد ملی
اک شاعری وہ ہے جسے فطرت سے میل ہے | اک شاعری وہ ہے جو اکھاڑے کا کھیل ہے
دونوں ہیں گو کہ اپنی جگہ مستحق داد | منزل سے اس کو کام ہے اس کو کلیل ہے
کیا ملے داد سخن بنگلہ نشینوں سے مجھے | وہ سمجھتے ہی نہیں قدرشناسی کیا ہے

اکثر کلیہ میں مستثنیات ہوتے ہیں۔

گو اپنے ساتھ آپ کا ہرانہ لے گیا | اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا
ذکر خدا یا داجل کافی ہیں اس کے واسطے | میدان آنر اک طرف اکبر کی ہمت اک طرف

کلیات سوئم

اس کی پروا نہ رہی خوش رہے دنیا مجھ سے | عاقلوں میں مری گنتی ہو یہ سودا نہ رہا
حال دل میں سنا نہیں سکتا | لفظ معنی کو پا نہیں سکتا

کرو سکوت نہیں وقت اعتراض اکبر فضول بحث سے اپنوں کو تم نے غیر کیا

اعتراف تقصیری ہے۔

کھلا دیواں مرا تو شور تحسین بزم میں اٹھا مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

نہ پائی دل نے راحت اس قدر بزم احبا میں انھوں نے جب درِ تحسیں مرے اشعار پر کھولا

ہوئی جس درجہ کلفت گپ میں ایسے سوالوں سے یہ تم کس واسطے لکھا یہ تم کس واسطے بولا

ہمیشہ کہتا تھا ہر بات پر نمی دانم کچھ اس میں شک نہیں اکبر بڑا ہی عالم تھا

یہ شعر ایک عالم کے جذبات دلی کا ترجمان ہے۔

معنی کو چھوڑ کر جو ہوں نازک بیانیاں وہ شعر کیا ہے رنگ ہے لفظوں کے خون کا

زبان بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد سکوت ہی مجھے رہتا ہے اب تو آہ کے بعد

ہوائے گلشن طبع تو دلکش است اکبر کہ از گل سخنت بوئے یار می آید

جو ہیں اہل بصیرت کہتے ہیں اکثر یہ اکبر سے غنیمت ہے ترا دم ہند میں لیکن یہ دم کب تک

گو مجھ میں ہے بلاغت گو شعر با اثر ہیں لیکن مرے مصائب مجھ سے بلیغ تر ہیں

میر و اکبر کے کلام میں جو درد موجود ہے اس کا غالب حصہ دونوں کے مصائب حیات کا نتیجہ ہے۔

تجھے ہم شاعروں میں کیوں نہ اکبر منتخب سمجھیں بیاں ایسا کہ سب مانیں زباں ایسی کہ سب سمجھیں

کلام اکبر فصاحت سے مالامال ہے، بلاغت سے لبریز ہے۔ سلاست کے متعلق ایک اور رباعی فرمائی ہے۔

ترکیب سلیس میں جو ہم لاتے ہیں مضموں دقیق لطف دکھلاتے ہیں

اٹھتا ہے صدائے شور تحسین اکبر آورد میں آمد کا مزا پاتے ہیں

میرے سکوت سے مجھے بےحس نہ جانیئے الفاظ کی کمی ہے خیالات کی نہیں

"الفاظ کی کمی میں" اردو کی کم مائیگی بھی ایک حد تک شریک ہے ابھی تک اس میں لطیف جذبات ادا کرنے کی صلاحیت نسبتاً کم ہے۔

شعر اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں دل پہ گذری ہوئی ہے اور کوئی بات نہیں

جناب حضرت اکبر کی کوئی نبض تو دیکھے ۔۔۔ یہ کہنے کو تو ہر حالت میں کہہ دیتے ہیں اچھا ہوں

خوش اخلاقی اور بشاشت کی طرف اشارہ ہے۔

جو اس کچھ نیک کام کرلیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھر لیں ۔۔۔ مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

دنیا میں ہوں دنیا کا طلبگار نہیں ہوں ۔۔۔ بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

ہو نہیں سکتا بیان حال دل الفاظ میں ۔۔۔ جوش بھی ہے طبع میں اور شعر میں فائق بھی ہوں

زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے رکتے ہیں ۔۔۔ جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کہہ بھی چکتے ہیں

پوچھا اکبر ہے آدمی کیسا ۔۔۔ ہنس کے بولا وہ آدمی ہی نہیں

پھر کیا ہے؟ اس کا فیصلہ آپ کیجئے۔

مجھ کو کچھ پوچھنا ہے اکبر سے ۔۔۔ یہ کبھی ہوش میں بھی آتے ہیں

اللہ اللہ بیخودی کا کیا عالم ہے۔

میرے اشعار نگیں آپ کے سننے کے قابل ہیں ۔۔۔ اسی گلزار کے ہیں پھول جو چننے کے قابل ہیں

اسی، سے تخصیص بھی ہوگئی اور گلزار محدود بھی ہوگیا۔

قاعدوں میں حسن معنی گم کرو ۔۔۔ شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

بے جا اعتراض کا جواب ہے۔

کہو یہ اکبر سے بیٹھ چپکا حرم کے اندر خدا خدا کر ۔۔۔ ہر ایک کا یہ مشن نہیں ہے کہ دیر دنیا میں غزنوی ہو

"دیر دنیا" کی ترکیب سے کس قدر اچھوتا اور لطیف پہلو نکال لیا ہے۔

ہوا ہے خون آرزو کا اکثر یہ ہے بہار کلام اکبر ۔۔۔ سخن کو رنگین کر دیا ہے دل و جگر نے تڑپ تڑپ کر

تم سے استادوں میں میری شاعری بیکار ہے ۔۔۔ ساتھ سارنگی کا بلبل کے لئے دشوار ہے

وہ ایذائیں مجھے مایوسیوں نے دی ہیں اے اکبر ۔۔۔ کہ امید اب قدم رکھتے ہوئے بھی دل میں ڈرتی ہے

سخن سنجی کا کیا کہنا مگر یہ یاد رکھ اکبر ۔۔۔ جو سچی بات ہوتی ہے وہی دل میں اترتی ہے

نہ سہی حسن عمل خوبی گفتار سہی ۔۔۔ ہے تو اکبر میں بھی اک بات گنہگار سہی

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے ۔۔۔ ہوا ہی بدلی ہوئی ہے فلک سے کون لڑے

خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے ۔۔۔ ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض جڑے

اگر اُٹھے تو علم اپنا گاڑلیں گے کہیں | جو اُٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم خود ہی گڑے

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیئے ہیں اس کے خوب | کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

افواہ ہے کہ اکبرؔ بیہوش ہو گیا ہے | یہ تو غلط ہے لیکن خاموش ہو گیا ہے

خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے | یہ میری حالت کہ مجھ پر تھینک یُو بھی شاق ہے

آخر حصہ عمر کا آئینہ ہے۔

بہت پسند ہے مجھ کو خموشی و عزلت | دل اپنا ہوتا ہے اپنا خیال ہوتا ہے

ہمیں تو خامشی میں دل سے اپنے کام لینا ہے | زباں وہ بزم میں کھولیں جنھیں انعام لینا ہے

حضرت اکبر کا ان روزوں بڑا ہی نام ہے | پولو پونی پر حدی خوانی انھیں کا کام ہے

اپنا مشن اور زمانہ کی ناموزونیت کی داستان ہے۔

مذاق بزم احبا جو کچھ بھی ہو اکبرؔ | میری زباں بھی وہی ہے میرا بیاں بھی وہی

تغیرات زمانہ کا اثر اکبر کی زبان و بیان پر نہیں پڑا۔

ہے منع ملاقات میری ہم نفسوں سے | فریاد کا موقع نہیں فریادرسوں سے

تعداد وہی انگلیوں کی گو ہے بدستور | بیگانگی ساعد و بازو ہے دسوں سے

ہے حکم کہ حس پالسیوں کے ہو مطابق | اب کام بدن کو نہ رگوں سے نہ نسوں سے

چوری نہ کبھی کی ہے نہ کرنے کا ارادہ | پھر بھی یہ ضرورت ہے کہ بھاگوں عسسوں سے

حکومت کی طرف سے کچھ زمانہ کے لئے خموش رہنے کا حکم ہوا تھا۔

خموش شمع صفت کیوں نہ ہو زباں میری | کہ خود ہی بزم میں روشن ہے داستاں میری

بہت نہ رونے سے یہ نہ سمجھو کہ کم ہے جوش سرشک دلیں | یہ آنسوؤں کی کمی نہیں ہے رعایت طرف آستیں ہے

جو میری ہستی تھی مٹ چکی ہے نہ عقل میری نہ جان میری | ارادہ ان کا دماغ میرا خیال ان کا زبان میری

اظہار غلامی ہے۔

زبان و لفظ کا جلوہ فقط حد بیاں تک ہے | تسلسل موج معنی کا خدا جانے کہاں تک ہے

تھی عقل زبان پہ اے اکبر اور عشق پر رکھی ہم نے نظر | ممتاز رہے ہشیاروں میں سرخیل رہے دیوانوں کے

نہ پوچھو بیٹھا ہوں کیوں ہاتھ پر میں ہاتھ دھرے | اٹھوں گا نبض ذرا دیکھ لوں زمانے کی

اکبر کی خرافات سے ناخوش ہوئے ایسے
نامہ ہے نہ پیغام نہ حصہ ہے نہ بخرا
مانا کہ حسینوں کے لئے ناز ہے لازم
لیکن کوئی پوچھے تو کہ پاگل سے بھی نخرا
میری طرف سے سارا جہاں بدگماں ہے اب
آزادی کلام وہ مجھ میں کہاں ہے اب
رکھتی ہیں پھونک پھونک کے باتیں مری قدم
تیغ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب
دست اندازی پولس کی ہو جس میں روا
ہرگز نہ اسے کلام اکبر سمجھو

حضرت عزیز لکھنوی کے نام ایک خط میں حضرت اکبر شکایت لکھتے ہیں کہ کسی صاحب نے "برطانیہ نظام کو واپس برار دے" کو خواہ مخواہ اکبر کی طرف منسوب کر کے اس پر طبع آزمائی کی تھی (مکاتیب اکبر)

بس اتنی بات ہے سامع میں ہو مذاق سخن
مجال کیا جو مرے شعر پر اچھل نہ پڑے
عشاق کو بھی مال تجارت سمجھ لیا
اس قہر کو ملاحظہ للہ کیجئے
بھرتے ہیں میری آہ کو فونوگراف میں
کہتے ہیں فیس لیجئے اور آہ کیجئے
اگرچہ ہے ذوق تمکنت کا لحاظ رکھتا ہوں سلطنت کا
خدا نے قائم کئے ہیں درجے خیال ہے حد منزلت کا
زبان کھولوں تو پوچھ لوں گا کہ دل کہاں تک ہے اسکا ساتھی
قدم بڑھاؤں تو دیکھ لونگا جو منتہا ہے میری سکت کا
میں کب ہوں نغمات دل سے غافل نہیں ہوں سازوں پہ پھر بھی مائل
برا جو کھچ جائے گا کوئی سُر تو لطف جاتا رہے گا گت کا
ان میں موج مغربی مجھ میں ہوائے شرق ہے
وہ گزٹ میں غرق ہیں بندہ غزل میں برق ہے
اک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرعہ یہ تھا
دیدۂ عبرت سے رنگ دہر فانی دیکھی
کوئی بول اٹھا زوال حسن بت مقصود ہے
اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھی
عارفانہ شاعری بھی آج کل دشوار ہے
بزم دنیا میں یہ زور بدگمانی دیکھی
وہ خرافات پر ہیں داد طلب
واہ وا پر عجب مصیبت ہے

زمانہ کے رنگ کی تصویر ہے۔

اگرچہ دعوئ اسلام ہے مگر بالفعل
سوا خدا کے ہمارا کوئی گواہ نہیں

ایسے زمانہ میں جب ہر چیز کیلئے دلائل و براہین کی ضرورت ہوتی ہے کسقدر جامع شہادت دی گئی ہے۔

چھوڑ نا ممکن ہے اکبر شوخی گفتار کو — ترک حق گوئی ہے مشکل محرم اسرار کو

محرم اسرار کو سیاسی، مدنی، یا جس رنگ میں چاہئے سمجھ لیجئے۔

مدخولہ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا — اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

گورنمنٹ سے پنشن ملتی تھی۔ مجبور تھے۔

ہوشیاروں میں تو اک سے سوا ہیں اکبر — مجھکو دل والوں میں لیکن کوئی تجھ سا نہ ملا

اکبر اور اَودھ پنچ

سلسلہ "صبح" میں کلام اکبر کے دوش بدوش ظریفانہ مضامین کا سلسلہ "اودھ پنچ" لکھنؤ کے دور اول میں جاری رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اودھ پنچ کے ایڈیٹر سید سجاد حسین صاحب تھے۔ مصنف حاجی بغلول وغیرہ۔ رتن ناتھ سرشار، چکبست۔ شرر۔ ڈپٹی امامت حسین (الہ آبادی) اور اکبر اس وقیع پرچہ کے لئے برابر مضامین بھیجتے رہتے تھے۔ میری تحقیق بتاتی ہے کہ اکبر نے ۱۸۷۴ء سے ۱۸۸۰ء تک ا۔ح۔ الہ آبادی کے نام سے مضامین لکھے ہیں۔ اقتباسات سے نوعیت اور اور خصوصیات ظاہر ہو جائیں گی۔

اس وقت میرے پیش نگاہ ایک نامہ ہے جو مرحوم نے ۱۸۷۷ء میں اودھ پنچ کو بھیجا تھا۔ نامہ گلزار نسیم کی بحر میں ہے۔ شروع کے اشعار میں فارسیت غالب ہے۔ چہرہ کے رنگ میں مذاق متقدمین کی جھلک ہے۔

اے گوہر مخزن ظرافت — وے جوہر معدن لطافت

سرمایۂ انبساط خاطر — تسکین دل و نشاط خاطر

ہادی وادیب ودانش آموز — کشاف رموز عشرت اندوز

کیا خوب ہے نسخۂ اودھ پنچ — مجبوب ہے نسخۂ اودھ پنچ

صنعت تجنیس ملاحظہ ہو۔

دن رات یہی ہیں اب تو چرچے — پرچاتے ہیں دل کو اس کے پرچے

اب ذرا زبان کی سادگی اور شیرینی کا لطف اٹھایئے۔

ہر چند کہ زجر بیشتر ہے
گو فقرہ طعن نیشتر ہے
لیکن وہ قند میں گھلا ہے
یہ آب حیات میں دھلا ہے
بگڑے ہوئے بن گئے ہنسی میں
حکمت ہے تو ایسی دل لگی میں

دور اوّل کے اودھ پنچ کا مشن یہی تھا کہ ظریفانہ انداز سے عام آدمیوں، سیاست والوں، اور شاعروں کی لغزشیں ظاہر کر دیتا تھا جس سے منصف مزاج فائدہ اُٹھاتے تھے۔

لندن پنچ اور اودھ پنچ کا موازنہ ملاحظہ ہو۔ ترجیح بھی دی ہے تو کس خوبصورتی سے۔

ہر چند کہ طرز پنچ لندن
بے شبہ ہے دلپسند و پُر فن
لیکن وہ نقش اولیں ہے
نسبت اس سے اسے نہیں ہے
ماشاء اللہ یہ نقش ثانی
بہتر ہے بصورت و معانی
بحث مضموں میں وہ اگر پنچ
یہ حل نکات میں ہے سر پنچ
وہ اک گل صد بہار دیدہ
یہ غنچہ تازہ نو دمیدہ

اسی سلسلہ میں مشک کے قلم کی تعریف ہے جو آب زر سے لکھی جائے تو بھی کم ہے۔ شاعری اور مبالغہ نہیں ہے اصلیت اور واقعہ ہے۔

واں بازوے قاز سست بنیاد
یہاں خامہ نیزۂ چمن زاد

پر کا قلم۔

کیسا خامہ زبان معنی
کیا ذکر زبان کہ جان معنی
اٹھنے میں نگاہ چشم جادو
چلنے میں حریف تیغ بازو
مفتاح خزینۂ تصور
نقاش نگینۂ تصور

شمع اور قلم کا موازنہ، شمع کی تشبیہ درست نہیں ہے۔

کہنا اسے شمع کب روا ہے
اوصاف میں شمع سے سوا ہے
وہ چہرہ نمائے بزم صورت
یہ پردہ برافگن حقیقت
ہر چند کہ سرمہ در گلو ہے
تاہم سر گرم گفتگو ہے

پریس ایکٹ کی سختیاں لندن پنچ کے آزادانہ مباحث اور اودھ پنچ کی محدود و مفید

رائے زنی کا موازنہ کرتے ہیں۔

وقت تو جو ہے وہ اس طرف ہے — واں طبع کو زور لاتخف ہے

باقاعدہ شرح دردمندی — زنجیر خرد کی پائے بندی

کھولے ہیں قفس میں بال پرواز — کیونکر نہ ہو ادعائے اعجاز

غنچے میں بہار صد چمن ہے — دریا قطرے میں موج زن ہے

رقصاں دم تیغ پر بصد ناز — ہے نوک سناں پہ نقش پرواز

امواج میں ماہی قوی پر — شعلوں کے ہجوم میں سمندر

سمندر ایک چڑیا ہے جو چالیس برس آگ برابر جلتی رہے تو اس سے پیدا ہوتی ہے اور چکور کی طرح آگ ہی کھاتی ہے۔

پھیلی ہوئی بوئے پیرہن ہے — پابند جو یوسف سخن ہے

جناب یوسفؑ نے جب مصر سے اپنا پیرہن اپنے باپ کو بھیجا تھا تو اس کی خوشبو سے جناب یعقوبؑ کی آنکھیں دوبارہ روشن ہو گئی تھیں۔ دیکھیے سورۂ یوسف قرآن مجید۔

حدود گفتگو کے متعلق تلازمہ و تعلیل کے لطف کے ساتھ عجیب و غریب نکتہ بیان کرتے ہیں۔

دانتوں کے حصار میں پڑی ہے — منہ کے اندر زبان جڑی ہے

استادہ ہیں مائل اذیت — بتیس جوان سخت طینت

منہ میں اوسطاً بتیس[۳۲] دانت ہوتے ہیں۔

طامع جابر حریص سفّاک — ہیں مثل سفید دیو بے باک

دانت کا رنگ سفید ہوتا ہے۔ چاروں صفتیں دیو اور دانت دونوں میں مشترک ہیں۔

دوڑیں اسے کاٹنے یہ خونخوار — حد سے جو بڑھے زبان گفتار

بے خیالی میں زبان دانتوں کے نیچے دب کر لہولہان ہو جاتی ہے۔

وہ نوک خلال سے حزیں ہو — پہلو میں جوان کے ہمنشیں ہو

مسوڑے۔

کشتا ہی ہو وہ ملائم و تر ۔۔۔ دانہ پستا ہے اس میں آکر
اس قید میں جب کہ یہ زباں ہے ۔۔۔ آزادیٔ گفتگو کہاں ہے
باریک ہے گو یہ نکتہ اے دل ۔۔۔ لازم ہے سمجھ لیں اس سے عاقل
مرضی ہے غذائے جسم و جاں کی ۔۔۔ محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو آئے بک نہ جاؤ ۔۔۔ ہشیار چلو بہک نہ جاؤ

آخر میں ایک لانبی چوڑی دعا ہے جس کے کچھ شعر نمونتاً حاضر ہیں اس لئے دعا میں بھی جدت کا پہلو ہے۔

جب تک ہے رباعیٔ عناصر ۔۔۔ رنگینیٔ نقش لوحِ خاطر
جب تک یہ نظم بیت ہستی ۔۔۔ موزوں ہے برائے خود پرستی
جب تک کہ ہے روح کا لطیفہ ۔۔۔ انفاس کا ہر نفس وظیفہ
یہ پرچہ دل فریب و زیبا ۔۔۔ ہو مونس جان ناشکیبا
احباب جو اس کے ہیں معاون ۔۔۔ عالی منشاں نیک باطن
رنگیں طبعی سے گل کھلائیں ۔۔۔ چشم بدبیں کو خوں رُلائیں
پیدا ہوں وہ گوہر مضامیں ۔۔۔ دریا کے ہو لب پہ شور تحسیں

بے ساختہ بول اٹھیں سخنور
اللہ رے طبع و فکر اکبر

ان اقتباسات سے جہاں زور بیان حسن خیال اور قوت ادا کا پتہ چلتا ہے وہاں نکتہ رسی، سنجیدگی، رعایت لفظی۔ صنائع لف و نشر، تطبیق و مراعاۃ النظیر بھی جلوہ افروز ہوتی ہیں۔

جنگ نامۂ رُوم و روس

غیر مطبوعہ

اس غیر مطبوعہ جنگ نامہ کو "صبح" میں اس لئے شامل کر رہا ہوں کہ ۱۸۷۷ء کے واقعات کے متعلق ہے جس کا واسطہ اکبر کے حیات و کلام کے دور اوّل سے ہے۔

زبان و محاورات سے بھی اس زمانہ کا پتہ چلتا ہے۔ جنگ نامہ میں رزم۔ بزم۔ دعا۔ موازنہ۔ جنگ۔ شکست۔ بھاگڑ سب اپنی جگہ بے نظیر ہیں۔ خصوصیت سے موازنہ قابل دید ہے اور وہ ٹکڑا جہاں بروج اور ستاروں سے معرکہ رزم سجایا گیا ہے اور اسد و ثور کا مقابلہ ہے۔

اگر یہ اشعار اُردو کی جگہ فارسی میں ہوتے تو فردوسی کے فسانہ ہوتے والے شاہنامہ کا اک جزو ضرور ہوتے۔ طرز بیان۔ زمین۔ انتخاب الفاظ۔ سیاست نغمہ۔ زور اور روانی کے اعتبار سے اکبر کے شعر ایسے نہیں ہیں کہ ہر شعر کے عوض میں کوئی سچا محمود ان کو ایک اشرفی نہ دے۔

وقائع ۳ اگست ۱۸۷۷ء

یہ مژدہ ہے آج اہل اسلام کو — سنیں تار برقی[1] کے پیغام کو
جو ہیں احمد ایوب پاشائے ترک — سپہدار رشتحک[2] صف آرائے ترک
شکست و ہزیمت ہے انکی دروغ — خبر کلھہ[3] کی تھی سر بسر بے فروغ
سُنو جنگ دوشنبہ کی اب خبر — مقام پلونا[4] پہ رکھو نظر
وہ عثمان[5] بادشاہ جوان دلیر — جو ہے اس نیستاں میں مانند شیر
عدو اس پہ جب حملہ آور ہوئے — تباہ و پریشاں سراسر ہوئے

---

[1] غیر ملک خبریں تار کے ذریعہ آتی ہیں اور مقامی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں [2] ایک مقام کا نام ہے [3] مقامی اخبار کی طرف اشارہ ہے [4] ترکستان و روس کے بیچ کا ایک سرحدی نزاعی مقام [5] جو تاریخ میں غازی عثمان پاشا کے نام سے مشہور ہیں۔

سپہ ان کی بس ہو گئی منتشر — کہ باضابطہ[1] روس بھی ہے مقر

اجل ان کی طالب جو تھی بیدرنگ — تو سہ شنبہ کو پھر کیا عزم جنگ

مرتب کیا لشکر بے شمار — ہزاروں پیادے ہزاروں سوار

ہوئے حملہ آور بہ توپ و رفل[2] — پلونا میں پھر آکے ڈالا خلل

بہادر دل صف شکن قلعہ گیر — بہ ہمت[3] جواں بہ تدبیر پیر

وہ عثماں پاشائے جنگ آزما — بہ اقبال و ہمت مقابل ہوا

پکارا کہ اے جنرل[4] روسیاہ — نہ کر اپنے لشکر کو ناحق تباہ

جو دریا سے تو نے کیا ہے عبور — اسی کا ہے شاید یہ ناز و غرور

فریب و دغا پر تجھے ناز ہے — یہاں زور بازو میں اعجاز ہے

تجھے حیلہ سازی میں بس ہے کمال — یہاں حق پرستی کا ہردم خیال

اگر تجھ کو ہے دعوی جنرلی[5] — تو ہے اپنے قبضہ میں تیغ علی

اگر روز محشر[6] نہیں ہے قریب — فتح تجھ کو ہرگز نہ ہوگی نصیب

زبس اسکے دل میں تھا نخوت کا جوش — لگا کہنے اے ترک ناداں خموش

عبث اسقدر ہے یہ لاف و گزاف — ابھی تیرے لشکر کو کرتا ہوں صاف

کیا الغرض اس نے سامان جنگ — پیاپے لگی چلنے توپ و تفنگ

عجب جوشش فضل یزداں ہوئی — کہ ترکوں کو فتح نمایاں ہوئی

ہوئی فوج اعدا بہت بے حواس — سپاہی پریشاں جنرل اوداس

ادھر کشتی ترپیڈو[7] ڈوبہ گئی — ادھر توپ منہ کھول کر رہ گئی

---

[1] مستند طور پر [2] RIFLE گولی کی بندوق [3] یہ مصرعہ فردوسی کا ہے [4] GENERAL ایک فوجی عہدہ روس کے سردار فوج کی طرف اشارہ ہے [5] ترکیباً غلط ہے اکبر کے یہاں بہت ہے اور جائز ہے [6] روز محشر جب قریب ہوگا تو اہل اسلام کی پیشین گوئی کے مطابق مسیح موعود کے آنے اور امام مہدی کے ظہور سے پہلے دجال کا تمام قبضہ ہو جائیگا اس اشارہ کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ ناظرین کا دماغ فوراً دجال کے حلیہ کی طرف منتقل ہوتا ہے جو کانا ہوگا اور گدھے پر سوار ہوگا۔ غالباً محرر صاحب کی جدت نے ظفر کو فتح کر دیا ہے۔ [7] TARPEDO وہ کشتی جو پانی کے اندر اندر رواں رہتی ہے اور غنیم کے جہازوں کے پیندے توڑ کر ان کو تباہ کرتی ہے۔

ہوئی روسیوں کی یہ ایسی شکست ... کہ سب حوصلے ہو گئے ان کے پست

سپہدار ترکاں ہوا چیرہ[۵۱] دست ... کیا لشکر روس کو خوار و پست

ہوئی فوج ترک الغرض فتح مند ... صف فوج اعدا کو پہنچا گزند

پیام اجل تھی جو ترکوں کی زد ... ہوئے اس میں مقتول مشتاد صد[۵۲]

جو پوچھا کہ مجروح ہیں کے ہزار ... دہن زخم کے بول اٹھے بست[۵۳] وچار

جو ہے اسگڑ و منزل روسیاں ... وہ ہے زیچک و شملہ کے درمیاں

محمد[۵۴] ہیں مصروف کوشش ادھر ... عجب کیا جو ہو اسگڑو میں ظفر

سنو حالت جنگ رسینیا[۵۵] ... جو ہے داخل کشور ایشیا

ملیکاف[۵۶] وہ جنرل نامدار ... کہ جو سارے یورپ کا تھا افتخار

وہ جس پر بہت روسیوں کا تھا ناز ... جو مشہور تھا حیلہ جو فتنہ ساز

جو مختار پاشا سے کھا کر شکست ... پریشاں تھا صورت فاقہ[۵۷] مست

معین اس کی پھر آئی تھیں پلٹنیں ... کہ چودہ جو ہوتی تھیں تعداد میں

ملے توپ خانے بھی سن[۵۸] اسکوتین ... کسی پھر بھی ظالم نے گھوڑے پہ زین

جو ہے دل میں بیعزتی کی امنگ ... پھر آیا ہے وہ سوئے میدان جنگ

ہوئی ہے لڑائی بھی دو بار واں ... ولیکن نتیجہ ہے اب تک نہاں

خدا جانے کیا موقعۂ جنگ تھا ... لڑائی کا کیا رنگ کیا ڈھنگ تھا

ابھی تک نہیں آئی اسکی خبر ... کہ کس کو عطا کی خدا نے ظفر

وقائع چہارم اگست ۱۸۷۷ء

رواں ہو تو اے کلک معنی پرست ... کہ لکھوں میں اخبار چہارم اگست

---

۵۱ زبردست فتح یاب ۵۲ اسّی سو یعنی (۸۰۰۰) آٹھ ہزار ۵۳ چوبیس ہزار ۵۴ محمد پاشا سپہ سالار غازی عثمان پاشا۔ ۵۵ آرسینیا ایک مقام کا نام ہے۔ ۵۶ ایک روسی سردار کا نام ہے۔ ۵۷ کتنی اچھی تشبیہ دی ہے، حواس غائب چہرہ پر ہوائیاں اڑتی ہیں۔ ۵۸ تخاطب کا یہ طریقہ ۱۸۷۷ء میں عام طور پر رائج تھا۔

زہے شوکت و عظمت و اوج ترک | زہے نیت[۵۱] و جرأت فوج ترک
سلیمان پاشائے[۵۲] گردوں وقار | دلیر و جواں مرد و ذی اقتدار
جنھوں نے کیا سونگرو کو بھی زیر | رہے کوہ پر مثل غرندہ شیر
پس از فتح و نصرت جو واں سے پھرے | رومیلا[۵۳] کے سردار لشکر ہوئے
جدھر آمد لشکر روس تھی | طبیعت خلائق کی مایوس تھی
بڑھ آئی تھی افواج اعدا تمام | جنوبی بلکن[۵۴] تھا اس کا مقام
عدو اس کے صغرا[۵۵] میں تھے خیمہ زن | رعایا تھی سلطان کی پُر محن
رؤف[۵۶] دلاور و پاشائے ترک | جو بلکن میں تھے ہمت افزائے ترک
سپاہی تھے ان کے نہایت قلیل | سوا اس میں تھے اکثر ضعیف و علیل
ہوئے حملہ آور جو واں پر عدو | ہٹے کارنویہ[۵۷] کو وہ نیک خو
کیے روسیوں نے جو ظلم و ستم | اسے کیا کہے اب زبانِ قلم
مقابل کوئی فوج جنگی نہ تھی | رعایا کی بس جان پر آبنی
ہوئے دست دشمن میں صدہا اسیر | زن و طفل و معصوم و برنا و پیر
جو نامرد تھا دشمن کینہ خواہ | ہوئے قتل وہ سب کے سب بے گناہ
مچانے لگے اس پہ اعدائے شوم | شکست سلیمان پاشا کی دھوم
اسی دن سلیمان کو پہونچی خبر | کہ مغرور ہے دشمن خیرہ سر

جوانمرد غصہ سے بس کانپ اٹھا
کہ اب میں ہوں اور دشمن بے حیا

---

۵۱ نیت کا لفظ یہاں بہت بلیغ ہے۔ بہادری وہی ہے جو خود غرضی سے پاک ہو۔ اور بہادری وہی ہے جو بیکسوں پر زبردستی نہ کرے جیسا روسیوں کا قاعدہ تھا کہ بچوں اور بوڑھوں کو بھی انتقام کی آگ میں جلا کر خاک کر دیتے تھے۔ ایک لفظ نیت سے اکبر نے ترک اور روس کا پورا موازنہ کر دیا ہے اور بالکل وہی اثر پیدا کر دیا ہے جو ایک باکمال مصور کے قلم کے ایک ہلکی سی جنبش میں پیدا کر لیتا ہے۔ ۵۲ ایک مقام کا نام ہے۔ ۵۳ ایک مقام کا نام ہے۔ ۵۴ ایک مقام کا نام ہے۔ ۵۵ ایک مقام کا نام ہے۔ ۵۶ رؤف پاشا بہت زبردست بہادر اور مجاہد گزرے ہیں۔ ۵۷ کارنویہ بلکن کے قریب ہی ہے۔

۵۸ تعقید ہے 'دھوم' مچانے لگے سے بہت دور جا پڑا ہے مگر لفظوں کی روانی کی وجہ سے یہ تعقید سقیم و ثقیل نہیں ہے۔

وقائع ہفتم اگست ۱۸۷۷ء

مددگار ترکاں ہو پروردگار — کہ دو چار ہیں دوست دشمن ہزار
اُدھر سرویہ[1] مائل سرکشی — اُدھر منٹونگرو میں یہ برہمی
بغاوت میں مصروف رومینیا[2] — شرارت پہ آمادہ بلگیریا[3]
غرض صوبہ ہائے مسیحی تمام — ہیں اعدائے ترکان عالی مقام
اِدھر خانگی مفسدوں کا یہ رنگ — اُدھر حضرت روس سرگرم جنگ
محض ہے یہ تائید فضل الٰہ — کہ خوشحال اب تک ہے ترکی سپاہ
مگر مجھ کو حیرت ہے یہ روز و شب — کہ اس پر بھی پیہم ہیں فوجیں طلب
وہ جو گارد[5] شاہی روس ہے — اسے حکم اعدائے منحوس ہے
کہ ترتیب فوجی سے تیار ہوں — مرتب پے جنگ و پیکار ہوں
ڈویزن[6] جو ہیں روسیہ فوج کے — انھیں ہیں یہ احکام بھیجے گئے
کہ سب جمع ہو کر بنیں پلٹنیں[7] — پے جنگ ترکان مرتب رہیں
سوا اس کے اک لاکھ نوے ہزار — جوانان جنگی پے کار زار
ہوئے ہیں طلب از مقام لندور[8] — بہ حکم شہنشاہ بانی جور
یہ لکھتے ہیں اب کاتبان خبر — ہویدا ہے جس سے یہی سربسر
کہ فوجیں پے قوت دشمناں — ہیں کثرت سے بلگیریا کو رواں
بقیہ جو ہے فوج بہر مصاف — رواں ہو گی وہ جانب کوہ قاف
یہ اعدا کی کثرت یہ فوجوں کی دھوم — زہے ہمت حضرت شاہ روم
خدایا تو سلطان کو دے ظفر — کہ اعدا ہیں ناحق سوئے کین و شر
یہ حالات یونان سے ہے عیاں — کہ کرتے ہیں وہ بھی سلح بندیاں[9]

---

[1] ایک مقام کا نام ہے۔ [2] ایک مقام کا نام ہے۔ [3] ایک مقام کا نام ہے۔ [4] ایک مقام کا نام ہے۔ [5] GUARD دستہ محافظت۔ [6] DIVISION تمن۔ [7] فوجیں۔ [8] ایک مقام کا نام ہے۔ [9] ہتھیار سجانا۔ لڑائی کیلئے تیار ہونا

مقرر ہوئے سارے حکام جنگ ۔۔۔ خدا جانے یونان کو کیا ہے اُمنگ
گورنمنٹ[۵۱] انگلینڈ سے ہے عیاں ۔۔۔ کہ مڈیٹرنین[۵۲] کو ہیں فوجیں رواں
یہ دو ترپ[۵۳] کو حکم پہنچائے اب ۔۔۔ کہ بحری سفر کو ہوں تیار سب
سپاہی ہیں تعداد میں دس ہزار ۔۔۔ سوے بحر ہوں گے رواں بحر کار

وقائع ہشتم اگست ۱۸۷۷ء

وہ عثمان جو صاحب اوج ہے ۔۔۔ پلونا میں فرمان دہ فوج ہے
ملی اس سے اور آکے ترکی سپاہ ۔۔۔ نہایت قوی اب وہ ہے بارگاہ
پڑا ہے جہاں لشکر روسیہ ۔۔۔ وہ ہے پندرہ میل کا فاصلہ
ہراول[۵۴] سپاہ عدو کا مگر ۔۔۔ پلونا سے ہے صرف چھ میل پر
اِدھر ترک میدان مارے ہوئے ۔۔۔ اُدھر روس ہمت کو ہارے ہوئے
اِدھر فتح و نصرت کے جھنڈے بلند ۔۔۔ اُدھر پیتین پست دل دردمند
مظفر سپہ اس طرف نغمہ سنج ۔۔۔ اُدھر کشتگان پلونا کا رنج
مقام پلونا میں وقت مصاف ۔۔۔ ہزیمت کا ہے روس کو اعتراف
جو آئی تھی ہشتاد و صد کی خبر ۔۔۔ کہ مقتول روسی ہوئے اس قدر
گھٹا کر وہ کرتے ہیں اس کا بیاں ۔۔۔ کہ تھے صرف پنجاہ[۵۵] صد کشتگاں
خدا کو ہے معلوم اصلی شمار ۔۔۔ مگر یہ تو عالم پہ ہے آشکار
کہ کذاب ہے روسی خود ستا ۔۔۔ نہیں صدق[۵۶] سے ان کے لب آشنا
کریں قتل سو کو تو کہدیں ہزار ۔۔۔ جو مقتول سو ہوں تو بتلائیں چار

---

۵۱ سلطنت انگریزی۔ ۵۲ میڈیٹرینین (اصل لفظ) یہ ایک سمندر ہے۔ ضرورت شاعری سے تلفظ میں جو تبدیلی ہوئی ہے شاعر اس کا مجاز ہے، دوسرے کو اس کا اختیار نہیں ہے۔ ۵۳ TROOPS فوجیں۔ ۵۴ جو سردار فوج پیش خیمہ لیکر آگے چلتا ہے وہ ہراول کہلاتا ہے۔ ۵۵ پچاس سو یعنی پانچ ہزار۔ ۵۶ اس کے ہونٹھ سچائی سے آشنا نہیں ہیں یعنی ہر وقت جھوٹ بولتا ہے۔

ہزیمت اٹھائیں تو ہو اس کی فکر — کہ اخبار میں آنے پائے نہ ذکر

بلا میں پھنسے جان مضمون نگار — نکالیں اسے فوج سے کرکے خوار

جو ہوں اتفاقاً کہیں فتحیاب — تو پھر لاف بیجا کریں بے حساب

یہاں سے نظم کا سلسلہ بگڑ گیا ہے غالباً محرر صاحب نے کچھ شعر چھوڑ دیئے ہیں۔

سپاہی ہر اک میں ز روئے شمار — پے جنگ و پے کار ہیں یک ہزار

چلے آتے ہیں ہو کے تیار جنگ — نمایاں ہوئے ہیں پھر آثار جنگ

جو ترکوں کی ہے فوج قلب و یسار — اسی سمت عازم ہیں یہ نابکار

ہزیمت پر ان کو ہزیمت ہوئی — دم جنگ سو بار ذلت ہوئی

ملے[1] خاک و خوں میں یہ پیش بطوم — ندامت اٹھائی سوئے ارض[2] و روم

زدن[3] کی لڑائی میں کھائی شکست — خبر جس کی آئی تھی قبل از اگست

ہٹے قرص کے ہو کے خوار و خراب — پھرے الیٹے[4] سے بصد اضطراب

مگر پھر بھی ہیں مائل شور و شر — پھر آئے ہیں لشکر کشی کو ادھر

نہیں ہے زبس[5] ان کو شرم و قرار — یہ باعث ہے لڑتے جو ہیں بار بار

جو یہ کہتے ہیں روسیان لعیں — کہ ترکوں کو بھی تو شکستیں ہوئیں

ہوا کیوں نہ فسخ ان کا عزم جدال[6] — رہے کیوں وہ مصروف جنگ و جدال

جواب اس کا دیتے ہیں انصاف دوست — کہ اے روس بیہودہ بے مغز و پوست

شب تار میں کرکے دریا عبور — لیا سسٹوا[7] تو نے اے بے شعور

جو سامان سازش کا بہم کیا — مطیعان سلطاں کو برہم کیا

دیئے منٹونگرو[8] کو تو نے وہ دم — کہ باغی ہوئے سب کے سب یک قلم

ادھر اور صوبوں میں ڈالا فساد — ہوئے کینہ جو مردم بد نہاد

---

[1] مقام کا نام ہے۔ [2] مقام کا نام ہے۔ [3] ایک مقام کا نام ہے۔ [4] ایک مقام ہے۔ دیکھئے الیٹے اور پھرے میں کیسی اچھی مناسبت ہے۔ [5] بالکل۔ ذرا بھی۔ [6] دونوں مصرعوں میں جدال جدال غلط ہے۔ غالباً "خطائے نظر" ہے یا سہو کاتب ہے۔ دوسرے خیال میں دوسرے مصرعہ میں قتال کا لفظ اصل مسودہ میں رہا ہوگا۔ [7] ایک مقام ہے۔ [8] ایک مقام ہے۔

مچا ہر طرف روم[1] میں شور و شر — ہوئی فوج ترکوں کی مصروف ادھر
کوئی فوج تجھ سے مقابل نہ تھی — جو کچھ تھی بھی ساماں[2] میں کافی نہ تھی
لطور حفاظت جو تھے جا بجا — تن چند ترکان جنگ آزما
بہ حکم ضرورت[3] رہے وہ خموش — تکبر نے بس کھو دیئے تیرے ہوش
نکوپولس[4] واسگرڈٹر[5] نوا — یہ سب کچھ ترے قبضہ میں آگیا
بڑھا گو وہ بلکن تلک بے حواس — ہوا بے خطر قابض شبکا[6] پاس
کیا اس کی صغرا میں تو نے مقام — کیا اس کی صغرا میں بھی ازدحام
کیا قتل باشندگاں بے گناہ — جو تھے اہل لشکر نہ اہل سپاہ
دغا سے یہ سب کرلیا بند و بست — اسی کو تو سمجھا ہے دنیا شکست
یہ نزد سپہدار عالی خیال — پسندیدہ کب ہے یہ طرز جدال
ذرا غور کر شرم کا ہے مقام — کہ باوصف این شوکت و اہتمام
جھپٹ کر جو آپہونچے ترک دلیر — کیا حملۂ سخت مانند شیر
تو گھبرا کے بھاگی تری سب سپاہ — روانہ ہوئی بس جدھر پائی راہ
ترا حال جب یہ ہے اے بدخصال — شکستیں تو ترکوں کو دے کیا مجال
کجا[7] خرس کوہی کجا دشت شیر — دکھنا ہے تجھکو انھیں سیر و گشت
شکستیں وہ ہیں جو سلیماں نے دیں — کہ جی چھوڑ کر بھاگے اعدائے دیں
مقام پلونا پہ کرلے خیال — ہزیمت اسے کہتے ہیں اے شغال
اگر اس سے کرلے تو قطع نظر — تو حق پر ہیں ترکان سینہ سپر
یہ حملے ہیں تیکر زراہ حسد — تو رکھتا ہے سلطان ترکی سے کد
تجھے خواہش وسعت روس ہے — انھیں کوشش حفظ ناموس[8] ہے
تو لایا پئے ملک گیری سپاہ — ادھر حفظ ترکی فقط[9] رزم خواہ

[1] ایک مقام ہے۔ [2] سامان جنگ سے مطلب ہے۔ [3] مصلحتاً وقت کے لحاظ سے۔ [4] مقام کا نام ہے۔ [5] مقام کا نام ہے۔ [6] مقام کا نام ہے۔ [7] اس جگہ سے روس اور ترک کا موازنہ ہے اور نہایت دلچسپ اور جامع ہے۔ [8] اپنی عزت اور آبرو کا۔ بچاو مجاہدین مسلمین کبھی سبقت نہیں کرتے۔ [9] لڑائی پر آمادہ کرنے والی۔

تو رہزن ہے ترکی کا وہ پاسباں ۔۔۔ عسس[1] وہ ہیں تو دزد تیرہ رواں
بڑھایا ہے تو نے طمع سے قدم ۔۔۔ وہ ہیں مالک ملک روم و عجم
بفضل خداوند گیتی پناہ ۔۔۔ فروزندۂ شمع خورشید و ماہ
بروح رسول[2] بشیر و نذیر ۔۔۔ بتائید تیغ جناب امیر[3]
بہ سعی دلیران رستم خصال ۔۔۔ بہ تدبیر ترکان عالی خیال
بہ آہ اسیران مظلوم جنگ ۔۔۔ بہ تیغ و بہ خنجر بہ توپ و خدنگ
کرے گا فلک تجھ کو زیر زمیں ۔۔۔ تبہ ہوئے گی بر سر فوج کیں
وہ ٹرکی وزیر اقالیم غیر ۔۔۔ خرد جن کی کرتی ہے عالم کی سیر
یہ باضابطہ[4] ان کا ارشاد ہے ۔۔۔ وہ ارشاد صحت کا بنیاد ہے
کہ ان روزوں مدحت[5] کے نسبت خبر ۔۔۔ جو شائع ہے وہ ہے غلط سر بسر
وہ ہرگز نہیں قاصد شاہ روم ۔۔۔ یہ اخبار والوں کی بیجا ہے دھوم
جو ہے حفظ دارالخلافت ضرور ۔۔۔ یہ دیتے ہیں حکم افسر ذی شعور
کہ از لشکر زائد رومیاں ۔۔۔ ہے شاہی گارد کی اک فوج یاں
یہ فرماتے ہیں لارڈ سالسبری ۔۔۔ کہ انگلینڈ اس جنگ سے ہے بری
نہیں سر اٹھانے کا ان کو محل ۔۔۔ وہ کیوں عیش میں اپنے ڈالیں خلل

وقائع دہم اگست ۱۸۷۷ء

اُٹھا ہے یہ ترکی میں طوفان جنگ ۔۔۔ کہ ہر سمت ہوتا ہے سامان جنگ
مقولہ ہے یہ اہل تاریخ کا ۔۔۔ کہ عالم میں ہے دَور مریخ[6] کا
شرر ریز ہے مہر گیتی فروز ۔۔۔ بھڑک اٹھے سن شعلۂ امن سوز

---

[1] نگہبان۔ چوکیدار۔ اندھیری راتوں میں چھپ چھپ کر چلنے والا۔ [2] جناب رسولؐ خدا بشارت دینے والے اور ہدایت کرنے والے محمد مصطفیٰؐ۔ [3] جناب علی مرتضیٰؓ فاتح بدر و حنین جن کی ذوالفقار اور جن کی عدیم المثال شجاعت تاریخ اسلام کے زریں کارنامے ہیں۔ [4] اصلی۔ سچی۔ باقاعدہ۔ مستند۔ [5] مدحت پاشا ایک فرضی شخص [6] مریخ ایک سیارہ کا نام ہے جس کا اثر قتل اور خونریزی ہے یہاں سے نجوم و فلکیات کے تلازمے نہایت شاعرانہ انداز سے برتے گئے ہیں۔

عطارد[1] ہے مصروف تدبیر رزم — کیا رقص بسمل کا زہرہ[2] نے عزم

زحل[3] کے نظران کے انجم پہ ہے — دماغ عدو چرخ ہفتم پہ ہے

خریدار جان جہاں مشتری[4] — جسے چرخ ساد س پہ ہے افسری

نہ باقی رہا جسم سے ساز روح — سوئے نسر[5] طائر ہے پرواز روح

نگاہیں کواکب کی ہیں فتنہ زا — مہیا ہیں اسباب رزم و وغا

ملا بحر اسود میں اس کا ثبوت — بنے تار پیڑو باشکال حوت[6]

قمر اس سے کرتا ہے چندے دریغ — مگر وہ بھی بنتا ہے مانند تیغ

رہا اب نہ ہرگز لڑائی میں شک — مسلح ہے قوس و قزح[7] سے فلک

جو منظور ہے قطع نخل حیات — ہیں ارے کے اب کہکشاں[8] میں صفات

زبس سوئے مغرب ہے جنگ و جدل — سنانیں نہیں ہیں دو شاخ حمل[9]

کئے ہیں جو عقرب[10] نے نیش اپنے تیز — ہوئی ہے ہوائے دغا در دخیز

دلوں میں حرارت کا سامان ہے — مگر پشت دشمن پہ سرطان[11] ہے

ولیکن یہ ہے رائے اہل رصد[12] — کہ ہے طالع ترک برج اسد[13]

نظر آیا یہ دیدۂ غور سے — کہ ہے واسطہ روس کو ثور[14] سے

نتیجہ یہ ہے نزد اہل شعور — اسد کو ظفر ثور پر ہے ضرور

---

[1] ایک دوسرا ستارہ۔ [2] ایک ستارہ کا نام ہے۔ [3] ایک دوسرا ستارہ ہے جو ساتویں آسمان پر ہے۔ [4] مشتری ایک ستارہ ہے۔ عربی میں خریدار کو بھی کہتے ہیں۔ [5] نسر طائر اور نسر واقع دو سیارے ہیں ایک بلندی کی طرف جاتا ہے دوسرا پستی کی طرف آتا ہے۔ نسر گدھ کو کہتے ہیں۔ ان ستاروں کی شکل گدھ سے ملتی ہے۔ [6] حوت ایک برج ہے اس کی شکل مچھلی کی ہے اور برباد کن کشتی کی شکل بھی مچھلی کی سی ہوتی ہے۔ [7] دھنک۔ [8] کہکشاں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا ایک سلسلہ یا مجمع النجوم ہے جس کو شاعر اکثر زلف معشوق یا مانگ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اکبر کی تشبیہ نہایت عمدہ ہے۔ واقعی دیکھنے میں ستارے آرے کے دندانے معلوم ہوتے ہیں اور جیسے آرہ لکڑی کو بیچ سے دو کر دیتا ہے ویسا ہی کہکشاں فضائے فلکی کے دو حصے کر دیتی ہے۔ [9] ایک برج کا نام ہے جس کی شکل مینڈھے کی سی ہوتی ہے نکیلی سینگیں ہوتی ہیں۔ [10] بچھو کی شکل کا ایک برج ہے۔ [11] سرطاں کیکڑے کی صورت کا ایک برج ہے۔ [12] نجوم کے ماہر جو پیشین گوئیاں کرتے ہیں۔ [13] شیر کی شکل کا ایک برج ہے۔ اگر کسی کا ستارہ اس میں پڑ جائے تو اسے ہر مہم میں کامیابی ہوتی ہے۔ [14] ثور ایک دوسرا برج ہے اس کو الٹ دیجئے تو روث ہو جائے گا تلفظ اور آواز میں کوئی فرق نہیں۔ س اور ث کی صدا ایک ہی ہے۔

مگر بندھ گیا ہے کچھ ایسا سماں — کہ مدت تلک ہوں گی خونریزیاں

خبر دیتے ہیں یہ وقائع نگار — کہ یونان بھی ہے مائل کارزار

فریب عدو کھا کے پھر غش ہوا — جو ہے سرویہ[1] وہ بھی سرکش ہوا

ہوا آمد روس سے پُر غرور — شریک وغا ہوں گے دونوں ضرور

زہے شان نیرنگی باغ دہر — کہ چشمہ کو آئے سمندر کی لہر

تموج کا قطرہ کو ہو ادعا — بنے ذرہ خورشید ساں خود نما

سر شعلہ اُٹھے باوج قمر — ہو ابر رواں برق کا ہم سفر

کھلیں پر مگس کے بہ طیر عقاب[2] — بنے ہمصفیر عنادل غراب[3]

سنانوں سے لیں نوک کی سوزنیں — سروں سے بلندی کریں گردنیں

کریں دف[4] ہم آوازی طبل[5] جنگ — بڑھے کوس[6] و قرنا[7] سے بھی جل ترنگ[8]

غلاموں کو آقا سے ہو ہمسری — کرے سرویا دعوی سروری

یہ ہیں سرویہ کے خیالات خام — وہ سرونٹ[9] ہے اس کا سروس[10] ہے کام

وہی ہے یہ سرویہ خود پرست — کہ سال گزشتہ میں کھا کر شکست

ہوا تھا بہ عجز و ادب صلح خواہ — بدرگاہ سلطان عالم پناہ

دکھایا ہے پھر روس نے سبز باغ — کہ بدلا ہے پھر اس کا رنگ دماغ

مری عقل ہے اس پہ حیرت سے دنگ — کہ میلن[11] کو پھر کیوں ہے میلان جنگ

یہ آیا ہے کیا اس کے دل میں خیال — کہ ترکوں سے کرتا ہے عزم جدال

وہ یورپ میں سکہ بٹھائے ہوئے — یہ ہیں نقد جاں تک گنوائے ہوئے

ادھر ان سے لرزاں شہنشاہ روس — ادھر تاج اس کا ہے تاج خروس[12]

وہ روم و عجم کا شہ با جلال — یہ اک صوبہ خُرد آشفتہ حال

---

[1] ایک مقام کا نام ہے۔ [2] عقاب کی طرح اڑنے کے لئے جو ناممکن ہے۔ [3] کوا کبھی بلبل کی طرح گا نہیں سکتا۔ [4] [5] [6] [7] [8] مختلف باجوں کے نام ہیں۔ [9] SERVANT نوکر [10] SERVICE نوکری غلامی۔ سرویہ کا ایک حصہ سرو (SERVE) کے معنی غلامی کرنے کے ہیں۔ [11] سرویہ کا بادشاہ۔ [12] مرغ کے سر پر جو گچھا ہوتا ہے وہ تاج خروس کہلاتا ہے۔

وہی حضرت زار میں شیخ نجد | کہ دیدے کے لکچر دلاتے ہیں وجد
یہ تہدید و تحریص و ترغیب زر[1] | بڑھاتے ہیں امید کو تہ مگر
وہ خود بھر رہے ہیں بصد اضطراب | کریں اپنے ساتھ اب اسے بھی خراب
مگر شاہ یوناں باایں عقل و ہوش[2] | رہے کیوں نہ خاموش و پنبہ بگوش
وہ کیوں چھوڑ کر آتے ہیں کارگاہ | بہ شوق تماشائے جنگ و سپاہ
اٹھائینگے ناحق یہاں آکے چوٹ | پٹیں گے عبث خونِ دل کھاکے چوٹ[3]
بگرداب جنگ آکے پھنستے ہیں شاہ | کہیں ہو نہ یونان کا تختہ تباہ
ہے روشن کہ ترک سلیم المزاج | نہ ایذا رساں ہیں نہ خواہان باج
نہ ہمسایہ کے ملک لینے کا شوق | نہ تیغ آزمائی بیجا[4] کا ذوق
بہ آئین دلچسپ و طرز نکو | شب و روز رہتے ہیں یہ نیک خو
بہ صولت بہ ہیبت بہ عز و وقار | حکومت پہ ترکی کے ہیں استوار
محبت سے ملئے جو ان سے بہم | برس پڑتے ہیں مثل ابر کرم
ولیکن عدو ہو جو ہیجا[5] طلب | تو ہوں اس کے خرمن کو برق غضب

× × × × × ×

تری حد فرماں ہے ایسی وسیع | کہ انگلینڈ ہے ایک ادنیٰ مطیع
سفیروں کو ہے تیرے غصہ کا خوف | تری بارگہ کا وہ کرتے ہیں خوف[6]
یہ سب کچھ ہے حاصل تجھے میں گواہ | مگر جنگ ترکاں خدا کی پناہ
۴ یہ زیر فلک ہے وہ قوم دلیر | کہ غصہ سے دیکھیں تو ڈر جائے شیر
اگر کوہ سے ہوں یہ سرگرم جنگ | اڑیں ہوش کی طرح ذرات سنگ
جو دریا پہ یہ تیر باری کریں | رگ موج سے خون جاری کریں

---

[1] سب قانونی الفاظ ہیں [2] کان میں روئی دینا جسمیں کچھ سن نہ سکے اور خاموش رہے۔ اردو میں کان میں تیل ڈالنا استعمال ہوتا ہے [3] محل [4] یہ نہیں کہاکہ تیغ آزمائی کا شوق نہیں ہے صرف نامناسب طور پر تلوار نہیں چلاتے [5] لڑائی ××× یہاں سے پھر سلسلہ نہیں ملتا [6] محرر کی غلطی ہے غالباً طوف صحیح ہے۔ ۴۔ یہاں سے دوسرا موازنہ شروع ہوتا ہے [7] کیسی شاعرانہ تصویر کھینچی ہے۔ فردوسی والے "خوں بہ جیحوں رسید" سے موازنہ کیجیے۔

مقابل جو ہو اُن سے دیو سفید — سر اس کا شکستہ ہو مثل امید[۵۱]

بہادر ہیں منصف ہیں دیندار ہیں — دلاور ہیں مرنے پہ تیار ہیں

جفاکیش[۵۲] خوش خلق یزداں پرست — بہر حال یاد الٰہی میں مست

نہیں کرتے اوروں پہ یہ ظلم و جبر — ترائی[۵۳] میں آسودہ ہیں چوں ہزبر

یہ دیگر ممالک کے طالب نہیں — تجھے ان سے لڑنا مناسب نہیں

تری فوج اگر ان سے لڑ جائے گی — بنی تیری عزت بگڑ جائے گی

یہ سامان ترا ہے سراسر سراب[۵۴] — ترے سارے خیمے ہیں مثل حباب

ہوا بھر گئی ہے اُبھر آئے ہیں — یہ دم بھر کو پیش نظر آئے ہیں

ہٹا دے لب بحر سے اپنی فوج — کہ ساحل سے ٹکرا کے پھرتی ہے موج

ترا خوں لٹائے گی یہ آب جو — گنواتا ہے دریا پہ کیوں آبرو

ذرا اپنی حالت پہ تو غور کر — کہاں تو کہاں ترکی نامور

تو یاں فوج میں خود بحال تباہ — تباہ و پریشاں بصد پیچ و تاب

چھٹا تجھ سے ہے سینٹ پیٹرس برگ[۵۵] — لئے پھرتی ہے تجھ کو پیری میں مرگ

ادھر ہے وہ سلطان عالم پناہ — ثریا[۵۶] جناب و فلک بارگاہ

بکفر و طرب تخت پر جلوہ گر — نثار اس پہ ہوتے ہیں شمس و قمر

وہ ہے زیب ایواں فرماندہی — اسی کو ہے دور قمر میں بھی[۵۷]

وہ ہے زینت مسند داد و دیں — ہے سایہ فگن اس پہ عرش بریں

وزیران ترکی ارسطو خیال — سفیران دانا و شیریں مقال

جوانان ثابت قدم مثل کوہ — یلان زبردست رستم شکوہ

شب و روز خدمت میں حاضر ہیں سب — بحفظ قواعد بہ طرز ادب

---

۵۱ جیسے اُمید ٹوٹ جاتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ اُمید کو اُمید مجسم مان لیجئے تو مزہ اور بڑھ جائے۔ ۵۲ میری رائے میں صحیح لفظ وفا رہا ہوگا۔ محرر کی غلطی ہے۔ ۵۳ شیر نر۔ ۵۴ بالو۔ ناپائیدار۔ غیر مستقل۔ ۵۵ روس کا دارالسلطنت۔ ۵۶ ایک بلند ستارہ۔ ۵۷ بزرگی اور قمی اور مہ میں مناسبت ہے۔

حوادث پہ ہر سمت در بستہ ہے — صف جاں نثاراں کمر بستہ ہے

ادھر تجھ پہ سایہ فگن ہے صلیب — اُدھر رحمت حق ہے ان سے قریب

تو مخدوم ارباب کبر و جفا — وہ ہیں خادم کعبۂ حق نما

تجھے ملک گیری کا ہر بار شوق — انھیں ہے قناعت میں طاعت کا ذوق

تو اے بحر اسود کے کہنہ نہنگ — ترائی میں شیروں سے کرتا ہے جنگ

اجل سے اِدھر ہر طرح حفظ جاں — شہادت کا مشتاق اِدھر ہر جواں

برانڈی اُدھر رہزن عقل و ہوش — دلوں میں ادھر رنگ ایماں کا جوش

ہزار ایڈرس جی بڑھانے کو یاں — شہادت کا کلمہ ادھر بر زباں

ادھر بحر ڈنیوب کے پل پہ ناز — ادھر ان کو ہے بس توکل پہ ناز

ادھر توپ خانوں کا جنجال ہے — جلو میں ادھر فتح و اقبال ہے

شرر ریز ہے یاں جو توپ کرب — تو واں ان کی چتون ہے برق غضب

ادھر پائے رفتار تک مضمحل — ادھر زور بازو سے رستم خجل

ادھر مثل روباہ سو بند و بست — ادھر شیر کی طرح ہے ایک جست

دلوں میں ادھر وقت ہیجا دہل — ادھر کیا مجال آئے چتون پہ بل

جواب اس کا دیتا ہے یہ زار زار — کہ اس کا تو خود ہے مجھے انتشار

نہیں ہے تردد کا کچھ بھی مقام — بافضال عیسیٰ علیہ السّلام

اگر ہوئے گی یونہی پیہم شکست — تو ہے بھاگنے کا بھی سو بند و بست

سلامت رہے اپنی راہ فرار — کہ جس نے بچایا ہمیں بار بار

کہاں ہیں وہ اب جنرلاں نحیف — جو کہتے تھے ٹرکی ہے بالکل ضعیف

کہاں ہیں وہ کمبخت مضموں نگار — جو کہتے تھے ٹرکی ہے بیمار و زار

۱؎ BLACK SEA ۲؎ گھڑیال۔ ۳؎ شراب ولایتی ۴؎ ADDRESS موعظے۔ ۵؎ ایک دریا کا نام ہے۔ ۶؎ دہل - خوف۔ دہل اور دہل (طبل جنگ) میں مناسبت ہے۔ ۷؎ پہلا زار نام ہے روس کے بادشاہ کا دوسرے زار سے مطلب ہے کہ کمزور۔ نحیف۔ پریشان حال ۸؎ یہ فرد سے کوئی معنی پیدا نہیں ہوتے۔ غالباً "ز" کی جگہ "ظ" ہے۔ ۹؎ واہ کیا بہادری ہے۔

بلا میں پھنسایا مجھے بے سبب — نصیبوں میں خفت ہی خفت ہے اب
مگر دل میں آتا ہے اکثر خیال — کہ ہیں کم بہت ترک آشفتہ حال
مرے پاس افواج ہیں بیشمار — کہاں تک لڑیں گے یہ ترکی سوار
سناؤں تمہیں اب رومیلا[۱] کا حال — جہاں ہیں سلیمان نیکو خصال
جو بلکن[۲] میں ہے فوج اعدا مقیم — سلیماں کو ہے ان کی فکر عظیم
عدو پر ہیں وہ حملہ آور مدام — بافواج ترکی سحرگاہ و شام
زبس حملہ ہر وقت و ہر آن ہے — بہت فوج اعدا پریشان ہے
یہ بلگیریا کی سنو اب خبر — شمالی بلکن پہ رکھو نظر

اس کے بعد جتنے شعر کہے گئے ان کا اب تک کچھ پتہ نہیں

---

۱ ایک مقام کا نام ہے۔ ۲ بلکن دو حصوں میں تقسیم ہے جسے اب بلقان کہتے ہیں جنوبی اور شمالی۔ شمالی بلقان میں اضافت زائد ہے مگر مستند شاعر کے لیے جائز ہے۔

دوپہر

دوپہر
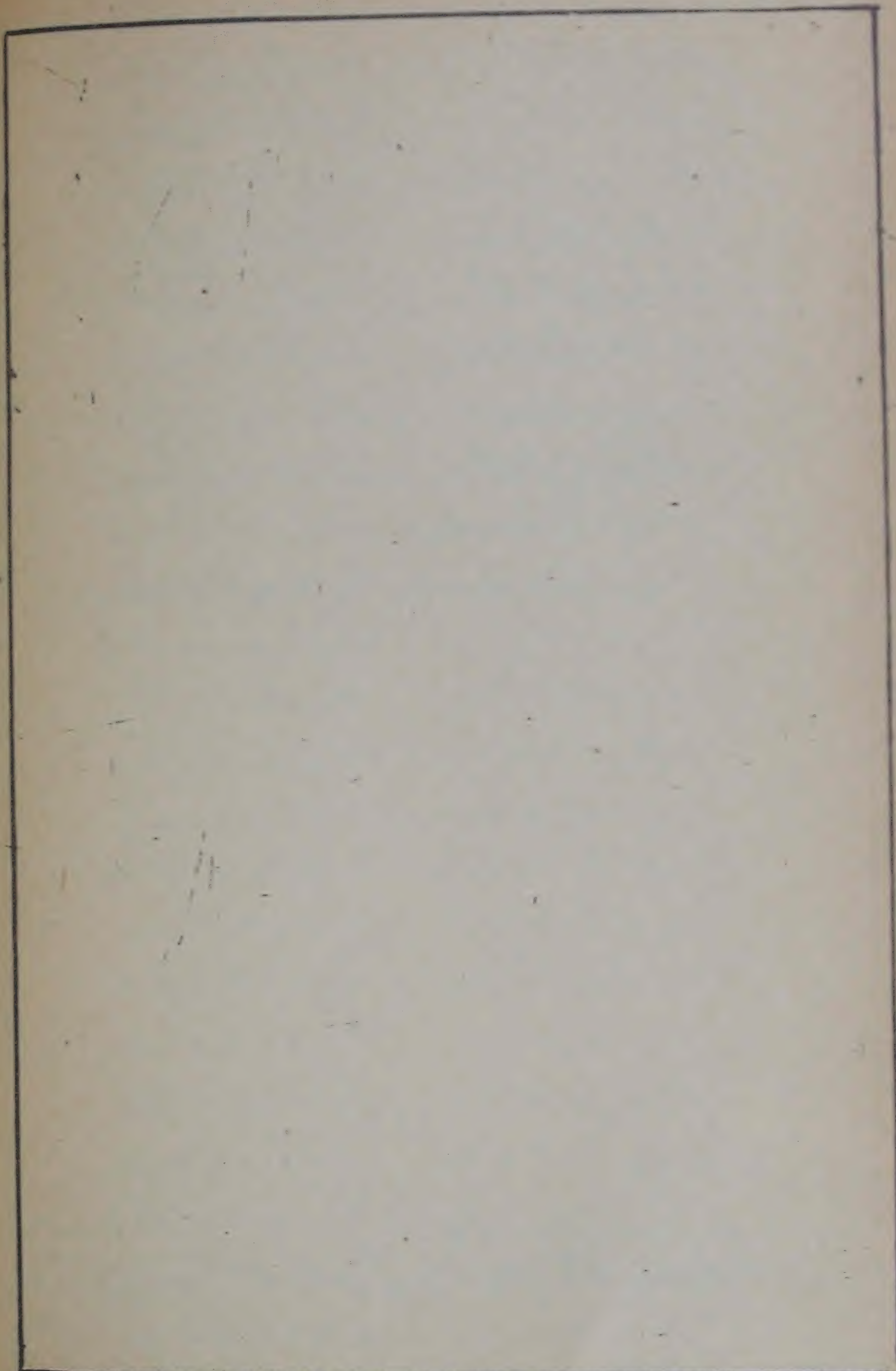
زمانہ زیر تبصرہ ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۳ء تک ہے۔ اس زمانہ کے حالات حیات کوشش بلیغ کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکے۔ بہرطور جیسا عنوان سے ظاہر ہے آفتاب سخن اپنی انتہائی معراج تک پہنچ چکا تھا اور اکبر نہ صرف غزل گو شاعر بلکہ نقاش فطرت لسان العصر اور مصلح ہوتے جاتے تھے۔

غدر کے بعد طبیعتوں کا رنگ بالکل بدل گیا تھا۔ تعلیم، معاشرت، اعتقادات، اخلاق وضع سب کے سب مغرب کی کورانہ تقلید میں ملفوف ہو گئے تھے۔ زبان پر انگریزی کے غیر ضروری الفاظ جن کے لطیف مترادف اُردو میں موجود تھے چڑھے ہوئے تھے۔ بابو شاہی اُردو کے متعلق اکبر کے چند شعر (جو غیر مطبوعہ ہیں اور اکبر حسین صاحب سے ملے ہیں) حاضر ہیں۔

لنڈن سے ہو کے ہنڈ میں جب آنے مانگٹا ۔۔۔ گاڑی میں جورو ڈگ کو بٹھلانے مانگٹا
ہم مانگٹا سیگار ولایت کا سیگرٹ ۔۔۔ اور ہرا لوگ دیسی چیرٹ لانے مانگٹا
مٹ بولو ایسا بات کہ ہم دیسی لوگ ہے ۔۔۔ "صاحب" کا نام ڈل کو بہٹ بھانے مانگٹا
ہم باپ دادا لوگ کو پاگل بنا دیا ۔۔۔ یورپ کا ڈھنگ ہنڈ میں پھیلانے مانگٹا

اکبر نے صاف کہدیا کیا خوب یہ غزل
جو لیڈی لوگ باجے پہ ہے گانے مانگٹا

فیشن کا زور شور تھا۔ قدیم رسوم و خیالات نہ صرف ترک کئے جاتے تھے بلکہ ان کو حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا جا رہا تھا۔ نئی اور پرانی روشنیوں میں سخت تصادم تھا۔ عربی اور فارسی کی تعلیم مفقود ہو رہی تھی۔ پردہ دری اور پردہ داری کے مباحث بڑھتے جاتے تھے۔ سرسید احمد چندہ اور کالج کی تحریکات میں سرگرم تھے۔ اکبر فطرتاً اعتدال پسند تھے وہ نہ تو سرسید کی عظمت اور ان کے وقعت سے چشم پوشی کرتے تھے نہ بیجا حملوں کی عادت تھی وہ روشنضمیر

تھے اور چاہتے تھے مگر انقلابات بتدریج ہوں۔
انھیں علمی، معاشرتی۔ مدنی، سیاسی۔ اخلاقی اور مذہبی میدان اصلاح و دانش کے لئے ملے اور ان کی زندگی کا حقیقی مشن پُورا ہونے لگا۔ ظرافت اور شوخی اور زندہ دلی جو پہلے ذرا دبی زبان اور ملائم لہجہ میں پوشیدہ تھی اب اپنے شباب پر پہنچ گئی۔ وطن پرستی کے جذبات بھی ابھر آئے۔ اکبر CONSERVATIVE متعصب اور قدامت پسند نہ تھے۔ وہ روحانیت کے سامنے مادہ پرستی کی کوئی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔ ان کی تعلیم یہی تھی کہ نئی اور پُرانی روشنی کے ہر شعبہ میں خوبیاں بھی ہیں بُرائیاں بھی۔ دونوں کی خوبیوں سے فائدہ اٹھاؤ یہ نہیں کہ مغرب کی تقلید اندھا دھند کرو اور مشرق کی تمام باتوں کو حرفِ غلط کی طرح لکیر کے فقیر بن کر مٹادو۔ پردہ یا علی گڈھ کی تحریکات یا فیشن کے متعلق لوگوں کو بہت غلط فہمیاں ہیں کہ اکبر نے ان مسئلوں پر منصفانہ انداز سے بحث نہیں کی ہے لیکن کلامِ اکبر کے ہر موضوع پر مجموعی حیثیت سے غائر مطالعہ کیا جائے اور ماحول و فضا کا خیال رکھا جائے تو ان کی اعتدال پسندی اور انصاف پرستی ظاہر ہو جائے گی۔

۱۸۸۰ء میں قائم مقام منصف ہوئے۔
۱۸۸۱ء میں دوئم درجہ کے منصف ہو کر خورجہ گئے۔
وہاں سے سید احمد اور سمیع اللہ صاحب نے کوشش کر کے ان کو علیگڈھ بلایا۔
"لوڈورو" والی نظم وہیں لکھی گئی ہے۔ نثر کی کتابیں بھی وہیں ترجمہ ہوئیں۔
۱۸۸۲ء میں درجہ اول کے منصف ہو گئے اور ۱۸۸۶ء تک رہے۔
۱۸۸۸ء میں سب جج مقرر ہوئے۔ بہت جلد درجہ اول پر ترقی ہوئی۔
۱۸۹۴ء میں مستقل جج عدالت خفیفہ الہ آباد مقرر ہوئے۔ اسی سنہ میں ڈسٹرکٹ سشن ججی کے لئے مقرر ہوئے۔
الہ آباد، جھانسی، مین پوری، بنارس اور سہارنپور میں ججی کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے۔
۱۸۹۸ء میں خان بہادر کا خطاب عطا ہوا اس موقع پر ایک شعر فرمایا تھا

[illegible]

عاشقانہ داد یہ اچھی دی مجھ کو چرخ نے تیغ ابرو کا تھا عاشق خاں بہادر کر دیا

۱۸۹۹ء میں ہائی کورٹ کی ججی پیش کی گئی اور قرار پایا کہ ایکمن صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد وہ مقرر ہوں ؎

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل کس قدر ہیں خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

آنکھوں کی شکایت بڑھ گئی تھی، ریٹائر ہو گئے۔

بحرین

سودی اور اکبر

شان نزول علیگڈھ میں ایک پینی کلب (PENNY CLUB) قائم تھا اسی کے لئے دوپہر کے چار گھنٹوں میں یہ نظم عشرت صاحب کے پڑھنے کے لئے لکھی گئی تھی۔

سدے انگلستان کے قرون وسطیٰ کا ایک باکمال شاعر تھا حضرت اکبر نے ضرورت شعری کے لحاظ سے سہی اس کے نام کے تلفظ میں 'و' کا اضافہ فرماکر، لفظ مذکور کو ادب اُردو سے بہت زیادہ مانوس فرما دیا۔ اس کی مشہور نظم 'لوڈور کا آبشار' اپنے رنگ میں سرتاج مانی گئی ہے۔ میں نے اس نظم کو ۱۹۱۰ء میں دیکھا تھا نظم نہیں ہے ایک قادر مصور کی بہترین تصویر ہے۔ کہاں لوڈور کہاں الہ آباد! لیکن باور فرمایئے نظم مذکور کے چند اشعار پڑھتے ہی مجھے محسوس ہوا کہ میں عین منظر پر موجود ہوں اور آبشار منظوم مادی حیثیت سے میرے سامنے جلوہ ریز ہے! الفاظ کا سحر اور طرز بیان کا جادو پڑھنے والے کے چشم و گوش پر ایسی حالت سکون و سکوت طاری کر دیتا ہے کہ گرد و پیش کی کوئی دوسری صدا مسموع نہیں ہوتی اور صفحۂ قرطاس، مرقع کوہستانی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

مگر یہ نظم ابنائے وطن کے صرف اُسی طبقہ تک سامعہ نواز تھی جو زبان انگریزی سے واقفیت رکھتا ہے۔ اکبر نے اس نظم کا جواب لکھ کر نہ صرف ادب اُردو پر احسان کیا بلکہ تمام حضرات پر بھی جو انگریزی سے نابلد ہیں۔ حضرت اکبر کی نظم اپنے تمام محاسن کے ساتھ پیش کیجاتی ہے۔ میں خود جسقدر متاثر ہوا ہوں اس کا اظہار اجمالی طور پر نثر میں حاضر ہے۔ میری یہ تحریر

نہ تبصرہ ہے نہ مقدمہ۔ نہ تنقید ہے نہ تعریف صرف اپنے جذبات کا ایک خاکہ ہے بہرطور اب نظم شروع ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ وہ سودی سخن گوئے شیریں مقال ‎ ‎ جو انگریزی شاعر تھا اک بے مثال

اس شعر کے بارے میں صرف اتنا ہی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غیر ضروری متعلقات سے پرہیز کرنا اور ہر واقعہ کو پوری قدرت کے ساتھ بلا واسطہ ظاہر کر دینا اکبر کی خصوصیات میں داخل تھا۔ دیکھ لیجئے چند ہی لفظوں میں موصوف نے سودی کو زبان اُردو سے متعارف کر دیا ہے اور لطف یہ کہ کوئی ضروری بات نظر انداز ہونے نہیں پائی۔

۲۔ بہ فرمائش دختر باتمیز ‎ ‎ کہ رکھتا تھا جسکو وہ دل سے عزیز

۳۔ لکھی اس نے ہے نظم اک لاجواب ‎ ‎ دکھائی ہے شکل روانی آب

۴۔ جو بہتا ہے پانی میان لوڈور ‎ ‎ اسی کا دکھایا ہے شاعر نے زور

دوسرے شعر میں نظم کی شان نزول دکھائی گئی ہے اور باوجود کمال اختصار کے نفس مفہوم میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ سودی کے کئی چھوٹی بڑی لڑکیاں تھیں۔ ایک روز یہ سب لڑکیاں اپنے باپ کے پاس باری باری آئیں اور مچل گئیں کہ ہم کو اجازت دیجئے تو ہم آج لوڈور کے آبشار کی سیر ضرور دیکھیں گے شاعر نے اپنے حالات کے لحاظ سے نادان لڑکیوں کو بہلایا اور وعدہ کیا کہ میں تم سب کو لوڈور کے آبشار کی سیر یہیں سے بیٹھے بیٹھے کرا دوں گا۔ معاملہ طے ہو گیا۔ اور یہ معرکتہ الآرا نظم زیب قرطاس کی گئی۔ سودی! میں تجھ کو تیرے وعدہ کی عالمگیر کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ کاش تو آج زندہ ہوتا اور دیکھتا کہ اس معمورۂ عالم کے ہر گوشہ خاموش سے فطرت پرست آنکھیں تیری رشک آئینہ نظم کی مدد سے لوڈور کے آبشار کی سیر کر سکتی ہیں۔ "دکھائی ہے شکل روانی آب"۔ اس مصرعہ کے سارے مضمون کا لب لباب بتلایا گیا ہے یعنی روانی آب، چوتھے شعر میں تعین مقام کر دیا گیا ہے۔

۵۔ مناسب جو انگلش مصادر ملے ‎ ‎ مقفٰی کئے ان سے سب سلسلے

۶۔ یہ جمعیت افعال کی خوب کی ‎ ‎ کہ درسی بھی ہے اور دلچسپ بھی

پانچویں شعر میں بات کی بات کہدی اور مصادر کی مناسبت سے مقفٰی کرنے کی سہولت

بھی واضح ہو گئی۔ یہ ہے اعجاز کلام کہ نکتہ شناش نگاہوں کے لئے الفاظ کے سادہ پردوں سے ہزاروں انوار ساطع ہوئے جاتے ہیں۔ جمعیت الفاظ کی ترکیب حسن بیان کی شاہد ہے۔ واقعی سودی سے انگریزی کے قریب الصوت افعال اس طور پر جمع کئے ہیں کہ اُن کا مطالعہ علم طلب حضرات کے لئے گنجینۂ درسیات ہے اور برابر کی آوازوں کا لطیف زیر و بم فطرت پرستوں کے واسطے دلربا ہے۔

۷۔ یہ اصرار کرتے ہیں بھائی حسن کہ میں بھی ہوں اس بحر میں غوطہ زن
۸۔ دکھاؤں روانی دریائے فکر کہ گوہر شناشوں میں ہو جس کا ذکر

بھائی حسن سے چھوٹے بھائی اکبر حسن مراد ہیں، طرز بیان کی شستگی اور نشست الفاظ کی سادگی جس قدر اثر رکھتی ہے اس کا اندازہ شعر پڑھ کر فرمالیجئے۔ بول چال اور روزمرہ اس قدر عام ہے کہ اگر آپ اس شعر کو جامۂ نثر پہنانا چاہیں تو بھی حالت موجودہ سے زیادہ صفائی نہیں پیدا ہو سکتی لوازم منظر کے لئے رعایت کے تمام الفاظ بحر، غوطہ زن، روانی، دریا، گوہر شناس سب موجود ہیں۔ لیکن زور کلام اور صفائی بیان کی یہ حالت ہے کہ آورد کہیں سے معلوم ہی نہیں ہوتی۔

۹۔ عجب ہے نہیں ان کی اسی پر نظر کجا میں کجا سودی نامور

اظہار خاکساری کا پہلو کس قدر لطیف ہے کہ خود اور سودی میں امتیاز کرتے وقت اُن کو بھائی حسن پر تعجب ہوتا ہے ان دو لفظوں (عجب ہے) میں خدا جانے کتنے نکات پوشیدہ ہیں۔ بھائی حسن کا جذبہ خلوص مضمر ہے اور شان فیصلہ بھی مستتر ہے۔

۱۰۔ سوا اس کے ہیں اور بھی مشکلیں نہیں سہل اس راہ کی منزلیں

اکبر نے محسوسات وجذبات انسانی کا وہ مکمل مطالعہ کیا تھا کہ خدا کی پناہ، وہ جانتا تھا کہ ظاہر پرست نگاہیں اس خفیف سے فرق کو جو مجھ میں اور سودی میں ہے نہ جانے کہاں تک سمجھیں اور میرے اظہار خاکساری کو عجز وقصور سے تعبیر کریں اسی لئے دوسرے شعر میں اور مشکلات کا ذکر کر دیا اکبر کو معلوم تھا کہ فطرت انسانیہ درک مفہوم میں کس قدر مختلف ہے دوسرے مصرعہ میں ہندستان کے مغرب پرست طبقہ کو متنبہ کیا ہے کہ "یک من نقل را دہ من عقل باید" انگریزی نظموں کی تاتتی میں غیر مانوس تراکیب کا استعمال سہل، غیر مروج بحور کا اختیار آسان،

لیکن فطری شاعری کے منازل کو ذمہ دار شاعر کی حیثیت سے طے کرنا مشکل اور بہت مشکل ہے۔ منازل کی چند مشکلات بالترتیب ملاحظہ فرمایئے۔

۱۱ - مرے پاس سرمایہ کافی نہیں — وہ مصدر نہیں وہ قوافی نہیں

۱۲ - زباں میں نہ وسعت نہ ویسا مذاق — ادھر تو ہے کچھ اور ہی طمطراق

گیارھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں اُردو کی کم مائگی پر اظہار حسرت ہے۔ دوسرے مصرعہ میں مصدر کا لفظ صحیح مطالعہ زبان انگریزی کی تصویر ہے۔ انگریزی مصادر اُردو کی نسبتاً اتنے زیادہ ہیں کہ اُن کے یکجا کرنے میں شاعر کو نہایت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ اس کے مصادر کو قوافی بنانے میں کسی نئے لفظ کے اضافہ کی ضرورت نہیں ہوتی صرف چند حروف کے وصل سے قافیہ بھی چست ہو جاتا ہے اور مفہوم بھی۔ سو دی کی ساری نظم میں خاص بات یہی ہے کہ قریب الصوت مصادر کی جمعیت نے لطف قافیہ اور لذّت ترنّم پیدا کر دیا ہے بارھویں شعر کے پہلے مصرعہ میں بھی کمی وسعت اور اختلاف مذاق دو چیزوں کا ذکر ہے۔ کمی وسعت کی شکایت کس قدر عبرت خیز ہے۔ کاش ادب اُردو کے حامی اس طرف توجہ فرمائیں۔ زبان انگریزی کو جو وسعت آج نصیب ہے اُس کا معتدبہ حصّہ صرف اُن تراجم کا شرمندۂ احسان ہے جو غیر زبانوں سے کئے گئے ہیں۔ ترجمہ کے خاص فوائد یہ ہیں کہ اپنے وطن میں مختلف علوم و فنون کا اجرا ہوتا ہے اور جدید محاورہ جات والفاظ، مصطلحات وتراکیب کا دلکش اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ کمی وسعت کے ساتھ ہی ساتھ اختلاف مذاق کا ذکر بھی کم سبق آموز نہیں ہے۔ مترجم حضرات کو یہ بات کبھی نظر انداز نہ کرنی چاہیئے کہ غیر زبان کو اس عمدگی و خوبصورتی سے متعارف کریں کہ اپنی زبان سمجھنے والوں کو درک مفہوم میں دقت نہ ہونے پائے اس لئے کہ ترجمہ کی یہ اہم مگر عام کمزوری ارتقاء زبان کے لئے نہایت مہلک ہے۔ دوسرے مصرعہ میں طمطراق کا لفظ اس عمدگی سے نظم ہوا ہے کہ اکبر کی فطری ظرافت برسی پڑتی ہے۔

۱۳ - اگر ترجمہ ہو تو مطلب ہو خبط — روانی میں پیدا نہ ہو ربط ضبط

اس شعر میں ترجمہ کی سب سے بڑی مشکل ظاہر کی گئی ہے۔ میرا عقیدہ ہے کہ صحیح ترجمہ کسی ایک زبان سے کسی دوسری زبان میں محال عقلی ہے۔ بیں نے مرحوم سے بھی یہ بات ظاہر کی تھی

اور اُن کو بھی میری اس رائے سے اتفاق تھا۔ بات یہ ہے کہ ہر زبان کے لفظ و محاورے ظاہری معنوں کے علاوہ کچھ ایسے خاص معانی و مفاہیم کے حامل ہوتے ہیں جن کا انتقال کسی دوسری زبان کے ایک ہی لفظ یا محاورے میں نہیں ہو سکتا اب اگر اس دقت کو رفع کرنے کے لئے ہر لفظ یا ہر محاورہ کی تشریح میں ایک ایک جملہ لکھا جائے تو ترجمہ کا نفس غلط ہوتا ہے۔ معانی میں ربط ضبط پیدا کرنا معمولی کام نہیں ہے۔ مترجم کا دماغ خود لذّت ترجمہ سے اس قدر متاثر رہتا ہے کہ بہ نفس خود محک معانی نہیں بن سکتا۔ مترجم دونوں زبانوں سے واقف ہوتا ہے، لہٰذا معانی کی خفیف دقتیں اُس کی نگاہوں میں بہت سبک رہتی ہیں مگر صرف ایک ہی زبان کا جاننے والا پڑھتا ہے تو یہی خفیف سی دقتیں سارا مطلب خبط کر دیتی ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ مترجم جو اس نکتہ کو پوری طرح سمجھتے ہیں اور اس قسم کی کمی سے پرہیز فرماتے ہیں۔

۱۴۔ موانع یہ ہیں جن سے ڈرتا ہوں میں — مگر خیر کچھ فکر کرتا ہوں میں

موانع کا لفظ کس قدر جامع ہے۔ اکبر کو انتخاب الفاظ پر وہ قابو تھا جس کی نظیر کہیں اور مشکل سے ملتی ہے۔ موانع میں ذکر اشکال تو ضرور ہے لیکن ہمت نصیب حضرات کے لئے دعوت عمل کا سرمایہ بھی موجود ہے۔ دوسرا مصرعہ حسن آمد کے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور ایسا مکمل محاورہ ہے جو اگر آج نہیں تو کسی دن عام طور پر زبان زد ہو جائے گا۔

۱۵۔ جو تھیں دقتیں کہہ چکا بر ملا — غرض دیکھئے اب وہ پانی چلا

دوسرا مصرعہ کس قدر سجا ہوا ہے۔ غرض کی لفظ سے اختصار صحیح کا کام لیا گیا ہے۔ 'دیکھئے' شوق افزا بھی ہے اور ایسا اشارہ موثر ہے کہ ناظرین کا دماغ واقعی محسوس کرنے لگتا ہے کہ مشارٌالیہ منظر یعنی آبشار سامنے ہے اور پانی کی رفتار شروع ہو گئی ہے۔ ایشائی شاعری میں "گریز" نہایت اہم چیز ہے۔ تشبیب اور تمہید کے بعد اس طرح گریز کرنا چاہئے کہ تسلسل قائم رہے اور دماغ مخاطب اس جدید عرصۂ مفہوم کی طرف سے بآسانی منتقل ہو جائے۔ گریز کی ایسی شاندار مثال میری نگاہوں میں نہیں ہے۔

۱۶۔ اچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا

وہ خوش نصیب حضرات جنھوں نے آبشاروں کی سیر اُس کے مخزن سے فرمائی ہے

اس شعر کا لطف اُن کے لذّت کش دل سے پوچھئے۔ روانی کی سب سے پہلی کیفیت کے لئے یہ چاروں جامع مصادر چار دفاتر ہیں جن کی لذّت و فرحت ہر شخص بقدر وسعت و ادراک حاصل کر سکتا ہے۔

۱۷۔ یہ بنتا ہوا اور وہ تنتا ہوا ٹپکتا ہوا اور چھنتا ہوا

"یہ" اور "وہ" سے میرے خیال میں 'یہاں' اور 'وہاں' مراد ہے۔ یہ شعر پہلی منزل کا دوسرا قدم ہے، واقعی شانِ تسلسل اِس عنوان سے قائم رکھنا اگر فضلِ خداوندی نہیں تو کیا ہے؟ اسمئے الفاظ جمع ہیں لیکن ہر لفظ ایک نئے مفہوم کا حامل ہے اور ہر ترکیب ترتیب فطری کا بہترین نمونہ۔

۱۸۔ روانی میں اک شور کرتا ہوا رُکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا

پہلے مصرعہ کو شاعر کے نقطۂ نگاہ سے دیکھئے۔ ہاں ایک بات یاد آگئی میں نے مرحوم سے پوچھا تھا کہ اکثر حضرات آپ کی اس نظم کو سودی کی نظم کا ترجمہ یا اقتباس سمجھتے ہیں جس پر انھوں نے برہم ہو کر فرمایا تھا کہ "میری نظم میں لوڈور کے آبشار کی چھاؤں تک موجود نہیں"۔ روانی کا شور، پہاڑ کی سنسان گھاٹیوں میں گم کردہ راہ مسافروں کے لئے صدائے ہدایت اور فطرت پرست حضرات کے واسطے ربابِ دلکش ہے۔ دوسرے مصرعہ میں سائنس کا ایک خاص نکتہ ملفوف ہے۔ بہتے ہوئے پانی کی رکاوٹ اُس کے بھیل کر بڑھنے کی وجہ ہوتی ہے اسی لئے ہر بار کی رکاوٹ زورِ روانی میں اضافہ کرتی رہتی ہے اور اپنی لہروں میں قوتِ برقیہ کو تدریجی ترقی دیتی رہتی ہے جو حاصل کر لئے جانے کے بعد صدہا انسانی ضروریات کو رفع کرتی ہے۔

۱۹۔ پہاڑوں کے روزنِ زمیں کے مسام یہ ہے کر رہا ہر طرف اپنا کام

پہلی منزل کا تیسرا قدم ہے۔ زمیں سے مراد غالباً چٹانوں کا فرش ہے اس لئے کہ ابھی تک منزل کو ہی ختم نہیں ہوئی ہے۔

۲۰۔ اِدھر پھولتا اور پچکتا اُدھر رُخ اُس سمت کرتا کھسکتا اِدھر

اس پھولنے اور پچکنے کے لطف سے بھی چشمِ ناظر ہی خوب لذّت اندوز ہو سکتی ہے

اتنی لطیف کیفیتیں ایسی روانی کے ساتھ بہت کم شاعر نظم کر سکتے ہیں۔

۲۰۔ پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا

بیتاب موجوں کا سر پٹکنا کس قدر صحیح کیفیت ہے۔ دامن جھٹکنے کا محاورہ دوسری منزل کی آغاز کا مقدمہ ہے۔ اللہ اللہ تفصیل و تشریح کی یہ قدرت کہ شاعر نے خفیف سی صراحت کو بھی حوالہ قلم کر دیا۔ یہ وہ وقت ہے جو بہتا ہوا پانی بلند چٹانوں سے پست چٹانوں تک پہنچنے میں صرف کرتا ہے اور پانی کا جھٹکا ہوا دامن ایسی عروس کی آنچل سے مشابہ ہوتا ہے جو اپنا موتیوں بھرا دوپٹہ جھٹک کر سنبھال لے۔

۲۱۔ وہ پہلوئے ساحل دباتا ہوا وہ سبزہ پہ چادر بچھاتا ہوا

اکبر کو جہاں غیر ضروری تفصیل سے اجتناب تھا وہاں تکرار سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی، لیجئے تیسری منزل شروع ہو گئی، گرتے ہوئے پانی نے نہر کی شکل اختیار کر لی اور ساحل کا پہلو دبانا شروع کر دیا ہے۔ محاورہ جس حسن کے ساتھ نظم ہوا ہے وہ ظاہر ہے۔ دوسرے مصرعہ میں سبزہ پر چادر بچھانا سطح سبزہ و بسط آب دونوں کی صحیح تشبیہیں موجود ہیں اب ذرا اُس کیفیت پنہاں کا بھی لطف اُٹھائیے جو اتصال آب رواں و فرش سبزہ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ اس ملی جلی ہوئی دیوی کو عمداً پردہ ہائے الفاظ میں اس طور پر چھپا دیا جیسے کوئی فتنہ محشر چوتھی کی ردائے سیمیں کی گھونگھٹ میں جلوہ فروش ہو، صاف صاف اس لئے نہیں بتایا کہ راز کی بات تھی اور خود سے محسوس کرنے میں جو لذت ہے وہ صاف بتا دینے میں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ مصرعہ کیا ہے ہلکے رنگوں کی ایک بیش بہا تصویر ہے۔ جس قدر غور سے دیکھئے اتنے ہی نکات ظاہر ہوتے جاتے ہیں یہی وہ خاص باتیں ہیں جو ایک کامل شاعر فرض ناظر سمجھ کر بالقصد چھپا دیتا ہے اور جو درک ہونے کے بعد ناظر کے لئے سرمایہ روح و نازش لذت بن جایا کرتی ہیں۔

۲۲۔ بھٹکتا ہوا غل مچاتا ہوا وہ جل تھل کا عالم رچاتا ہوا

اس شعر میں گم کردہ راہ مسافر کے جذبات فطری کا صحیح مرقع کھینچا گیا ہے۔ تشبیہ اتنی لاجواب ہے کہ دوسرے لفظوں میں کہیئے تو دانتوں پسینہ آجائے۔ بھٹکنے کا عالم صاف ظاہر ہے

سی ایسی نہر کو جو ابھی پہاڑیوں کی پیچ در پیچ منزلیں طے کر کے آئی ہو کیا معلوم کہ اس کی
نزل مقصود کہاں ہے اور کیا پتہ کہ زمین کا غیر معین نشیب یا فراز اس کو کن کن راستوں پر
بھٹکاتا پھرے گا۔ بھٹکنے کے بعد غل مچانا ایک فطری بات ہے اور اثر شور سے آنسوؤں کا
جاری ہو جانا بھی اسی قدر فطری ہے۔ نہر کا غل مچانا حسن شاعری یا لطیف تخئیل نہیں ہے
بلکہ واقعاً زور رفتار سے ایک خاص درد انگیز صدا پیدا ہو جاتی ہے۔ کاش سرستان پیمانۂ تخئیل
اس نکتہ کو سمجھ لیں کہ ایسے مست خرام دریاؤں میں جو زرخیز میدانوں میں بہتے ہیں' لہروں کا
پیہم مگر خفیف تموج کوئی ترنم نہیں پیدا کر سکتا۔

۲۴۔ وہ گاتا ہوا اور بجاتا ہوا　　　وہ لہروں کو پیہم نچاتا ہوا

اکبر اگر شاعر نہ ہوتا تو یہ شعر کبھی نہ لکھ سکتا۔ اثنائے سخن میں یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے
کہ میں نے جہاں حضرت اکبر کی ذات کو مخاطب کیا ہے وہاں جمع کا صیغہ لایا ہوں جہاں بحیثیت
شاعر کے تخاطب وہاں صیغہ واحد ہے۔ مگر تکریمی و تعظیمی۔ گانا، بجانا کا اجتماع کس قدر مسرت
افزا ہے۔ اکبر نے پانی کی تمام ممکن کیفیتیں دکھائی ہیں لہذا ایک کیفیت کو دوسرے کا متضاد
سمجھنا خلاف دانش ہے۔ ان میں جو اختلاف ہے وہ ضد کا نہیں ہے بلکہ اختلاف تمیزی و
اختیاری ہے جس کا شعور و ادراک مختلف جذبات ناظرین کا ترجمان صحیح ہے۔

۲۵۔ ادھر جھومتا اور مٹکتا ہوا　　　اُدھر گھومتا اور اٹکتا ہوا

اس سے پہلے شعر میں موسیقی پرست کی کیفیت دکھائی گئی تھی۔ اس شعر میں بدمستی رندانہ
کا مرقع کھینچا گیا ہے۔ مٹکنا کیسا کریہہ لفظ تھا مگر نشست مخصوص نے خاص لطف پیدا
کر دیا ہے۔

۲۶۔ بپھرتا ہوا جوش کھاتا ہوا　　　بگڑ کر وہ کف منہ پہ لاتا ہوا

بیتاب مسافر کو نہ حالت بادیہ پیمائی میں سکون حاصل ہوتا ہے نہ بزم موسیقی میں جی بہلتا
ہے نہ شغل رندانہ سے جمعیت خاطر حاصل ہوتی ہے تو ان مشاغل کے بعد غصہ کا آنا یقینی ہے
اس شعر میں غضبناک کی تشبیہہ بدرجۂ کمال موجود ہے اور ایک کا کیا ذکر تین تین وجہ شبہ موجود ہیں
پھر لطف یہ کہ جھاگ کی کیفیت کا اس عمدگی سے اظہار کرنا سحر ہے سحر۔ سائنس والے بھی اِس

شعر سے کافی محظوظ ہو سکتے ہیں اس لئے کہ جو گرمی اجزا کے ٹکرانے سے پیدا ہوتی ہے وہی کف لانے کا باعث ہے۔

۲۷ - وہ اونچے سُروں میں تموج کا راگ ، وہ خود جوش میں آکے لانا یہ جھاگ

کف آجانے کے بعد حالت غضب میں ایک وقتی سکون پیدا ہو جاتا ہے جو نادان پانی کو بار دیگر مسرور و مخمور بنا دیتا ہے۔ دیکھئے جھاگ لانے کی وہی کیفیت کتنی خوبصورتی کے ساتھ دو مختلف مگر برابر کے حسین پہلوؤں سے ظاہر کی گئی ہے۔

۲۸ - سدھرتا ہوا اور سنورتا ہوا ، تھرکتا ہوا رقص کرتا ہوا

سُدھرنے کے لفظ سے سنبھالنے کی خاص کیفیت نمایاں ہے۔ کھنچنے کی حالت سنورنے سے ظاہر ہے۔ اب زور دار پانی مسرت و خمار کے درجہ سے ہوتا ہوا محویت و بے خودی کے جذبات سے ہمدوش و ہمکنار ہے۔ یہی کیفیت بعینہٖ اُس شخص کی ہوتی ہے جس کو عملی مسرت تدریجی حیثیت سے بدمستی تک پہنچاوے۔

۲۹ - ادھر گونجتا گنگناتا ہوا ، ادھر خود بخود بھنبھناتا ہوا

یہ شعر ترنم آبی کی تین ممیز کیفیتوں کا گلدستہ ہے۔ تقسیم اصوات اس خوبصورتی سے کی گئی ہے کہ شاہد مکمل کا پتہ بآسانی چل جاتا ہے۔ انگریزی میں اس ترنم آرائی کے لئے جو عموماً مدھم سروں میں ہوا کرتی ہے ایک خاص لفظ مرمرنگ ہے جس کا صحیح مفہوم اس خاص مقام پر بھنبھنانے کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے خود بخود کی ترکیب نے اور چار چاند لگا دیئے ہیں۔

۳۰ - لپٹتا ہوا اور چمٹتا ہوا ، یہ پھٹتا ہوا اور سمٹتا ہوا

۳۱ - سماتا ہوا اور پلٹتا ہوا ، سرکتا ہوا اور ملتا ہوا

۳۲ - یہ گھٹتا ہوا اور وہ بڑھتا ہوا ، اُترتا ہوا اور چڑھتا ہوا

۳۳ - یہ ہٹتا ہوا اور وہ بچتا ہوا ، دباتا ہوا اور نچتا ہوا

زور رفتار کے لئے یہ چار شعر خاص ہیں جن میں بلا تکلف آٹھ مختلف کیفیات کا اظہار کیا گیا ہے۔ ہر مصرعہ بہ نفس خود اس قدر مکمل ہے کہ جس دوسرے مصرعہ سے وصل فرما دیجیے قند مکرر کا لطف آجائے۔ مگر شان تسلسل کے لحاظ سے کیفیات مختلفہ کی اچھوتی ترتیب خاص

حیثیت رکھتی ہے اور ہر شعر کا مفہوم اس قدر دست و گریبان ہے کہ جدا کرنے میں ایک لطیف کمی سی محسوس ہوتی ہے۔

۳۴۔ پھسلتا ہوا ڈگمگاتا ہوا لچکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا

اب پانی ایسی زمین سے گزر رہا ہے جہاں کی سطح ناہموار ہے اور کنکریوں کا منتشر خزانہ روانی میں رکاوٹیں پیدا کر رہا ہے۔ بیخود اور بدست مسافر کے خمار کا وقت ہے اور بالکل وہی کیفیت ہے جو ایک مخمور شرابی کی ہوتی ہے۔ پانی کی سبک مگر پیچیدہ حرکتوں کے لئے لچکتا ہوا کہنا بے مثل رعایت ہے۔

۳۵۔ وہ روئے زمیں کو چھپاتا ہوا وہ خاکی کو سیمیں بناتا ہوا

حقیقت نگاری اور لطف سخن کے ساتھ زور بیان ملاحظہ فرمایئے کہ سطح خاکی پر پانی کی روپہلی چادر اس طرح بڑھتی جا رہی ہے گویا روئے زمین کو ستاروں سے چھپایا جا رہا ہے۔ کیا یہ شعر جان مشاہدہ اور حاصل نظارہ نہیں ہے۔

۳۶۔ گل و خار یکساں سمجھتا ہوا ہر ایک سے برابر الجھتا ہوا

اب خمار کی حالت بھی گزر چکی ہے۔ دھن ہے تو سفر کی، آرزو ہے تو منزل نامعلوم تک پہنچ جانے کی۔ "الجھتا ہوا" سے وہ خاص مگر نازک حالت مراد ہے جو بہتے ہوئے پانی میں گل و خار کی رکاوٹ سے پیدا ہو جاتی ہے۔ الجھتا ہوا صرف رعایت سے نہیں لایا گیا بلکہ خاص اثر کا حامل ہے۔ سائنس اور فلسفہ والے خوب جانتے ہیں کہ دو چیزیں ایک وقت میں ایک ہی فاصلہ نہیں گھیر سکتیں لہذا گل و خار کی موجودگی سے پانی کے اجزائے سیال کو بقدر کمی ہٹ کر جانا پڑتا ہے اس نکتہ کے علاوہ محاورہ کی چستی بھی قابل داد ہے۔

۳۷۔ بہاتا ہوا اور بہتا ہوا ہوا کے تپاچوں کو سہتا ہوا

۳۸۔ لرزتا ہوا تلملاتا ہوا بلکتا ہوا بلبلاتا ہوا

پہلے شعر کے مصرعہ اوّل کا لفظ اولیں زور رفتار کو ظاہر کر رہا ہے کہ جو کچھ سد راہ ہوا سیل آب اس کو اپنے ساتھ لے چلا۔ دوسرے مصرعہ میں اس انتشار کی کیفیت ہے جو مختلف السمت ہواؤں کی کشمکش سے پانی میں پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا شعر جوش ناراضگی کی تصویر ہے اور مسافر کا وہ

عجیب وقت بتا رہا ہے جبکہ تمازت آفتاب کا عین شباب ہے آفتاب نصف النہار میں آتش فروش ہے اور سیدھی پڑنے والی گرم کرنیں غریب الوطن راہرو کو کھولائے دے رہی ہیں۔

۳۹ - بلندی سے گرتا گراتا ہوا نشیبوں میں پھرتا پھراتا ہوا

۴۰ - اچکتا ہوا اور اڑتا ہوا اٹکتا ہوا اور مڑتا ہوا

پہلے شعر میں ذو قافیتین کا لطف بھی ہے اور زبان کی سلاست بھی ہے اس کے علاوہ ان مختلف بیش بہا مادیت کا ذکر بھی ہے جو زوردار پانی پہاڑیوں کی ناقابل رسائی فطری خزانوں سے اپنے ساتھ لے کر میدانوں میں آتا ہے اور اثنائے رفتار میں نہر کی تہ پر جمع کرتا جاتا ہے جن میں وہ نظر فریب جواہرات بھی ہوتے ہیں۔ جو حاصل تلاش ہو کر حسینوں کا زیور اور سوداگروں کی روزی بن جاتے ہیں۔ دوسرے شعر میں بیتابی کی حسین کیفیات ہیں شاید کسی کو اس جگہ پہنچ کر تسلسل مفہوم میں کلام ہو۔ خدا کے لئے حالت مشاہدہ کو ملاحظہ فرمایئے، نگاہیں مخزن سے چلتی ہیں اور پانی کے ساتھ ساتھ دور تک چلی جاتی ہیں مگر آبشار کی ریشہ دوانیاں مسلسل و پیہم انداز سے جاری وساری ہیں۔ شاعر کی نگاہ بہتے ہوئے پانی کے دامن سے اچانک اٹھتی ہے، اور ایک بار بلند منبع پر پہنچ جاتی ہے۔ پانی کا تازہ جھالا نظر آتا ہے اور لبوں سے دو شعر بے اختیار نکل جاتے ہیں۔

۴۱ - وہ کھیتوں میں راہیں کترتا ہوا زمینوں کو شاداب کرتا ہوا

کھیتوں میں راہیں کترنا کیا نفیس منظر ہے۔ ایسے مقامات جو دامن نہر کے قریب واقع رہتے ہیں ان میں پانی کا کچھ حصہ جو اُن کے قریب سے گذرتا ہے داخل ہوتا ہے لیکن چونکہ یہ پانی اپنے اصلی دھارے سے بالکل جدا ہوتا ہے لہذا ایکبارگی اور پورے زور سے داخل نہیں ہوتا بلکہ مختلف لہروں میں تقسیم ہو کر بقدر وسعت بڑھتا ہے۔ کترنے کا لفظ خاموشی کا عالم بھی ظاہر کرتا ہے اور سناٹے کا وقت بھی کیا عجب ہے کہ اندھیرا ہو چکا ہو، زمینیں اسلئے شاداب ہوتی ہیں کہ جب پانی بہ جاتا ہے، نہر سمٹ جاتی ہے اور چادر خاکی نمودار ہوتی ہے تو اس طرح کہ اصلی سطح پر اُن زرخیز مادیات کی دبیز تہ جمی ہوئی ہوتی ہے جو پانی کی گود میں پہاڑیوں کے دامن سے کھینچکر آئی تھیں اور جوشش ارضی کے زیر اثر تدریجی طور پر امانتاً جمع ہوگئی تھیں۔

۴۲۔ یہ تھالوں کی گودوں کو بھرتا ہوا　　وہ دھرتی پہ احسان دھرتا ہوا

اب ہمارا مسافر ہرے بھرے باغوں سے ہوکر گزر رہا ہے۔ تھالے اور گود کی تشبیہہ کسقدر دلکش ہے۔ 'دھرتی' اور 'دھرتا ہوا' کی لفظی رعایت مستحق ستائش ہے۔

۴۳۔ یہ پھولوں کے گجرے لٹاتا ہوا　　وہ چکر میں بجرے پھنساتا ہوا

یہ لیجئے صبح بنارس کا پورا خاکہ ملاحظہ فرمایئے۔ حسن و شباب کے رازدار، رات بھر کے غمگسار پھولوں کے باسی ہار نہر میں سرائے جارہے ہیں۔ گھاٹ پر ہلالی کشتیوں میں چاند کے ٹکڑے ہی ٹکڑے نظر آتے ہیں اور تاروں کی چھاؤں میں سیر کرنے والوں کے بجرے بھنور میں پھنس کر لطف فرحت کو دوبالا کئے دیتے ہیں۔

۴۴۔ لپکتا ہوا دندناتا ہوا　　امنڈتا ہوا سنسناتا ہوا

۴۵۔ چمکتا ہوا اور جھلکتا ہوا　　سنبھلتا ہوا اور چھلکتا ہوا

۴۶۔ ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا　　حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا

۴۷۔ تڑپتا ہوا جگمگاتا ہوا　　شعاعوں کا جوبن دکھاتا ہوا

۴۸۔ یونہی الغرض ہے یہ پانی رواں　　بس اب دیکھ لیں شاعر نکتہ داں

۴۹۔ وہ سودھی کا سیلان آب لو ڈور

یہ بحر خیالات اکبرؔ کا زور

پینتالیسویں شعر سے سافر کی پہلی صبح شروع ہوتی ہے وہ غریب رات بھر کھیتوں میں اور باغوں میں آوارہ گردی کرتا ہوا سحر صادق کے وقت گھاٹ تک پہنچ چکا تھا جہاں محبوب اور حبیب کا رازدار بنتا ہوا اور صبح خیز فطرت پرستوں کا لطف تفریح بجروں کی کشاکش سے بڑھاتا ہوا سرگرم سفر تھا کہ اتنے میں آفتاب عالمتاب نے دریچہ مشرق سے جھانک کر سارے جہان کو سنہرا کردیا اور فیض عکس نے سطح آبی کو تڑپتا ہوا آئینہ بنادیا چمکنے کے بعد جھلکنے کی کیفیت کس قدر پیاری ہے سنبھل سنبھل کر چھلکنا تعریف سے بالاتر ہے۔

چھیالیسواں شعر ایشیائی بلکہ زمانۂ قدیم کی ساری دنیا کا مرقع کارزار ہے۔ سینتالیسواں شعر رشک سکندر اور نازش جم ہے۔ اڑتالیسویں شعر کے مصرعہ اوّل کی حقیقت نگاری اور

اختصار ارے توبہ ! اکبر جیسا فطرت پرست بھی خانہ بدوش مسافر کا ساتھ نہ دے سکا اور واقعی اس کا ساتھ فطرت کے سوا کون دے سکتا ہے۔ شاعروں کے تخاطب میں نکتہ داں کی تخصیص کس قدر پیاری ہے۔

آخری شعر میں سودی کی انگریزی نظم سے اپنی اس نظم کا مقابلہ مطلوب ہے اور انصاف نکتہ دان شاعروں کے حوالہ کیا گیا ہے۔ میں بھی مرحوم کی تقلید کرتا ہوں اور فیصلہ ترجیح نکتہ سنج ناظرین کے حوالہ کرتا ہوں۔

نثر کی کتابیں

متفرق مضامین اور خطوط کے علاوہ نثر میں اکبر صاحب کی پانچ کتابیں موجود ہیں۔

(۱)۔ فیوچر آف اسلام یعنی اسلام کی حالت آیندہ، مصنفہ ولفرڈ اسکاوّن بلنٹ صاحب جس کو منشی سید اکبر حسین منصف علیگڈھ نے مسلمانان ہند کی اطلاع کے لئے اُردو میں ترجمہ کیا، مطبع جماعت تجارت متفقہ اسلامیہ کی چھپی ہوئی ہے۔ صفحات ۱۶۵۔ کاغذ گندہ سفید، قیمت پانچ روپیہ (صہ)

تمہید اور دیباچہ کا خلاصہ اقتباسات کی شکل میں نذر ناظرین ہے تاکہ کتاب کا مقصد، عبارت کی روانی، ترجمہ کی شان اور تصنیف کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

مگر اقتباسات کے پہلے اکبر صاحب نے اس عربی شعر کا ترجمہ کیا ہے جس کو مصنف نے اپنی انگریزی کتاب کا زیب عنوان قرار دیا ہے۔

لا تقنطوا الدر ینثر عقدہٗ	نہ ہو تو مایوس و دل شکستہ بکھر گئے ہیں اگر یہ موتی
للعود احسن فی النظام واجملا	زیادہ تر حسن عمدگی سے گندھیں گے بار دگر یہ موتی

ترجمہ کی دقتیں جاننے والے سمجھتے ہیں کہ نظم کا نظم میں ترجمہ کرنا اور دونوں زبانوں کی لطافت قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔

تمہید کا خلاصہ خود مترجم کے الفاظ میں۔

مصنف نے جو خیالات ظاہر کئے ہیں عام اس سے کہ وہ ہمارے حسب مراد ہوں یا

نہ ہوں اُن کی صحت تمام تر لائق تسلیم ہو یا نہ ہو، ایسے نہ تھے کہ مجھ کو مسلمانوں کی اطلاع کے لئے اس کا ترجمہ کا شوق نہ پیدا ہوتا۔ مجھ کو اُمید ہے کہ میں نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا اگر سوچنے والی طبیعتوں کے دائرہ خیال کو وسیع کرنے کے لئے کچھ محنت اٹھائی اور اسلام کی مجموعی پالیٹکل اور مذہبی حالت کی نسبت انگلستان کے ایک عالی رتبہ اور ذی علم شخص کی رائے سے اُن کو مطلع کیا...... تو برا نہیں کیا۔

ابھی اکبر صاحب نے اس ترجمہ کو ختم نہ کیا تھا کہ خود مصنّف مسٹر بلنیٹ ہندوستان آئے اور مترجم نے کلکتہ میں ان سے ملاقات کی اور مُصنّف نے دیباچہ اوّل کا ضیمہ ایک دوسرا دیباچہ لکھا۔

میں اس کتاب پر مفصل تنقید نہ کروں گا نہ اس کے بعد والی کتابوں پر سر دست مبسوط تبصرہ کروں گا اس لئے کہ یہ سب تراجم ہیں۔ میں اکبر کو بحیثیت شاعر و نثار کے پیش کر رہا ہوں ان کتابوں کے خیالات پر بحث کرنا گویا خود اصل مصنّف و تصنیف کی تنقید ہے جس سے مجھ کو کوئی تعلق نہیں۔

ان کتابوں کا مبحث تاریخی اور سیاسی ہے۔ براہ راست ادب سے متعلق نہیں میرے لئے اور آپ کے لئے صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ ان کی حیثیت صرف ترجمہ کی ہے جس کے لئے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں ہو سکتی کہ ترجمہ کے اقتباسات جا بجا سے پیش کر دیئے جائیں۔

ترجمہ کی زبان الفاظ کی نشست عبارت کی روانی، محاورات کی بندش کا جہانتک تعلق ہے سیر اقتباسات میں دو اُمور کا خیال رکھنا چاہیئے۔

(۱)۔ یہ کتابیں ۱۸۸۲ء سے ۱۸۸۸ء تک کی ہیں۔ ۴۰ و ۴۶ برس گذر چکے ہیں اسوقت اُردو کی یہ حالت جو اب ہے نہ تھی۔ اُردو نے تیس برس کے اندر حیرت انگیز اور لائق رشک ترقی کی ہے۔ لہذا آج کی زبان سے اُس کا موازنہ نہ کیجیے گا۔

(۲)۔ ترجمہ کا کام نہایت مشکل ہے، بالخصوص لفظی ترجمہ میں زور تصنیف اور دونوں زبانوں کا حسن بیان قائم رکھنا بہت مشکل ہے۔ اقتباسات پیش کرنے کے پہلے میں ایک

بات اور عرض کر دینا چاہتا ہوں خود مترجم کا خیال اپنے ترجمہ کے متعلق کیا تھا

صفحہ ۴ ـــــ جہاں تک ممکن تھا میں نے لفظی ترجمہ کیا ہے اور مصنّف کے سلسلۂ خیالات کو ذرا بھی برہم نہیں ہونے دیا۔ فقروں کے ترکیب کی پیچیدگی دور کی ہے۔ معانی کو کامل اور روشن کرنے کے لئے ایک لفظ کے ترجمے میں حسب ضرورت دو دو اور تین تین لفظ (مترادفات) لکھدیئے ہیں لیکن خیالات پیچیدہ کا سہل کرنا میرا کام نہ تھا۔ "سب سے بڑی خوبی ترجمہ کی تسلسل ہے کہ بنفسہٖ تصنیف معلوم ہو۔

بعض اقتباسات جو شان ترجمہ اور بحث کتاب پر روشنی ڈالتے ہیں۔

صفحہ ۷ ـــــ "اہل فرانس نے ٹیونس پر حملہ کر کے شمالی افریقہ میں مسلمانوں کی حرکت و شورش پیدا کر دینے میں جلدی کر دی۔"

صفحہ ۸ ـــــ "معاصر کے بڑے بڑے واقعات سے یہ سمجھ کر آنکھ بند کر لینا کہ اس تاریخ کو ہماری روزانہ زندگی کے مشاغل سے کوئی صریحی تعلق نہیں ہے، یہ ایک ایسی بات ہے جو ایک بڑی قوم کے شایان حال نہیں ہے۔"

صفحہ ۹ ـــــ "نزاع اور اختلافات سے بہر حال مذہب ہی کا ضعف متصوّر ہے، جس کی تاک میں اور بھی ہزاروں دشمن لگے ہوئے ہیں۔"

صفحہ ۱۱ ـــــ "کتاب فیوچر آف اسلام کو زبان اُردو میں ترجمہ کرنے کی اجازت دینے کے ساتھ ہی میں اپنی بے انتہا مسرت ظاہر کرتا ہوں کہ میری ناچیز تصنیف کو ایک لائق اور تعلیم یافتہ مسلمان نے دنیا میں سب سے بڑی مسلمانوں کی جماعت کے پڑھنے کے لائق سمجھ کر پسند اور منتخب کیا۔"

صفحہ ۱۲ ـــــ "اب بھی مجھ کو اسلام کی حالت آیندہ پر ویسا ہی اعلیٰ درجہ کا یقین اور بھروسہ ہے جیسا کہ ۱۸۸۲ء کی فصل بہار میں تھا اور اگرچہ لوگوں کو نخل اُمید سے پھل پانے میں کچھ تاخیر ہو گئی لیکن میں بیدل نہیں ہوں گو سر دست ناکامی ہوئی ہے لیکن ہم کو خدا پر بھروسہ اور یقین رکھنا چاہیئے۔"

مصنّف نے نہایت تحقیق اور محنت کے ساتھ اپنے مشاہدات اور شواہد کی بنا پر

مضامین لکھے ہیں۔ پوری کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ شائقین تاریخ و تحقیق کے لئے عموماً اور مسلمین کے لئے خصوصاً نہایت مفید ہے جو لوگ مذاہب اور تمدن سے بہ حیثیت مذہب و تمدن کے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لئے بھی نہایت دلچسپ ہے۔

مترجم نے نہایت پاکیزہ ترجمہ کیا ہے اور علم ادب میں یہ ترجمہ ایک گرانقدر حیثیت رکھتا ہے۔ تعجب ہے کہ لوگوں نے اسے اس قدر جلد بھلا دیا۔

اسی طرح مضامین متعلقہ ہند کے چار حصہ ہیں۔ تین حصص یعنی اوّل، دوم اور چہارم میرے قبضہ میں ہیں۔ تیسرا حصہ سخت جستجو کے باوجود ابھی تک دستیاب نہیں ہوا۔

یہ سب رسائل چالیس چالیس پچاس پچاس صفحات کے ہیں اور ولفرڈ اسکاون بلنٹ اور لیڈی بلنٹ کے ایڈریس جو اُن کو مختلف مقامات پر دیئے گئے۔ مضامین اور تقاریر۔ جو انھوں نے ہندوستان کے مختلف موقعوں پر کیں، جوابات اعتراضات اور ردّ اعتراضات کا مجموعہ ہیں جسے اکبر صاحب نے تراجم اور تالیف کی مدد سے کافی محنت کے بعد منطقی ترتیب سے جمع کر دیا ہے۔

حصہ اوّل و چہارم خصوصیت سے دیکھنے کے قابل ہیں علیگڈھ اور حیدرآباد کے تعلیم و تربیت کی تنقید اور مشورے شائقین تاریخ کے لئے گرانبہا ہیں۔

ترجمہ کی شان کا اندازہ آپ اسلام کی حالت آیندہ کے اقتباسات سے کر سکتے ہیں۔ انتخابات اور خلاصے بھی اکبر صاحب کی احتیاط اور نکتہ رسی کا پتہ دیتے ہیں۔

خصوصاً ضروری اور محققانہ حواشی دلچسپ و معنی خیز ہیں۔

اکبر کے نظریئے کلام کے شواہد معہ ضروری حواشی و تنقید

"دوپہر" میں اس عنوان کو کس لئے جگہ ملی؟

اس لئے کہ یہ نظریئے ہر دور میں مشترک اور سب پر حاوی ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ ۱۸۸۶ء سے ۱۹۰۳ء تک کے بہت سے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔

خود مصنف سے زیادہ اس کے مطمح نظر، نقطہ نگاہ، معیار پسند اور نظریہ کو کون جان سکتا ہے؟

کوشش بلیغ کی گئی ہے کہ جس شعر میں جو پہلو غالب ہو اسی سرخی کی تحت میں وہ شعر لکھا جائے مگر بہت ممکن ہے کہ لوگوں کو تقسیم اشعار میں کچھ اختلاف ہو۔ ان سے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ یہ تقسیم منطقی نہیں، نہ ہو سکتی ہے کیونکہ ایک ہی شعر میں کئی پہلو نکلتے ہیں۔

یہ اشعار محض شواہد کی حیثیت سے نمونتاً دیئے جاتے ہیں۔ انتخاب نہیں ہے۔ کلیات مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام میں اب بھی ایسا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ جس کی قیمت کا اندازہ محض سیر کلام سے ہو سکتا ہے۔

عنوان اس لئے قائم کر دیئے گئے ہیں تا کہ منتشر اشعار ایک جگہ نظر آئیں۔ میں نے کم سے کم عنوان مقرر کئے ہیں ورنہ خصوصیات کا حصر جامع نہایت دشوار تھا یہی نہیں کہ اسی صورت میں صدہا عنوان قائم کرنے پڑتے بلکہ ہر عنوان ثانوی عوانین میں تقسیم ہو جاتا

ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے اور گلدستہ شواہد کے حاشیہ پر چند ضروری خیالات کا اظہار کر دیا گیا ہے۔

اُخوّت و ملّت

صبر باقی ہے نہ ہم میں باہمی اعزاز ہے　　　سب کی ہے تذلیل اور تعظیم ان کے ہاتھ میں

جب تک ہم میں رواداری کا مادہ نہ آئیگا ہم آزاد قوموں کے دوش بدوش نہیں چل سکتے۔

ملت کا ادب اٹھ گیا جس قوم کے دل سے　　　اقبال کے سمت اُس نے کبھی راہ نہ پائی

تاریخ عالم اس بات کی گواہ ہے۔

کیجے ثابت خوش اخلاقی سے اپنی خوبیاں　　　یہ نمود جبہ و دستار رہنے دیجیے

" درویش صفت باش کلاہ تتری دار" کا نفیس رخ ہے۔

گٹی رگ اتحاد ملت رواں ہوئیں خون دل کی لہریں　　　ہم اس کو سمجھے ہیں آب صافی نہالیے ہیں نکھر رہے ہیں

ہم خود غرضی کی بدولت محض اپنی ذاتی کامیابی پر خوش ہوتے ہیں خواہ ہماری کامیابی سے ہمارے صدہا بھائی برباد ہو جائیں۔

کہاں وہ اب لطف باہمی ہے محبتوں میں بہت کمی ہے　　　چلی ہے کیسی ہوا الٰہی کہ ہر طبیعت میں برہمی ہے

اَب کے لفظ سے اسلاف و اخلاف کے لطف کا موازنہ کیا ہے اور محبت، ہمدردی کا صحیفہ بھی ہے۔

بہت دشوار ہے مسلم کو قومی پیشوا بننا　　　مصیبت جھیلنا اور ہادی راہ خدا بننا

مشینوں سے لپٹ کر اس قدر البتہ ممکن ہے　　　بہ باطن خود گھسٹنا اور بہ ظاہر رہنما بننا

شاعر اور معمولی ناظرین میں یہی فرق ہے کہ وہ ہر شے کی ماہیت اور ہر تصویر کے تمام رخ ایک ہی نظر میں دیکھ لیتا ہے۔ چوتھے مصرعہ کی بلاغت میرے دعوے کی دلیل ہے۔

اس زمانے میں غیرت ملّت　　　رہتی ہے جاں کی اماں کے ساتھ

ہم میں ایثار کا جو فقدان ہو گیا ہے۔ یہ شعر اسی حالت کا آئینہ ہے۔

ٹیمز کے ساحل پہ جا کر دیکھتے قسمت کی فال　　　گومتی پر شیعہ و سنی نے کیوں تکرار کی

انگلینڈ کے ایک دریا کا نام ٹیمز ہے۔ کس قدر نصیحت آمیز ہے۔

جنھیں ہے شرک سے نفرت خدا کو ایک کہتے ہیں　　　یہ ان میں کیوں ابھی تک جنگ اور تکرار باقی ہے

سبب اس کا تو ظاہر ہے خدا لب پر خودی دل میں　　　بتان سنگ ٹوٹے ہیں بت پندار باقی ہے

اپنے غرور و تکبر کے زعم میں وہ تمام فرقے جو ایک خدا کے قائل ہیں آپس میں لڑتے رہتے ہیں، اور مذہب کا نام مفت میں بدنام کرتے ہیں۔

گرجا میں لاٹ صاحب مسجد میں شیخ صاحب | بدھو فلاسفی کے کمرہ میں سڑ رہے ہیں
خاک اُڑ رہی ہے گھر میں ڈیوڑھی میں غل مچا ہے | مذہب کے ہیں مخالف بھائی سے لڑ رہے ہیں

فلسفہ (PHILOSOPHY) وہ فلسفہ جو انسان کو نہ دنیاوی اعزاز دے سکے نہ دین کا بنا سکے اور جس سے انسان کا اخلاق درست نہ ہو سکے بالکل بیکار ہے۔

تمھاری حرص بدل کر تمھیں کریگی ہلاک | ہمارا صبر بدل دے گا اس زمانے کو

صبر و حرص کے موازنہ سے شاعر نے کتنی اچھی بات سکھلائی ہے۔

سمجھیں نہ حضور تھرڈ والوں کو حقیر | انجن تو وہی ہے جس کی ہم سب کو ہے آس
اسٹیشن گور تک ہے یہ فرسٹ و سکنڈ | بعد اس کے موافق عمل ہوگا کلاس

مغرور منعمین اور متکبر زاہدین و عالمین کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ علم و عمل کا فلسفہ روزانہ زندگی کی ایک بین اور سادہ سی مثال دیکر کس صفائی سے بیان کر دیا ہے۔ CLASS = کلاس = درجہ

یہیں کی پیدا یہیں کی رنگت یہیں کی بولی یہیں کا کھانا
تو پھر تفاوت ہو کیوں سروں میں ہر اک کو بہتر ہے دیش گانا

وطن پرستی کی ترغیب کیسے مترنم لفظوں میں کی گئی ہے۔ دیش = وطن ، ایک راگ کا نام ہے۔

رہے فرنگی سوان کی سیوا ہر ایک پر آپ فرض کردیں | جو خاص مطلب ہوں اپنے اپنے الگ الگ جا کے عرض کردیں
جو باہمی بحث ہو تو باہم ہم اس پہ قال اَقول کرلیں | جو فیصلہ ہو قبول کرلیں جو خار بھی ہو تو پھول کرلیں
برادرانہ محبتیں ہوں جنہیں مزے سے خوشی منائیں | نہیں ہے اس میل کا یہ مطلب کہ ہم گورنمنٹ کو ستائیں

سیوا = خدمت ؛ قال اَقول = بحث و مباحثہ۔

سیاسی موالات اور باہمی موالات میں جو نکتے سطحی نگاہ والوں سے پوشیدہ ہیں وہ چند لفظوں میں بتلا دیئے گئے ہیں۔

ترقی پا کے وہ برگد میں پہونچے | کسی کو کیا کہ جب تنہا خوری ہے

وہ بھائی جو معزز عہدوں پر پہنچکر اپنی غریب قوم کی فلاح کا خیال نہیں کرتے ذرا غور سے اس شعر کو پڑھیں۔

اسلام

بڑھتا رہا جو طاعت و مسجد سے یونہی بیر
کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہوں گے جزو غیر

اسلامی سلطنتوں کے زوال کی مختصر سی تصویر ہے۔

کہتے ہو تم جو وی[1] تو انہیں آتی ہے ہنسی
یعنی زبان شوق غلط لفظ میں پھنسی

زبان پر تو ہم ہے مگر عمل سے "میں" "میں" کا ثبوت ملتا ہے۔

آنر کے ساتھ نام گرامی بھی لکھ گیا
لیکن ادھر سے خط غلامی بھی لکھ گیا

لوگ خاں صاحب، خان بہادر، سر اور آنریبل یہ بھول جاتے ہیں کہ اعزاز عطا کرنے والے نے سلسلۂ غلامی کی کڑیاں اور مضبوط کر دی ہیں۔

موقع کا ہے خیال نہ اب کانشنس[2] ہے
ارشاد ہو غلط بھی تو اس کا ڈفنس[3] ہے

یہ باتیں آئے دن ہوتی ہیں دربار داری کرنے والوں سے پوچھئے۔

ارشاد لاجواب تو قرآن ہی کا ہے
قانون بے مثال تو رحمان ہی کا ہے

انسانی اور الٰہی ارشاد و قوانین کا تقابل نہایت عمدگی سے کیا گیا ہے۔

وقعت ہماری شاہ کی منزل میں کچھ نہیں
کاغذ پہ اعتراف مگر دل میں کچھ نہیں

یعنی ظاہری اسناد سے دلی وقعت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

نقلی کمیٹیوں میں نہ دل ہے نہ دین ہے
یہ پائنیر پری کی فقط اک مشین ہے

موجودہ مجالس ملیہ و سیاسیہ کی حالت دکھائی گئی ہے۔ پائنیر ایک انگریزی روزانہ اخبار ہے۔

طاعت سے نیکیاں ہیں تو نیکی سے عزتیں
شبہے کی کوئی بات نہیں اس اصول میں

سطور بالا کی تمہید کے بعد بیان اصول نہایت موثر ہے۔

وقعت مگر محال ہے مسجد کو چھوڑ کر
ممکن نہیں کہ پائیے پھل جڑ کو توڑ کر

"مسجد" محض فروعی چیز نہیں ہے اصلی شے ہے۔

اک برگ گل کہے گا کہ ہم گل کے جزو ہیں
تم خود کو کیا کہو گے کس کل کے جزو ہیں

---

[1] WE = ہم؛ [2] CONSCIENCE = ضمیر؛ [3] DEFENCE = تادیل

جب تک داد اخوت و ملت نہ ہوگا تم انفرادی حیثیت سے نامکمل رہو گے۔

لاٹھی بھلی ہو اگر اس کی رگ سے رگ　　بیکار توپ جس کے ہوں پرزے الگ الگ

قوم سے مل کر اور قوم سے جدا ہو کر انسان کی جو حالت ہو جاتی ہے اس کا مرقع کھینچا گیا ہے۔

پھل پھول پتیوں پہ ہے تیری نظر نثار　　جڑ پر نظر نہیں ہے کہ جس کی ہے سب بہار

وہ جڑ کیا ہے؟ اسلام ہے اور اسلام کے سب قوانین جس پر ہم عمل نہیں کرتے اور جن کو ہم بھولتے جاتے ہیں۔

مانوں گا میں یہ بات کہ مجبوریاں بھی ہیں　　پر بالارادہ دین سے کچھ دُوریاں بھی ہیں

بہت سی مشکلات جو بظاہر بہت بھیانک معلوم ہوتی ہیں "اگر خارے بود گلدستہ گردد" ہو سکتی ہیں۔

کلفت اسی کی مجھ کو ہے ہر آن ہر نفس　　لاکھوں کی سدِّ راہ ہے دس بیس کی ہوس

بعض مسلم خود پسندی اور طمع ذاتی میں پڑ کر اپنے ابنائے قوم و وطن کو تباہ کر رہے ہیں۔

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ میں چلنا چھوڑ دیا
جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر اُمید کا تھا
جب صرصر عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

شاعر نے زمین بھی ایسی عمدہ پسند کی ہے جس میں روانی صوت و الفاظ کی رکاوٹ سے درد غم کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالت قابل رحم ہے مگر یہ اُمید بھی دلاتی ہے کہ اگر سر میں ہوائے طاعت بھر دی جائے تو شجر اسلام دوبارہ پھل پھول سکتا ہے۔

وہاں قالو بلٰی یاں بت پرستی　　ذرا سوچو کہا کیا تھا کیا کیا

روزِ الست اسلام کے بموجب ہر روح نے وعدہ کیا تھا کہ میں دنیا میں جا کر صرف تیری پرستش کروں گی مگر کتنی روحیں اپنے عہد پر قائم ہیں؟

گو چکا چوند کا عالم ہے نئی روشنی میں　　ہے مگر پیش نظر عرش کا تارا اسلام
ان کے مضبوط جہازوں کی مددگار ہے آگ　　مری ٹوٹی ہوئی کشتی کا سہارا اسلام
خوف حق الفت احمدؐ کو نہ چھوڑے اکبرؔ　　منحصر ہے انھیں دو لفظوں پہ سارا اسلام

صبر و امید و قناعت و آرزو کا مرقع نہایت لطافت سے کھینچا گیا ہے۔

اسی سلسلہ میں اسلام کی حالت آیندہ کا باب اوّل ملاحظہ فرمائیے۔

وزن اب انکا معین نہیں ہو سکتا کچھ   برف کی طرح مسلمان گھلے جاتے ہیں

جس طرح برف کا گھلنا بالکل مسلسل ہوتا ہے ویسا ہی مسلمانوں کا تنزل بالکل مسلسل ہے۔

گردن محراب مسجد خم ہوئی تعظیم کو   اٹھی آواز اذاں اسلام کی تعظیم کو

دونوں مصرعوں میں حسن تعلیل ہے۔

واعظ تو بتاتے ہیں مسلمان کو کافر   افسوس یہ کافر کو مسلماں نہ کریں گے

آج کل تکفیر کے فتاوے کی جو کثرت اور تبلیغ کی جو حالت ہے اس کا اندازہ اس شعر سے ہو سکتا ہے۔

اکبر کو دعا دیتے ہیں احباب یہ کہہ کر   اب اپنی جماعت میں مسلمان یہی ہے

یہ بات اپنے منھ سے اپنی تعریف نہیں ہے بلکہ حقیقت حال یہی ہے۔ مشکل سے دو چار نفوس مسلم و مومن نظر آتے ہیں ورنہ منافق بہت ہیں۔

آپ منکر ہیں غلامی بھی نہیں ملتی ہے   سلطنت کر گئے عقبیٰ سے ڈرانے والے

رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کی شان ملاحظہ فرمائیے۔

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ   مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

غلط تعلیم کا اثر مذہب پر غلط ہوتا ہے۔

اگر میں ڈوب جاؤں قلزم اشک ندامت میں   گناہوں کا سفینہ غرق ہو دریائے رحمت میں

واقعی توبہ کے سچے آنسو گناہ کا بیڑا پار کر دیتے ہیں۔

تائید وضع ملت و دیں کی کروں گا میں   اہل زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

ہوتا نہیں طبیب مداوا سے دستکش   سچ ہے اجل تو ہنستی ہے سعی طبیب پر

ہر مسلم تائید وضع ملت و دین کے لئے مجبور ہے اس لئے کہ اگر حکیم مرضا کے علاج سے حتی الامکان دست کش ہو جائے تو اخلاقی اور مدنی جرم ہے۔

مجلس میں خیال بادہ نوشی پایا   مکتب میں سر سخن فروشی پایا

مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبر   لیکن اک عالم خموشی پایا

مسجدوں کے سناٹے کا عالم کس قدر عمدگی سے دکھایا گیا ہے۔

خدا جانے کہا کس نے یہ کس دن عقل مسلم سے
کہ مشرق کو نظر آتا نہیں مغرب سے چھٹکارا

مضر ہیں مذہبی قیدیں مناسب ہے شکست ان کی
مزاحم ہیں مگر یہ مولوی ان کا نہیں چارا

وہ چھینٹے دیجئے ان کو حکیمانہ طریقوں سے
کہ بجھ کر راکھ ہی ہو جائے مذہب کا یہ انگارا

چلے مقراض تدبیر ایسے پیچیدہ طریقوں سے
کہ جڑ کٹ جائے مذہب کی یہ گھر ہو منہدم سارا

مخربان اسلام نے کبھی کوئی دقیقہ بربادی اسلام کا لگا نہیں رکھا۔

قیامت کر گئی تو می ترقی گوش مسلم میں
لگا کہنے زہے نعمت اگر حاصل شود مارا

اگر آں شاہد مغرب بدست آرد دل مارا
بچشم مست او بخشیم تسبیح و مصلےٰ را

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

مصلے کو غرض نہ کر کے اٹھا عابد مشرق
جو طاقت آگئی تھی دل میں اس طاقت سے للکارا

ادھر تحریر ادھر اسپیچ ادھر سازش ادھر بندش
اسے جھڑکا اسے ڈانٹا اسے گانٹھا اسے مارا

ان دو شعروں کے سمجھنے کے لئے کسی خاص ہستی کو فرض کرنے کی ضرورت نہیں اسلام میں سب داخل ہیں

ڈنر، عہدے، تبسم، مشورے، وعدے بنے گیسو
وہ گیسو جس سے پھیلی بوئے مست عنبر سارا

حواس ظاہری کے دام سے بچنا ہوا مشکل
کجا موہوم حوریں اور کہاں پریوں کا نظارا

وہ ٹوٹے یہ گرے وہ پھسلے یہ چت ان کو غش آیا
نہ ایماں میں رہی طاقت نہ دل میں ضبط کا یارا

حریفان طرب آگیں نے چھیڑا ساز عشرت کو
بجایا سب نے مضراب ہوس سے دادرا دارا

بتوں کے عشق میں پڑ ہی چکے تھے عقل پر پتھر
مسوں کا بے تکلف چڑھ گیا ہر قلب پر پارا

غریبوں دردمندوں بیکسوں کے دل کی کیا ہستی
وہ حالت پیش آئی تھی کہ جس سے سنگ ہو خارا

نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے
نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا

ہوا سب کو تعجب کیوں ہوئیں یہ حالتیں پیدا
نہ تھا یہ مطلب سید کہ اس رخ پر چلے دھارا

وہ پردے کے بڑے حامی تھے طاعت کے مؤید تھے
نہ خواہاں تھے کہ چمکے اوج پر اسلام کا تارا

سنا سب کچھ مگر دیکھا جو بالآخر تو کیا دیکھا
وہی اینٹیں وہی پتھر وہی چونا وہی گارا

ادھر شیرازۂ قومی کو ہیں ہم توڑتے جاتے
ادھر بازی حریفوں کی ہے ہاتھ ان کے ہے پوبارا

مدار خیر خواہی ترک مذہب پر نہیں ہرگز ہر اک نے دل سے انگلش کی ہے لائیلٹی کا دم مارا
صلوٰۃ بے وضو سے رو رہی ہے اس طرف مسجد ادھر قرآن بے رغبت سے دل مذہب کا سیپارا
مشینیں چل رہی ہیں اور کسی کی کچھ نہیں چلتی ادھر ہیں بے چھلے کندے ادھر ہے برق وش آرا
بٹھایا کیوں نہیں جاتا یہ نقش جانفزا دل پر کہ روحانی ترقی میں ہو لڑکا عرش کا تارا
میں یہ پیچیدہ بحثیں پیش کرنے کو تھا آمادہ کہ اتنے میں جناب حضرت حافظ نے للکارا

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

ہندوستان میں تنزل اسلام کے اسباب میں سیاسی اور مجلسی کمزوریاں بھی بڑی حد تک شامل ہیں۔

لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں کہ اکبر سر سیّد کے مخالف تھے ذیل کے اشعار سے بالعموم اور خط کشیدہ مصرعوں سے بالخصوص یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ سیّد کے مخالف ہرگز نہ تھے بلکہ اس جماعت کے مخالف تھے جو سر سیّد کے ارشادات کو غلط معنی پہناتی تھی اور غلط طور پر سیّد کے بتائے ہوئے نیک راستوں پر گامزن تھی۔ اکبر کی یہ خاص خوبی ہے کہ نصیحتوں کے دفتر بہا جاتے ہیں اور یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ نصیحتیں ہیں یا روزانہ کی معمولی باتیں۔

آخر میں حافظ کے ایک شعر سے قلب سامع و ناظر کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ بھی قابل قدر ہے وجدان کی حالت پیدا ہوتی ہے اور جو "نقش جانفزا" اکبر بٹھانا جانتے تھے وہ نہایت نفاست سے بیٹھ جاتا ہے۔

برق کلیسا

رات اس مس سے کلیسا میں ہوا میں دو چار
ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ اُبھار

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں
گال وہ صبح درخشاں کہ ملک پیار کریں

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رُک جائیں
سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آتش حسن سے تقوے کو جلانے والی
بجلیاں لطف تبسم سے گرانے والی

پہلوئے حسن بیان شوخیٔ تقریر میں غرق
ترکی و مصر و فلسطین کے حالات میں برق

پس گیا لوٹ گیا دل میں سکت ہی نہ رہی
سُر تھے تمکین کے جس گت میں وہ گت ہی نہ رہی

ضبط کے عزم کا اس وقت اثر کچھ نہ ہوا
یَا حَفِیظُ کا کیا ورد مگر کچھ نہ ہوا

عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار
دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار

تو اگر عہد وفا باندھ کے میری ہو جائے
ساری دنیا سے مرے قلب کو سیری ہو جائے

شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی
ناز و انداز سے تیوری وہ چڑھا کر بولی

غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے
بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

لن ترانی کی یہ لیتے ہیں نمازی بن کر
حملے سرحد پہ کیا کرتے ہیں غازی بن کر

کوئی بنتا ہے جو مہدی تو بگڑ جاتے ہیں
آگ میں کودتے ہیں توپ سے لڑ جاتے ہیں

گل کھلائیں کوئی میدان میں تو اترا جائیں
پائیں سامان اقامت تو قیامت ڈھائیں

مطمئن ہو کوئی کیونکر کہ ہیں یہ نیک نہاد
ہے ہنوز ان کی رگوں میں اثر حکم جہاد

عرض کی میں نے کہ اے لذت جاں راحت رُوح
اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح

اُب کہاں ذہن میں باقی ہیں بُراق و رفرف
ٹکٹکی بندھ گئی ہے قوم کی انجن کی طرف

ہم میں باقی نہیں اب خالد جانباز کا رنگ
دل پہ غالب ہے فقط حافظ شیراز کا رنگ

یاں نہ وہ نعرۂ تکبیر نہ وہ جوش سپاہ
سب کے سب آپ ہی پر پڑھتے ہیں سبحان اللہ

مجھ پہ کچھ وجہ عتاب آپ کو اے جان نہیں
نام ہی نام ہے ورنہ میں مسلمان نہیں

سیرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو
ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

مثنوی کے پیرایہ میں اسلام کے موجودہ حالت کی جتنی عبرت انگیز اور دلچسپ تصویریں کھینچی گئی ہیں اس کی مثال اُردو تو کیا اور بہت سی زبانوں میں بھی مشکل سے ملے گی۔

میری نگاہ میں یہ اشعار تنقید سے بے نیاز اور حواشی سے بالاتر ہیں۔ بار بار پڑھیئے۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ ہر بار ایک نیا لطف حاصل ہوگا ایک نئی بات معلوم ہوگی اور نیا سبق ملیگا۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر — مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں — نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
سناؤں تم کو اک فرضی لطیفہ[۱] — کیا ہے میں نے جسکو زیب قرطاس[۲]
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے — کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے — بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

[۱] فرضی لطیفہ نہیں ہے واقعہ ہے۔ ایک جگہ سے جج صاحب کے سالے حافظ حسین صاحب کی نسبت محض اس لئے رد کی گئی تھی کہ وہ بیچارے انگریزی نہیں جانتے تھے۔ [۲] کاغذ۔

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق کجا کالج کی بکواس
کجا یہ فطرتی جوش طبیعت — کجا ٹھوسی ہوئی چیزوں کا احساس

ہماری موجودہ طرز تعلیم میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ مناسبت فطری اور ذوق طبیعت کا خیال نہیں کیا جاتا۔ ایک ہی طالب علم کو بہت سے مضامین پڑھنے پڑتے ہیں خواہ اس کی طبیعت کے موافق ہوں یا مخالف۔

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
یہ اچھی قدر دانی آپ نے کی — مجھے سمجھی ہو کوئی ہرچرن داس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرط وصل لیلیٰ — تو استعفا مرا باحسرت و یاس

صدائے الحاد اُٹھ رہی ہے خدا کی اب یاد اُٹھ رہی ہے
دلوں سے فریاد اٹھ رہی ہے کہ دین ہم سے گذر رہے ہیں

اگرچہ یورپ بھی مبتلا ہے وہاں بھی پھیلی یہی بلا ہے
خیال میٹر کا بڑھ چلا ہے خدا کا انکار کر رہے ہیں
مگر وہاں کی بنا ہے نیشن رکا ہے ملحد کا آپریشن
نہیں ہے گم لفظ سالویشن خدا سے اب بھی وہ ڈر رہے ہیں
یہاں بجائے نماز گپ ہے وہاں وہی عزت بشپ ہے
یہاں مساجد اُجڑ رہی ہیں وہاں کلیسا سنور رہے ہیں

ردیف میں ہر جگہ ایک نیا لطف ہے۔ مغرب و مشرق کے مذہب کے تنزل میں جو باتیں مشترک ہیں اور جو ممیز ہیں ان کا احاطہ کیا گیا ہے۔

سراسر نور تقوے سایہ پر قربان کر آئے ‏ ‏ یہ کیا اچھا کیا تم نے اگر زر کھو کے مس لائے

مس = (۱) دوشیزہ - (۲) ایک معمولی دھات۔

نور تقوےٰ اور محبوبہ حسین میں وہی فرق ہے جو خالص سونے اور مس میں ہے۔

فرق کیا عاشق و واعظ میں بتائیں تم سے ‏ ‏ اس کی حجت میں کٹی اس کی محبت میں کٹی

لف و نشر غیر مرتب، ایک ہی مصرعہ میں دونوں کی ساری زندگی نظم ہوگئی ہے۔

طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر ‏ ‏ یہ تو اک ٹکس ہے اس آبادی پر

آبادی کی کثرت سے غربت اور گرانی بڑھتی جاتی ہے۔

داد قرآن کی نہ دو بھائی عمل اس پہ کرو ‏ ‏ پیش درگاہ خدا واہ کی حاجت کیا ہے

علم بے عمل بیکار۔

گرجا میں تو کرنیل و کمشنر بھی ہیں موجود ‏ ‏ مسجد میں کوئی ڈپٹی و منصف بھی نہیں ہے

ہمارے مسلم بھائی معمولی عہدوں پر پہنچکر مسجد سے بے نیاز ہو جاتے ہیں ان کو بتایا گیا ہے کہ جب بڑے بڑے عہدے کے لوگ بھی اپنے معبدوں میں نظر آتے ہیں آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے۔

اسلام کی بو وہاں نہیں ہے مطلق ‏ ‏ مسجد بھی ہے مولوی بھی ہیں ٹاٹ بھی ہے
دریا میں نہیں ہیں جو ہر تیغ اکبر ‏ ‏ گو آب بھی اس میں دھار بھی کاٹ بھی ہے

پہلے شعر میں جو دعویٰ کیا گیا ہے دوسرے شعر میں اس کی دلیل دریا و تیغ کے موازنہ سے دی گئی ہے۔

طاقت اسلام کی کہتی تھی مسلمانوں سے　　جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا دھیان رہے

وعدہ فراموشی کی تنبیہ بھی ہے اور مردانگی کی ترغیب بھی۔

اگر ہو ذوق سجود پیدا ستارہ ہو اوج پر جبیں کا　　نشان سجدہ زمین پہ ہو تو فخر ہے وہ رخ زمیں کا

طاعت کی شان اور عبودیت کا مرتبہ دکھایا گیا ہے۔

اگرچہ صبح کو پھیکے ہیں مثل مہ صائم　　چمک اٹھیں گے یہ جب وقت شام آئیگا

صوم کی تحریک کتنے ہمت افزا لفظوں میں کی گئی ہے۔

آج بنگلہ میں مرے آئی تھی آواز اذاں　　جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

اللہ اللہ اب اذان کی آواز ایسی حیرت انگیز ہو گئی ہے۔

فٹن نفیس سڑک خوشنما ڈنر ہر شب　　یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

شباب و بادہ و فکر مآل کار چہ خوش　　جنون عشق و خیال خطر یہ خوب کہی

آج آرام سے گزرتی ہے ؛ عاقبت کی خبر خدا جانے۔ اسی شعر کی پوری توضیح ہے

شیخ تثلیث کی تردید تو کرتے نہیں کچھ　　گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

(ایک سورۂ قرآنی ہے)۔ تثلیث = عیسائی ذات واحد میں تثلیث کے قائل ہیں۔ تین اردو میں ۳ کے عدد کو کہتے ہیں۔ معانی کے اشتراک سے لطف پیدا ہو گیا ہے۔

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے　　کونسل میں بہت سید مسجد میں فقط جمّن

"اکبر کی شاعری کا دور آخر" مطبوعہ مجلہ "اردو" اورنگ آباد ۱۹۲۲ء

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے　　یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

دولت دنیا کے مقابلہ میں دولت ایمان کی کوئی قدر نہیں ہے۔

خدا ہی کی عبادت جن کو ہے مقصود اے اکبر
وہ کیوں باہم لڑیں گو فرق ہو طرز عبادت میں

کتنا عمدہ فلسفہ ہے۔ کاش ابنائے وطن اس سے سبق حاصل کرتے۔

تاج پوشی

لندن سے دہلی آئے ہیں دس یوم کیلئے
یہ زحمتیں اُٹھائیں فقط قوم کے لئے

دیکھو حضور جارج ہیں کیسے خدا پرست
گرجا میں سر جھکا ہے دسمبر ہو یا اگست

رکھتا نہیں نماز سے تو اپنے دل کو گرم
اے مدعی دین خدا شرم شرم شرم

بابو گریجوئیٹ ہیں کالی کے ساتھ ہیں
اک آپ ہیں کہ ہوٹلوں والی کے ساتھ ہیں

مسلمین کی حالت اور اقوام عالم کے مقابلہ میں قابل رحم ہے۔ مغربی ہی نہیں خود ہندوستان کی اور قومیں ترقی کر رہی ہیں ایک ہم ہیں کہ عیش ونشاط کے نشہ سے چونکتے ہی نہیں۔

نہ کھول آنکھ کسی عکس بے بقا کے لئے
صفائے دل پہ نظر رکھ فقط خدا کے لئے

ایک طرف تو خالق ومخلوق کی شان فنا وبقا کا اظہار ہے، دوسری طرف اسلام کی سچی تعلیم کا اعادہ ہے کہ ہر کام خدا کے لئے اور صرف خدا کے لئے ہونا چاہئے۔

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

جب تاریخیں پس پشت ڈال دی جائیں اور دلائل محض تکرار اور ضد تک محدود ہوں تو اس سے اچھا جواب نہیں ہو سکتا۔

کریں گے شوق سے مسلم غذا میں مے داخل
شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

جاننے والے افسوس کے ساتھ جانتے ہیں کہ اب مے خوری اور بادہ نوشی میں مسلم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔

وہ اس کو مجو کلیسا بنا کے چھوڑیں گے
اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے

مسلم غلامی کے پنجے میں پھنس کر ظاہری نمود میں مبتلا ہو کر اور لذات جسمانی کے شکار ہو کر جس ردی حالت تک پہنچ جائیں وہی کم ہے۔

اب نہ جنگی علم نہ جھنڈا ہے
صرف تعویذ اور گنڈا ہے

کیا ہے باقی جناب قبلہ میں
کچھ حدیثیں ہیں ایک ڈنڈا ہے

۵۱۔ تاجپوشی کے لئے ۱۹۱۲ء ۔ ۵۲ کالی کلکتہ والی۔

سو وہ ڈنڈا بھی اب ہے ضبط پولس ہے زباں گرم قلب ٹھنڈا ہے

اسلام کے قابل فخر مجاہدین کی حالت کا مقابلہ آج کل کے نام نہاد مسلمین سے کیجئے تو ایک ہلکی سی مسکراہٹ ہوگی مگر ساتھ ہی ساتھ دل بے چین ہو جائے گا آنکھیں ڈبڈبا آئیں گی۔

حضرت اکبر مرے کس کام کے ہیں تو مسلماں مگر نام کے

لے گئی ایمان تری چشم مست اہل نظر رہ گئے دل تھام کے

جب "لسان العصر" اپنی تعلیم کا اثر خاطر خواہ نہیں دیکھتے تو سبب اصلی کا انکشاف کر دیتے ہیں۔

میرا مسلک[1] کچھ جدا ہے شیخ کے اسلام سے یاں خدا سے کام ہے اس کو خدا کے نام سے

یاں نگاہ خاص سے ہوتا ہے دل کو انبساط[2] اس کو راحت ملتی ہے فطرت کے فیض عام سے

عشوۂ ساقی کا یاں طالب ہوں میں بہر سرور اخذ کر لیتا ہے[3] وہ مستی کو دور جام سے

ہے کفیل[4] کار میرا یاں جنون صلح خیز واسطہ رہتا ہے اس کو عقل جنگ انجام سے

اب آپ ہی انصاف فرمائیے "صراط مستقیم" کون ہے اور کس کا اسلام حقیقی اسلام ہے۔

ہوئی طریق بزرگاں کی پیروی مفقود بس ان کے نام پہ لٹھ صبح و شام چلتا ہے

کسی اخبار کو اٹھا لیجئے۔ نام نہاد پیر یا بزرگوں کے نام پر بیجا لڑے مرتے ہیں اور "پیروی" حقیقتاً مفقود ہوتی جاتی ہے۔

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ سے

اس شعر میں معاذ اللہ جناب آدم کی کوئی تضحیک نہیں ہے۔ ایک لطیف پہلو تو یہ ہے کہ بہشت و مسجد ہم رتبہ ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ مسجد ہم نے نہایت معمولی چیز کے بدلے چھوڑ دی۔

ان ستونوں پر نہ سنبھلے گی تری سقف حرم خط ترسا پر اگر بنیاد ڈالی جائے گی

قاعدہ ہے کہ ہوشیار کاریگر اور معمار دیوار کی بنیاد قائم کرتے وقت پہلے سوت اور کھریا کے نشان ڈال لیتے ہیں۔ تقلیدی طور پر اعمال اسلام میں کامیابی نہیں ہو سکتی۔

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے

کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے

---

[1] طریقہ و راستہ۔ [2] خوشی۔ [3] حاصل کر لیتا ہے۔ [4] راہبر۔ کام سنبھالنے والا۔ راستہ بتلانے والا

بالآخر کہدیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ　　ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

یہ نظم مسلمانوں کی موجودہ حالت کا ماتم ہے۔ ظرافت کے پردہ میں کیسی کھری باتیں سنادی گئی ہیں اور حضرت اکبر سے جو لوگ واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ مصرعہ ثانی وثالث میں تھوڑا سا رنگ طبیعت بھی شامل ہے۔

شان نماز اکبر شاہانہ ہو چلی ہے　　مسجد الگ بنائیں اپنی میاں وفاتی

وہ نماز جس کے لئے اقبال کہتے ہیں کہ:۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسی نماز جماعت میں لوگ آپس میں تفریق کرنے لگے ہیں۔ غریب وفاتی جو مسلم ہونے کی حیثیت سے تمام مسلمین کے برابر ہے اس کو صف میں سب کے برابر جگہ نہیں ملتی۔

کہاں مسجد میں وہ اگلے سے مسلم　　خدا کے نام کی خانہ پُری ہے

ماضی وحال کا موازنہ ہے۔

اگرچہ دعوے اسلام ہے مگر بالفعل　　سوا خدا کے ہمارا کوئی گواہ نہیں

غریب مسلمین واقعی شاہد حقیقی کے سوا اور کس کو اپنا گواہ پیش کر سکتے ہیں۔

اَصلیّت

شیخ کے حق میں اٹھا رکھا ہے کیا رندوں نے ظرف انھیں کا ہے کہ سب کچھ یہ پئے جاتے ہیں

برداشت کئے جاتے ہیں۔ شراب پئے جاتے ہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔

جو یاں ہی یہ ہے نظر تو خون ہے اور ترا جگر مرض ہے جس کو حرص کا کبھی اسے شفا نہیں

واقعی حریص آخر کار خود تباہ ہو جاتا ہے۔

دیکھیں پروانے کو دعوے پہ ابھرنے والے عشق اسے کہتے ہیں یوں مرتے ہیں مرنے والے

کہنے والے اور کرنے والے میں بڑا فرق ہے۔

ترکیب و تکلف لاکھ کرو فطرت نہیں چھپتی اے اکبرؔ

جو مٹی ہے وہ مٹی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے

مٹی پر بھی سونے کا پانی چڑھ جاتا ہے مگر کتنی نگاہیں دھوکا کھاتی ہیں اور پھر کتنے دنوں تک ؟

زوال جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے کہ دنیا کو بخوبی آدمی پہچان جاتا ہے

انسان "کھو کر سیکھتا ہے" اسی کی تشریح ہے۔

ہے بے اثر کیا نہیں جس نے فقط کہا اکبرؔ نے یہ کہا تو کہو کیا بُرا کہا

"اگر قائل عامل بھی ہو تو وزن قول بہت بڑھ جاتا ہے۔"

کیا دین کو قوت دیں یہ جواں جب حوصلہ افزا کوئی نہیں

کیا ہوش سنبھالیں یہ لڑکے خود اس نے سنبھلنا چھوڑ دیا

اقبال مساعد جب نہ رہا رکھے یہ قدم جس منزل میں

اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا

کلام پاک میں حضرت آدم کے گیہوں کھانے کی مفصل حکایت موجود ہے۔ ملاحظہ فرمایئے جب انھوں نے مالک کے مرضی کے خلاف گیہوں کھا لیا تو "اشجار سے سایہ دور ہوا چشموں نے اُبلنا چھوڑ دیا۔

نفس ہی کی خواہشوں کا ہے نفاذ رُوح نے مذہب کو ڈگری دی تو کیا

جب تک تہذیب نفس نہ ہو مذہب سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

آبرو دولت میں خود واعظ ہیں غرق — دوسروں پر نکتہ چینی کی تو کیا

ہمارے لیڈران قوم ذرا اپنے گریبان میں سر ڈال کر دیکھیں۔

بظاہر تھا براق راہ عرفان — چو دم برداشتم لیڈر برآمد

"چو دم برداشتم" ایک لفظ بدل دینے سے تمام مفہوم بدل گیا۔

کوئی واعظ نہیں فطرت سے بلاغت میں سوا — مگر انسان میں کچھ فہم اشارات تو ہو

حقیقت یہی ہے کہ فطرت اور طبع انسانی سے بڑھ کر دوسرا کوئی رہبر اور مقرر نہیں ہو سکتا۔

نہ پھول اس پر کہ یہ اور وہ تجھے اچھا سمجھتا ہے — تو اپنے دل میں اپنے آپ کو کیسا سمجھتا ہے

KNOW THYSELF خود اپنی حقیقت معلوم کرو اگر عالم کی نگاہوں میں تم نہایت اچھے ہو اور خود اپنی نگاہوں میں بُرے ہو تو ہرگز اچھے نہیں ہو سکتے۔

مدحت گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند — خوب کہنا اور ہے اور خوب ہونا اور ہے

ظاہر اور باطن کا فرق اس سے زیادہ اچھے پیرایہ میں نہیں دکھایا جا سکتا۔

دنیا کی طوالت بے حد ہے خلقت کا تو لمبا قصّہ ہے
ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصّہ ہے

اگر انسان اس امر پر غور کرے تو بہت سے فائدے، صبر و قناعت و کوشش کے حاصل ہو سکتے ہیں۔

جب خوب کیا کا کوئی موقعہ نہ نکالا — پھر کیا جو ہوئی دھوم فقط خوب کہی کی

علم و عمل کا فرق قابل غور ہے۔

ہے وہی دیوار میں مٹی بگولے میں جو ہے — نیو کے پنجے میں وہ ہے یہ ہوا کے ہاتھ میں

کاش یہ شعر صائب کے کانوں تک پہنچ جاتا۔ نیو اور دیوار کا فرق لائق دید ہے۔

الفاظ کی شوکت و نزاکت پہ نہ جاؤ — قائل کو قول کے اثر میں دیکھو

اگر نہایت عمدہ بات موثر طریقہ سے سادہ لفظوں میں بیان ہو جائے تو وہ اس مسجع اور مرصع عبارت سے ہزار گنا بہتر ہے جو بے اثر ہو۔

دعا کو بھی وہ کبھی ہے اٹھتا سے ہے دن رات صرف چکر
خدا کی قدرت کے کارخانے میں ہاتھ بھی ہے مشین بھی ہے

فطری اور مصنوعی اشیار میں جو فرق ہے وہ اس شعر سے ظاہر ہے۔

دل کو غفلت نے کدورت میں چھپا رکھا ہے — بخل نے زر کو تہِ خاک دبا رکھا ہے

کیا عمدہ مثال ہے۔ لفظوں میں تصویر کشی اسی کو کہتے ہیں۔

سنئے حکمت جو میری گفتار میں ہے — اک حد ادب ہر ایک سرکار میں ہے

پروانہ سے شمع نے لپٹنا چاہا — پہلے تھا نور میں پر اب نار میں ہے

" ایاز قدر خود بہ شناس " کو عاشقانہ رنگ میں لاکر مضمون میں نئی روح پھونک دی۔ حد سے زیادہ بڑھنے میں جو خرابیاں ہیں وہ بھی بیّن طریقہ سے بتادی گئی ہیں۔

کہا کسی نے یہ سیّد سے آپ اے حضرت — نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں

نہ آپ عالم برزخ[۱] سے مانگتے ہیں مدد — نہ فاتحے کے طریق ادا کو مانتے ہیں

نظر تو کیجئے اس بات پر جو ہیں ہندو — بہ صد خلوص ہر اک دیوتا کو مانتے ہیں

بہت وہ ہیں جو عناصر پرست ہیں دل سے — وہ آگ پوجتے ہیں یا ہوا کو مانتے ہیں

کرشچین بھی فدائی ہیں نام مریم کے — بہ دل مسیح علیہ الثنا کو مانتے ہیں

خود آپ ہی میں جو ہیں شیعیان با تمکین — وہ اہل بیت کو آل عبا کو مانتے ہیں

وہ لوگ جو ہیں ملقب بہ صوفیائے کرام — فدا قبور پہ ہیں اولیا کو مانتے ہیں

مرادیں مانگتے ہیں لوگ پاک روحوں سے — کسی بزرگ کو یا مقتدا کو مانتے ہیں

پھر آپ میں یہ ہوا کیا سما گئی ہے کہ آپ — نہ دستگیر نہ مشکل کشا کو مانتے ہیں

جواب انھوں نے دیا ہم ہیں پیرو قرآں — ادب ہر اک کا ہے لیکن خدا کو مانتے ہیں

اسی کا نام زبان پر ہے حیّ اور قیّوم — اسی کی قدرت بے انتہا کو مانتے ہیں

یہ بوئے شرک ہی ہے جنگ و اختلاف کی جڑ — تو عقلمند کب ایسی بلا کو مانتے ہیں

جواب حضرت سیّد کا خوب ہے اکبر — ہم ان کے قول درست و بجا کو مانتے ہیں

ولیکن اس نئی تہذیب کے بزرگ اکثر — خدا کو اور نہ طریق دعا کو مانتے ہیں

زبانی کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں — وہ صرف قوت فرماں روا کو مانتے ہیں

---

[۱] موت اور حشر کا روحانی عالم۔

ظاہر پرستوں کی انتہا ہو چکی ہے لوگ اُصول مذہب سے بیگانہ ہو کر فروع کی بھول بھلیاں میں کھو گئے ہیں اس نظم میں خود اکبر کے معتقدات سید صاحب کی زبانی صاف صاف بیان کئے گئے ہیں۔

دل پرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا
اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہنچا

اس کے دربار تک پہنچنے کے لئے سوز باطن ہی درکار ہے۔

چمن سے بے ہوا کے کاروان بو نہیں چلتا
لطیف الطبع ساتھی چاہیئے فیاض طینت کا

کتنی اچھوتی اور لطیف بات پیدا کی ہے۔

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو اُبھارے
اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہوں گا

اس کا اندازہ وہ خوب کر سکتے ہیں جو محاسب اور اقتصادی ہیں۔

کم بضاعت کو جو اک ذرہ بھی ہو جائے نصیب
خود نمائی کو وہ اڑ چلتا ہے جگنو کی طرح

جگنو میں کیا ہے نور کا محض ایک ذرہ ہے۔

گذشتہ آں قدر یاراں زحد سید اے اکبر
کہ آں مرحوم اکنوں در شمار شیخ می آمد

محض سید و شیخ کے الفاظ کا لطف دکھانا مقصود ہے۔

فلاسفی کو ہے مرغوب طبع الا اللہ
طریق سنٹیفک کو ہے لا الہ پسند

لفظی نزاع کو چھوڑ کر حکیمانہ اور فلسفیانہ طریق میں کوئی فرق نہیں ہے۔

رہا رسول کا درجہ سو وہ تو ہے قانون
کرے حریف اسے ناپسند خواہ پسند

درجہ رسالت کا اعتقاد مسلم کے لئے ناگزیر ہے۔

اب اس کے آگے ہے جو کچھ گروہ بندی ہے
ہر اک کو اپنی ہی نسبت ہے واہ واہ پسند

واقعی اگر ہر فرقہ دوسرے فرقہ کی نگاہ سے اپنے آپ کو دیکھے تو خود نمائی، خود فروشی، خود پسندی اور خود ستائی کے سوا اور کچھ نہیں۔

اے برہمن کہوں گا ہر بحر کو میں مائی
موقوف کچھ نہیں ہے گنگا و نربدا پر

اگر محض امواج آب آور وجہ تقدس ہیں تو گنگا و نربدا کی کوئی خصوصیت باقی نہیں رہتی دوسرے یہ کہ وسعت نظری کا سبق دیا گیا ہے۔

کیا جانئے سید تھے حق آگاہ کہاں تک
سمجھے نہ کہ سیدھی ہے مری راہ کہاں تک

حد سے گذر جانے کی خرابی دوسری شان سے دکھائی گئی ہے۔

یہاں کی عورتوں کو علم کی پروا نہیں بے شک مگر یہ شوہروں سے اپنے بے پروا نہیں ہوتیں

غلط تعلیم نسواں یقیناً بیوی کو شوہر سے ایک بڑی حد تک بے نیاز کر دیتی ہے واقعات عالم شاہد ہیں۔

بحثیں فضول تھیں یہ کھلا حال دیر میں افسوس عمر کٹ گئی لفظوں کے پھیر میں

دنیا کے بہت سے اختلاف محض لفظی ہیں اور کچھ نہیں۔

مغرب ایسا ہی رہا اور رہے اگر مشرق یہی ایک دن دیکھیں گے ہفت اقلیم ان کے ہاتھ میں

اگر مغرب کی ترقی اور مشرق کا تنزل یوں ہی ہے تو یقیناً کچھ دنوں میں سارا مشرق غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا نظر آئے گا۔

دید نرگس سے چمن میں لطف اٹھاؤ بے خطر لیکن اس چشم فسوں انگیز سے ڈرتے رہو

احتیاط اور دور اندیشی سے کبھی غافل نہ ہونا چاہئے۔ نرگس اور چشم فسوں انگیز میں وجہ شبہ نہایت لطیف ہے۔

اکبر دعا کا ذوق ہو کیوں کر نصیب دل اٹھے نہ درد دل بھی جو دست دعا کے ساتھ

جب تک دل سے دعا نہ کی جائے بے لطف و بے اثر رہتی ہے۔

نہیں ہاتھ آتی دولت نام رٹنے سے بزرگوں کے ہجا سے جد کے ترکیب زبرجد ہو نہیں سکتی

"پدرم سلطان بود مرا چہ" کو جد و زبرجد کے نکتہ سے نہایت بلند کر دیا ہے۔

نہایت خوشنما پتھر پڑے ہیں عقل پران کے جنھیں تسکیں بے لعل و زمرد ہو نہیں سکتی

"خوشنما پتھر" کی تعریف ناممکن ہے۔ تضحیک وطعن کا سبق لوگوں کو اکبر سے سیکھنا چاہئے۔

یہ بات تو اچھی ہے کہ الفت ہوسوں سے حوران کو سمجھتے ہیں قیامت ہے تو یہ ہے

وہی حدوں والی بات تیسرے طریقہ سے بیان کی گئی ہے۔

کیا شک ہے آفتاب کے شان و جلال میں روشن تر اس سے کون سی شے ہے خیال میں

لیکن نہیں وہ کچھ بھی موثر پس از غروب لازم ہے غور کیجئے اس مسئلے پہ خوب

ہر چند تم خیال کرو آفتاب کا گوشہ بھی اٹھ سکے گا نہ شب کی نقاب کا

پوجوگے اس کو تب بھی وہ پھیرا نہ جائے گا اس کو پکارنے سے اندھیرا نہ جائے گا

انسان کا حال بھی میرے نزدیک ہے یہی
تحقیق کی نظر جو کرو ٹھیک ہے یہی

کتنا ہی کوئی صاحب اوج و کمال ہو
کتنا ہی باثر ہو کہ عالی خیال ہو

جب کر گیا جہاں سے وہ ملک عدم کو کوچ
پھر اس سے کچھ مدد کا تصور ہے ہیچ و پوچ

قیوم و حیّ ذات ہے اللہ کی فقط
زندہ ہمیشہ بات ہے اللہ کی فقط

سن لو کہ اتباع و ادب اور چیز ہے
مطلب کی لیکن ان سے طلب اور چیز ہے

آزردہ کوئی شیخ ہو یا برہمن خفا
حقانیت یہی ہے یہی ٹھیک فلسفا

سید صاحب والی نظم "نہ پیر کو نہ کسی پیشوا کو مانتے ہیں" کو اس نظم سے ملا کر پڑھئے تو لطف آجائے بعض نکات جو اس سلسلہ میں بیان ہونے سے رہ گئے تھے وہ نہایت عمدگی سے ایک نئے پیرایہ میں بیان کر دیئے گئے ہیں۔

کہتے ہیں مغلوب ہے اکبر خیال خور سے
کہدو یہ بہتر ہے جھوٹے بسکٹوں کے چور سے

جو ایک موہوم ہستی بھی سہی پھر بھی دوسروں کے اُگلے ہوئے لقموں سے بہتر ضرور ہے۔

ہندو و مسلم ایک ہیں دونوں
یعنی یہ دونوں ایشیائی ہیں

ہم وطن ہم زبان و ہم قسمت
کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں

اتحاد ہندو مسلم کی تحریک کے لئے ان الفاظ سے زیادہ موثر الفاظ نہیں مل سکتے۔

شمع سے تشبیہ پا سکتے ہیں یہ عیاش امیر
رات بھر پگھلا کریں دن بھر رہیں بالائے طاق

ہندوستان کے بہت سے راجہ اور نوابین کی سچی حالت کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔

نام خدا کو اکثر زیب زبان تو پایا
عشق بتاں کو لیکن نقش قلوب دیکھا

اوروں پہ معترض تھے لیکن جو آنکھ کھولی
اپنے ہی دل کو ہم نے گنج عیوب دیکھا

انسان میں اگر ظاہر و باطن کا فرق کرنے کی قابلیت آجائے اور نفس شناسی کی صلاحیت پیدا ہو جائے تو بے جا اعتراضات کا بہت بڑا حصہ دنیا سے غائب ہو جائے۔

جو دیکھی ہسٹری[۱] اس بات پر کامل یقین آیا
اسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

اس واسطے کہ شہید، غازی، بہادر اور دنیا کے زبردست لوگ مر کر زندہ جاوید ہوئے ہیں۔

---

[۱] ہسٹری = تاریخ۔

کیا کہیں اوروں کو یہ ایسے ہیں وہ ایسے ہیں سچ جو پوچھو تو ہمیں کون بہت اچھے ہیں

ہم میں عیب جوئی کی خراب عادت بہت ہے جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم کو اپنی اچھائی کا خیال ہر وقت دامنگیر رہتا ہے۔

گئے برہمن کے پاس لے کر جو اپنے جھگڑے کو شیعہ و سنی
بگڑ کے بولا کہ جاؤ بھاگو ملکش[۵۱] تم بھی ملکش وہ بھی

آپس میں شیعہ و سُنّی لڑا کریں مگر شخص ثالث کے سامنے واقعی دونوں کی حیثیت ایک سی ہے اگر دونوں ایک ساتھ ہو کر عمدہ راستوں پر گامزن ہوں تو یہ خرابی جا سکتی ہے۔

بڑھی جو تکرار تو وہ لے کر انھیں فرنگی کے پاس پہنچا
وہ بولا بس دُور ہو یہاں سے کہ تم بھی نیٹو ہو وہ بھی نیٹو

اور دوسرا شعر بھی غور سے ملاحظہ فرمائیے۔

فلک نے آخر ہر اک کی سُن کر کہا کہ تم سب ہو مست غفلت
سمجھ لو اس کو تم بھی فانی ہو وہ بھی فانی ہے یہ بھی فانی

جو خیال ان مصرعوں میں ادا کیا گیا ہے وہ محض شاعرانہ نہیں ایک ایک حرف اصلیت سے بھرا ہوا ہے۔

جو ایرشپ[۵۲] پر چڑھے تو ایسے کہ بس ہمیں ہیں خدا نہیں ہے
جو ایرشپ سے گرے تو ایسے کہ لاش کا بھی پتا نہیں ہے

انقلاب کی تصویر سے حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

رقبہ تمھارے گانوں کا میلوں ہوا تو کیا رقبہ تمھارے دل کا تو دو انچ بھی نہیں

انسان کو دل کا دھنی ہونا چاہیئے ورنہ ساری دولت بیکار ہے۔

دانے کو ہے حق نشو و نما اس سے تو نہیں انکار مجھے
لیکن یہ تو بتاؤ مجھ کو ذرا وہ کھیت میں ہے یا پیٹ میں ہے

ہر ترقی کے لئے موقعہ و محل ہوتا ہے۔ آپ ہی انصاف فرمائیے اگر دانہ پیٹ میں اپنا حق نشو و نما استعمال کرے تو آپ کی کیا درگت ہو جائے۔ دوسرا پہلو یہ نکلتا ہے کہ حقوق اور آزادی کی بھی حدیں ہوتی ہیں

---

۵۱ ملکش ۔ نجس ۔ ۵۲ ہوائی جہاز

انقلاب زمانہ

نہ کرو صاحب نسب نامے وہ وقت آیا ہے اب　　بے اثر ہو گی شرافت مال دیکھا جائے گا

اس شعر کی توضیح کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، واقعی دولت کے سامنے حسب ونسب کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

وہ مطرب اور وہ ساز وہ گانا بدل گیا　　نیندیں بدل گئیں وہ زمانہ بدل گیا

زمانہ کی کروٹ کو کیسے اچھوتے لفظوں میں بیان کیا ہے۔

نغمہ سنجی سے تو آتی تھی خواتین کو شرم　　ساز مغرب سے مگر ہو گئی اب ناچ کی دھن

جنھیں سرود پسند نہ تھا وہ اب رقص میں نظر آتے ہیں یہ انقلاب نہیں ہے تو کیا ہے؟

اکبر ہمارے عہد کا اللہ رے انقلاب　　گویا وہ آسماں نہیں وہ زمیں نہیں

دوسرا مصرعہ کمال شاعری ہے۔

ختم کیا صبا نے رقص فصل بہار ہو چکی　　جوش نشاط ہو چکا صوت ہزار ہو چکی

نیک و بد زمانہ کو دیکھ کے گل نے راہ لی　　لطف نسیم ہو چکا کاوش خار ہو چکی

رنگ بنفشہ مٹ گیا سنبل تر نہیں رہا　　صحن چمن میں زینت نقش و نگار ہو چکی

مستی لالہ اب کہاں اس کا پیالہ اب کہاں　　دور طرب گذر گیا آمد یار ہو چکی

رُت وہ جو تھی بدل گئی آئی بس اور نکل گئی　　تھی جو ہوا میں نکہت مشک تتار ہو چکی

ابتک اسی روش پہ ہے اکبر مست و بےخبر　　کہدے کوئی عزیز من فصل بہار ہو چکی

فطرت کا قاعدہ ہے کہ فیض تقابل اور حسن موازنہ سے چیزوں کی اصلی حالت نظر آتی ہے موجودہ حالت کی بے رنگی دکھانے کے لئے ماضی کی دلفریب تصویریں جس عمدگی سے کھینچی ہیں اس کا پتہ صرف اس سے چلتا ہے کہ بار بار پڑھنے میں لطف ترنم اور کیف اثر بڑھتا جاتا ہے۔

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملک عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائینگے حسیں اپنی　　نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی پردے کی یہ پابندی　　نہ گھونگھٹ اسطرح سے حاجب روئے صنم ہوں گے

بدل جائے گا انداز طبائع دور گردوں سے — نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسباب غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریک ہوا تبدیل موسم کی — کھلیں گے اور ہی گل زمزمے بلبل کے کم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیم ملّت سے — نیا کعبہ بنے گا مغربی پُتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلید یورپ کے — مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی — لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا — ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

یہ بالکل سچ ہے کہ شاعر کی نگاہ نہ صرف ماضی و حال کے تمام کنہ تک پہنچتی بلکہ باکمال جوتش اور قابل منجم کی طرح آنے والے زمانہ میں بھی بہت دور تک جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ شاعر کا کلام عالمگیر ہوتا ہے اور ہزاروں برس گذر جانے کے بعد بھی دلوں پر اس کا اثر بہت زیادہ ہوا کرتا ہے۔ اکبر کی کچھ پیشین گوئیاں اصلاحات و انقلابات افغان میں پوری ہو چکی ہیں۔ مقطع سے پہلے کا شعر آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

لباس، آرائش، مصر و ترکستان و افغانستان وغیرہ۔

روحانیت کے بدلے آنکھوں میں خاک اب ہے — اس میں وہی ذہی تھا اس میں ہمیں ہمیں ہے

وہ ہوا نہ رہی وہ چمن نہ رہا وہ گلی نہ رہی وہ حسین نہ رہے
وہ فلک نہ رہا وہ سماں نہ رہا وہ مکاں نہ رہے وہ مکیں نہ رہے

وہ تھا اک وقت جب سیر چمن میں پھول چنتے تھے — زمانہ ایک یہ ہے خاک اڑاتے ہیں بیابان کی

یہ طفل ناداں غریق غفلت ہوائے ذلت میں تن رہے ہیں
سمجھ نہیں ہے نظر نہیں ہے بنائے جاتے ہیں بن رہے ہیں
بہار ہی سے نہیں ہیں واقف خزاں کے ظلموں کو کیا وہ سمجھیں
یہ داغ تو ہیں انھیں کے دل پر جو محو رنگ چمن رہے ہیں

اے ترا خار بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست — حال شیرانے کہ شمشیر بلا بر سر خورند

نیا فلک ہے نئے ستارے یہ شوق سے کرتے ہیں نظارے
انھیں کو کچھ حس ہے گردشوں کا جو زیر چرخ کہن رہے ہیں
بہت خفا تھے مسائل دیں کہ ہو رہی ہے ہماری توہیں
اب ان کو منطق سنا رہی ہے وہ سر جھکائے ہیں سن رہے ہیں

کیا تصویر کھینچی ہے۔

عشرتِ گھر کی محبت کا مزا بھول گئے
کھا کے لندن کی ہوا عہد وفا بھول گئے

پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروانہ رہی
کیک کو چکھ کے سیویوں کا مزا بھول گئے

موم کی پتلیوں پر ایسی طبیعت پگھلی
چمن ہند کی پریوں کی ادا بھول گئے

کیسے کیسے دل نازک کو دکھایا تم نے
خبر فیصلہ روز جزا بھول گئے

بحث ہے اہل وطن سے جو وفا میں تم کو
کیا بزرگوں کی وہ سب جود و عطا بھول گئے

نقل مغرب کی ترنگ آئی تمھارے دل میں
اور یہ نکتہ کہ میری اصل ہے کیا بھول گئے

کیا تعجب ہے جو لڑکوں نے بھلایا گھر کو
جبکہ بوڑھے روش دین خدا بھول گئے

اکبر کبھی ہندوستان سے باہر نہیں نکلے مگر اعجاز تخیل دیکھئے لندن کی لائف کا ایسا جیتا جاگتا فوٹو کھینچا ہے کہ مشاہدہ عینی کا دھوکا ہوتا ہے لطف یہ ہے زجر و توبیخ کا لب و لہجہ اتنا ملائم اور دل نشین ہے کہ پڑھنے والے کو پتہ بھی نہیں چلتا اور الفاظ اپنا کام کرتے جاتے ہیں۔

چکر آیا اک ایسا جھولا جھولے
قومی عزت کی ہسٹری کو بھولے

ہم کو تو اپنی ذات کے سامنے نہ قوم کا خیال ہے اور نہ خود اپنی ہی تہذیب نفس کی طرف توجہ ہے ایک ذرا سی مادی ترقی ہوئی اور ہم پھولے نہیں سماتے۔

عزیزان وطن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس[۱]
چرٹ اور چار کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

سامان مدارت بھی بدل گئے۔ [۱] نوٹس = اطلاع۔

اللہ رے انقلاب طرز و مذاق مشرق
حافظ کے شعر کیسے سب پڑھ رہے ہیں ریڈ

لیلیٰ کا ناز رخصت اسکول مسٹرس ہیں
سودائے قیس غائب اب وہ بنے ہیں لیڈ

تصویر مضحکہ آمیز ضرور ہے مگر نصیحت خیز بھی ہے۔

تسبیح وہ اب کہاں وہ تہلیل کہاں ۔۔۔ قرآن مجید کی وہ ترتیل کہاں
کل کے آگے خیال فردا کس کو ۔۔۔ جب ریل ہے سامنے تو جبرئیل کہاں

نہ اب وہ طشت زریں ہیں نہ وہ چاندی کے کلسے ہیں
کمیٹی خوان نعمت ہے فقط لفظوں کے جلسے ہیں

اب کہاں دست جنوں تار گریباں اب کہاں ۔۔۔ پانیر در دست مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کنسرٹ میں ٹھیکہ دودھ کا ۔۔۔ ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی

صرف مشرقی شاعری نہیں مشرقی رنگ محبت بھی بدل گیا ہے۔

نظروں میں بسا ہے رنگ چمن آنکھیں وہی گلشن ڈھونڈھتی ہیں
موسم وہ نہیں ہے اے اکبر جو بات تھی کل وہ آج کہاں

نہیں اب شیخ صاحب کی وہ عادت ۔۔۔ وضو کی اور مناجات سحر کی
مگر ہاں چائے پیکر حسب دستور ۔۔۔ تلاوت کرتے ہیں وہ پانیر کی

کتنے مناسب لفظوں میں تلاوت قرآن کی ترغیب کی ہے اور بتایا ہے کہ صبح کا تھوڑا وقت ہم اس میں صرف کریں تو نہایت عمدہ بات ہے۔

رنگ ہی کچھ اور اب تو روز شب کا ہو گیا ۔۔۔ جس طرف دیکھو دگرگوں حال سب کا ہو گیا
اس تغیر سے مگر اس پر نہیں پہنچا ضرر ۔۔۔ انقلاب آیا بھی اکبر پر تو رب کا ہو گیا

لفظ اکبر کو الٹ دیجیے "رب کا" ہو جاتا ہے۔

بزم ہستی میں مرے پیش نظر کیا کچھ نہ تھا ۔۔۔ دیکھتے ہی دیکھتے لیکن جو دیکھا کچھ نہ تھا
بیک لحظہ بیک ساعت بیک دم ۔۔۔ دگرگوں می شود احوال عالم

پنجۂ شیخ سے نکلے تو پریشان ہیں اب ۔۔۔ ٹوٹی تسبیح کے دانے یہ مسلمان ہیں اب

انتشار مسلمین کی تصویر اس سے زیادہ موثر اور مکمل کھینچی ہی نہیں جا سکتی۔

رہ گئے کم عربی شعر سمجھنے والے ۔۔۔ چل بسے گیسوئے لیلیٰ میں الجھنے والے
اک دن وہ تھا کہ دب گئے تھے لوگ دین سے ۔۔۔ اک دن یہ ہے کہ دین دبا ہے مشین سے
جدامجد خود میں کرتے تھے یہ موسم بسر ۔۔۔ ہم کو اپنے عہد میں پالا پڑا کنٹوپ سے

ذرا اخلاف اور اسلاف کی شجاعت کا اندازہ کیجیے۔

جہاں نے ساز بدلا ساز نے نغموں کی گت بدلی — گتوں نے رنگ بدلا رنگ نے یاروں کی مت بدلی
فلک نے دور بدلا دور نے انساں کو بدلا — گئے ہم تم بدل قانون بدلا سلطنت بدلی

تم نے جو سنا صحیح ہے ہاں صاحب — عربی سے گریز کرتے ہیں خانصاحب
سچ کہتے ہیں وہ کہ ہم کو اس سے کیا کام — ہیں کمپ میں ہم تو خانساماں صاحب

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے — کہنے لگے اس سے تیرا مطلب کیا ہے

الہی تیری پناہ مذہب اب محض ایک لفظ بے معنی ہے جس کی ہم کو روزانہ زندگی میں کوئی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

وہ اک دن تھا میاں کو عار تھا صاحب بھی بننے میں — پڑا اب سایۂ مغرب تو بی بی بھی بنیں آیا
اس انقلاب پر جو میں روؤں تو ہے بجا — مجھ کو وطن میں اب کوئی پہچانتا نہیں

بظاہر اس شعر میں محض حسن بیان معلوم ہوتا ہے مگر پہچاننا کی بلاغت پر غور کیجیے تو حقیقت معلوم ہو۔ انتہائے انقلاب ہے کہ وطن والے جانتے ضرور ہیں مگر پہچانتے نہیں۔

زمان حال میں اگلے فسانے امر ماضی ہیں — جو تلواریں چلاتے تھے وہ اب ٹھوکر پہ راضی ہیں
خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا — کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی
افسوس ہے گلشن کو خزاں لوٹ رہی ہے — شاخ گل تر سوکھ کے اب ٹوٹ رہی ہے
اس قوم سے وہ عادت دیرینۂ طاعت — بالکل نہیں چھوٹی ہے مگر چھوٹ رہی ہے
وہ راہ شریعت کہ جہاں بجھتی تھیں آنکھیں — یہ کفر کے کنکر سے اسے کوٹ رہی ہے

ہیں وطن سے حزین وملول پھرا نہ وہ بزم ملی نہ وہ یار سلے
گل ولالہ وسرو کا ذکر کجا وہ چمن ہی نہ تھا وہ ہوا ہی نہ تھی

کہوں یہ رندان ایشیا سے کہ بزم عشرت کے ٹھاٹھ بدلیں
اُڑن کھٹولا ہے اب مسوں کا گئی پری جان کی وہ ڈولی

ہم محض تخت سلیمان اور اڑن کھٹولے کے قصے لے کر بیٹھے ہیں اور یورپ والے صناعیوں سے طیارے بنا بنا کر حقیقتاً اوج فضا میں اڑاتے پھرتے ہیں۔

جو گذرو گے ادھر سے میرا اُجڑا گانوں دیکھو گے　　شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے

ہندوستان کے بہت سے قدیم اور مقدس مقامات کی سچی تصویر اس شعر کے پڑھتے ہی آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں　　ینگ بدھو وارث اسلام ہیں

گردش گردوں کے آگے کس کا زور　　کون دم مارے خدا کے کام ہیں

اولڈ مرزا: پرانی روش کے باوضع با مذہب بزرگان قوم۔ ینگ بدھو: نوجوان بدھو۔

فروغ دل اب نہیں ہے باقی وہ سوز و ساز اس میں اب کہاں ہے

یہ آہ و فریاد ہے جو لب پر بجھی ہوئی شمع کا دھواں ہے

ہماری فریادوں کا اثر کیوں نہیں ہوتا؟ شکوۂ اقبال صدائے صحرا ہو کر کیوں رہ گیا؟ اس کے اسباب جو کچھ ہوں سوز و ساز بھی شامل وجوہ ضرور ہے۔

دور قرآن و تجارت ہو چکا　　اب زمینداری ہے یا تنخواہ ہے

دل میں اب نور خدا کے دن گئے　　ہڈیوں میں فاسفورس دیکھئے

سو برس کے بعد مردہ ہڈیوں میں ایک خاص روشنی پیدا ہو جاتی ہے جس پر اکثر مسافروں کو ویرانوں میں بھوت شیطان کا دھوکا ہوتا ہے۔

بے ثباتی دنیا

زبان خلق پر بس اک فسانۂ وفا رہا
نہ ہم رہے نہ دل رہا نہ دل کا مدعا رہا
نئے بنائے ساز عیش چرخ نے سدا مگر
فنا کی دھن پہ مستقل جہان بے بقا رہا
ہم کو زیر آسماں ہو کر گزرنا ہی پڑا
منزل ہستی پہ لٹنے کو ٹھیرنا ہی پڑا

ہماری زندگی ناگزیر ہے۔

یہ سست ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا
نیٹو جو ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا
نہ وہ بک رہ گئے نہ سرسید
دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذات محمود سے تسلی تھی
لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ
اے حریصان شان و شوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود
رہ گیا لا الہ الا اللہ

جسٹس محمود سر سید احمد کے لڑکے۔

فنا اسی رنگ پر ہے قائم فلک وہی چال چل رہا ہے
شکستہ و منتشر ہے وہ کل جو آج سانچے میں ڈھل رہا ہے

دنیا کی تمام مصنوعات اور ایجادات کا یہی رنگ ہے کہ باہمی اجزا کے ملنے سے ایک نئی صورت پیدا ہوتی ہے اور بکھرنے سے ایک دوسری شکل ہو جاتی ہے۔

یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرور غفلت سے کل تھا مملو
یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے، نظر ہو جس کی وسیع دیکھے
ابھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں یہ قُلزم ابل رہا ہے

دنیا کے لئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آپ ایک طرف
اب شہر خموشاں عالم ہو مٹی ہے لحد کا کونا ہے
ہے کاماہی کاما جو پڑھا دہر کا نامہ
جز موت کہیں اس میں فل اسٹاپ نہیں ہے

کاما ایک نشان ہے جہاں ذرا سا رکنا پڑتا ہے فل اسٹاپ COMA (،) FULISTOP (۔)

انگریزی تحریر کا وہ نشان ہے جو ختم جملہ پر ہوتا ہے اور جہاں بالکل رک جانا پڑتا ہے پوری سانس لے کر آگے بڑھنا ہوتا ہے۔

مٹ گئے نقش و نگار دیر فانی کے مرید — نام انھیں کا رہ گیا روشن جو ہر کو جپ گئے
پوچھتا کوئی دم مرگ سکندر اکبر — کتنے دن کی یہ تعلی تھی کہ دارا نہ رہا
منتشر ذروں کو یکجائی کا جوش آیا تو کیا — چار دن کے واسطے مٹی کو ہوش آیا تو کیا
عارضی ہیں موسم گل کی یہ ساری مستیاں — لالۂ گلشن میں اگر ساغر بدوش آیا تو کیا
دور آخر بزم دنیا کا ہے جام خون دل — عیش اس محفل میں بنکر بادہ نوش آیا تو کیا
حد حیرت ہی میں رکھا ضعف نے ادراک کو — پیکر خاکی کو اس عالم میں ہوش آیا تو کیا

بظاہر ہم کو ہوش آیا مگر ہم پر اسرار عالم میں سے ایک سر بھی نہیں کھلا۔

بزم دنیا میں کہاں سامان حشمت کو ثبات — گم ہوئی مہر سلیماںؑ جام جم جاتا رہا

مہر سلیماں۔ حضرت سلیمانؑ کی انگوٹھی جس کی وجہ سے وہ سارے عالم پر حکمراں تھے اور تمامی مخلوق کی زبانیں سمجھتے تھے۔

جام جم۔ فارس کے شہنشاہ جمشید کا ساغر ہے جس میں تمام دنیا کا حال معلوم ہوتا تھا۔

دو روزہ زندگی ہے جاہ و حشمت پر نہ ہو غافل — فریدوں ہے نہ کیخسرو سکندر ہے نہ دارا ہے
لوگ کہتے ہیں یہاں اکبر کبھی آباد تھا — شاید ایسا ہی ہوا اب تو خاک کا اک ڈھیر ہے
میں مست بادۂ عبرت ہوا ہوں اس تصور سے — کہ دو ذرے بھی اب اک جا نہیں ہیں ساغر جم کے

جمشید اور اس کے جام "جہاں نما" کی مٹی ایسی برباد ہوئی کہ دو ذرے بھی اکٹھا نہیں ہیں۔

اس بزم میں کیا آثار ملے ہنگام سحر سامانوں کے
اک داغ تھا شمع مردہ کا کچھ پر تھے پڑے پروانوں کے
ہستی کی یہ لہریں دام نظر دم بھر میں نشان ان کا نہ اثر
گرداب فنا میں غرق ہیں اب دریا ہیں رواں افسانوں کے
دل لذت نفس کا گرویدہ دنیا کی حقیقت پوشیدہ
امڈے ہیں فریب امیدوں کے طوفاں ہیں بپا ارمانوں کے

ہر گام پہ ہیں قبروں کے نشاں ہر سمت ہے اک عبرت کا سماں
اُجڑا ہے محل آبادی کا آباد ہیں گھر ویرانوں کے

غالبؔ کا مشہور قطعہ اس کے ساتھ پڑھیئے تو لطف آئے۔

اے تازہ وارداں بساط ہوائے دل — زنہار اگر تمھیں ہوس نائے نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو — میری سنو جو گوش حقیقت نیوش ہے
کل شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط — دامان باغبان وکف گل فروش ہے
یا صبح دم جو دیکھیے آکر تو بزم میں — نے وہ سرور وسوز نہ جوش وخروش ہے
داغ تپ فراق کی شب بھر جلی ہوئی — اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

اکبرؔ نے یقیناً غالبؔ سے اچھی زمین موسیقی و جذبات کے اعتبار سے پسند کی ہے۔

گل برگد تھا جن کا راتی — ان کی قبر پر پھول نہ پاتی
عبرت یہ ہے دوہا گاتی — ستر پوت بہتر ناتی

(جس راون کے دیا نہ باتی) کیسی سلاست اور صفائی ہے۔

ذرے ہیں چند جن کو صنعت اُبھارتی ہے — اک خاک عبرت آگیں لیکن پکارتی ہے
اس انجمن میں ہم بھی اک رات جل چکے ہیں — تم شمع بن رہے ہو اور ہم پگل چکے ہیں

شمع کی تعبیر میں جو راز بربادی مضمر ہے اس کو کتنی خوبی سے بیان کیا ہے اور نوجوانان ناواقف کو برسہا برس کا تجربہ ذاتی کس اسلوب سے بتادیا ہے۔

پردہ
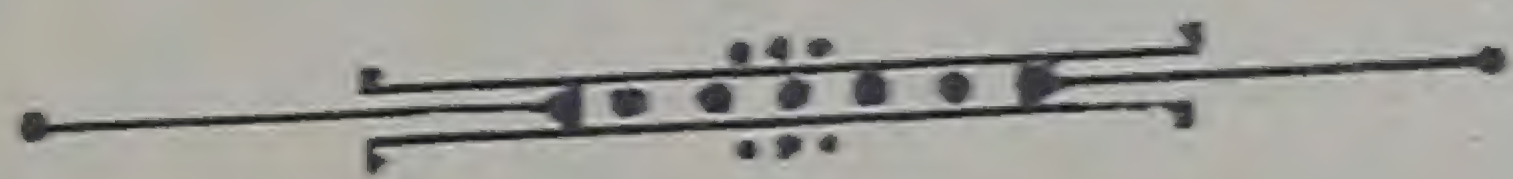
بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں ——— اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا ——— کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مرحوم کی یہ رباعی سلاست بیان اور اختصار لطیف کی بدولت اس قدر مقبول ہوئی کہ اکثر اخبار و رسائل میں چھپتی رہی۔ بات ہے اور چبھتی ہوئی، ظرافت ہے اور سنجیدہ، اکبرؔ اگر قادرالکلام نہ ہوتے تو پہلے مصرعہ میں "بی بیاں" کا انتخاب ذرا مشکل تھا۔ سطحی نظر رکھنے والوں کے نزدیک "عورتیں" بھی اتنا ہی معنی خیز ہوتا جتنا کہ "بی بیاں" ہے، مصرعہ بھی درست ہوتا تقطیع بھی نہ بگڑتی، وزن میں بھی پاسنگ کا فرق نہ ہوتا، مگر معنی میں حقیقتاً زمین اور آسمان کا فرق ہو جاتا، "عورتیں" ایک عام کلمہ ہے جس کو مذہب و ملت سے کوئی خاص نسبت نہیں انگریزی ہو یا فرانسیسی، جاپانی ہو یا ہندوستانی، لیکن اُردو کی زبان اور روزمرہ کے لحاظ سے "بی بی" کا لفظ اس خاص طبقہ لطیف تک محدود ہے جس کی طرز معاشرت دوسری ہمسایہ قوموں سے ممتاز ہے اور جن کے اصول زندگی میں پردہ بھی ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے، اسی لئے اکبرؔ نے "بی بیاں" کہہ کر اپنے تخاطب کو ممیز کر دیا، "قومی" کی خصوصیت بھی نہایت نازک ہے۔ شاعر کے نزدیک خود غرضی ایک زبردست گناہ ہے، اگر اس ہوش رُبا نظارہ کا اثر صرف اکبرؔ ہی تک محدود رہتا تو "غیرت فطری" سے کام چل جاتا، لیکن دردِ اسلام اور اخوت قومی نے ایسا غلبہ کیا کہ موصوف نے اپنے محسوسات سے قطع نظر کرتے ہوئے "غیرت قومی" کا اقرار فوراً ہی فرما دیا، ممکن ہے کہ بعض لوگ "دردِ اسلام" پر معترض ہوں، ان کو معلوم ہونا چاہئے کہ پردہ اسلام کی ایجاد ہے اور اسلام ہی کے لئے مخصوص ہے۔ "وہ" کا لفظ بھی نہایت با محل ہے، اس ایک لفظ نے بہت سے الفاظ کی تشریح کر دی ہے، ورنہ اتنا ضروری ہوتا کہ وہ پردہ جس پر آپ کو ناز تھا کیا ہوا؟ چوتھا مصرعہ حاضر جوابی اور شوخی گفتار کی تصویر ہے، الفاظ اس قدر سجل ہیں گویا عورتوں کی زبان کی لطافت و متانت ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو، انداز تقریر سے کھسیانے پن اور جھنجھلاہٹ

کی شان بھی صاف ظاہر ہے۔

کس نماند است کہ در بیشہ شکارے بکند | تیغ گیر د بکف و فتح دیارے بکند
این زماں ہمت مرداں بہمیں محدود است | زنے از پردہ برون آید و کارے بکند

پہلے مصرعہ میں اسلام کی داستان پارینہ کا ذکر ہے۔ اس زمانے کی یاد دلائی جا رہی ہے جب ہمارے لئے شیر کا شکار تلوار یا بھالے سے اتنا ہی آسان تھا جتنا آجکل کے مرد حضرات کو سیف قلم سے کبھی شیر ادب کو ٹوک دینا سہل ہو گیا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں ملت بیضا کی معراج کی وہ زبردست تصویر کھینچی گئی ہے جب افریقہ و عجم، اسپین اور حلب کی دیواریں ہمارے معرکوں سے کانپ کانپ جاتی تھیں، ہم اُس وقت مرد تھے، غلام نہ تھے حاکم تھے، بزدل نہ تھے، شرم دلانے کے لئے اکبر نے کس قدر موثر پیرایہ اختیار کیا ہے، کیا اسلاف فاتح کا ذکر اخلاف مفتوح کے لئے قابل عبرت نہیں ہے؟ تیسرا مصرعہ اس ٹھاٹھ سے لگایا گیا ہے کہ چول سے چول بیٹھ گئی ہے۔ انقلاب کا پورا مرقع "این زماں" میں ملفوف کر دیا ہے۔ چوتھے مصرعہ میں "مرے" کو "زنے" اور "غیب" کو "پردہ" بدل کر وہ لطف پیدا کر دیا ہے کہ وتد و سبب کی میزان میں بھی کوئی کمی و زیادتی نہیں ہوئی۔ ظرافت کا دریا بھی موجزن ہو گیا اور واقعہ کی شان بھی ظاہر ہو گئی۔

دلکش نہیں وہ حسیں جسے شرم نہیں | رونق نہیں اس کی جس کا دل گرم نہیں
سختی میں بھی ہو گداز طینت ہو جو صاف | پگھلی ہے برف گو کہ وہ نرم نہیں

ہماری زندگی کے عام واقعات پہلے مصرعہ کی دلیل کامل ہیں "شرم" یا "احساس شرم" ہی وہ چیز ہے جو صحت و شباب کی گہری سُرخی بن کر حُسن کی رگوں میں دوڑ جاتی ہے، ورنہ حُسن کی دیوی بھی "یونانی مجسمہ مرمریں" یا "بہزاد کی تصویر ساکت" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی، دوسرے مصرعہ میں شمع کی تشبیہہ پنہاں کس قدر نفیس ہے۔ کیا اس سے کسی اہل دل کو انکار ہو سکتا ہے کہ شمع سرد کبھی رونق محفل نہیں بن سکتی۔ اسی مصرعہ میں حسن کے ساتھ بھی جو تشبیہہ ہے وہ اس قابل ہے کہ موتیوں میں تولی جائے۔ اگر آپ حقیقتاً "گرم دل" کا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں تو ذرا اس کی ضد کی تصویر کھینچ لیجئے۔ ایک چاند کا ٹکڑا انگاروں کے سامنے ہے:

لیکن اُس کا دل اس قدر سرد ہو چکا ہے کہ جذبات و محسوسات کا گہرا اثر بھی سکوت حسن میں کوئی بیداری کوئی زندگی پیدا نہیں کر سکتا۔ فرمائیے! اب آپ کو گرم دل والے حسین کی قدر معلوم ہوئی؟ تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں ندرت بیان اور جدت خیال کے بہترین جواہر موجود ہیں، لیکن سب کا تعلق پردہ سے کیا ہے، اس کا جواب "شرم" اور "سختی" سے مانگئے۔

غیرت کی حرم میں پاسبانی نہ رہی	وہ شوکت وشان زندگانی نہ رہی
اسلام میں اب وہ لن ترانی نہ رہی	پردہ اُٹھا تو کھل گیا اے اکبر

پہلے دو مصرعوں میں ان جذبات مسلم کی صحیح ترجمانی ہے جن کے ماتحت پردہ 'امر اسلامی' کی منزل عالی سے نیچا ہو کر رسم وضرورت کی زنجیروں میں گرفتار ہو گیا ہے، حقیقتاً بیشتر پردہ پرست حضرات پردہ کی اسلامی عظمت وقدر اور اپنی فطری غیرت سے بے خبر ہیں۔ تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں حضرت کلیم اللہ جناب موسیٰؑ کے واقعۂ طور کی طرف مودب و موثر اور عبرت آمیز اشارہ ہے۔ کاش اُردو کے کم نظر شاعر ادب وتمیز کا خیال رکھیں اور جناب کلیم کا ذکر و تخاطب بے تکلفی سے نہ فرمایا کریں۔

بڑی مایوسیوں کے ساتھ اکثر کام چلتا ہے	غلط فہمی بہت ہے عالم الفاظ میں اکبر
مگر کہتی ہے خلقت شمع سے پروانہ جلتا ہے	یہ روشن ہے کہ پروانہ ہے اس کا عاشق صادق

غلط فہمی کے دو وجوہ ہیں۔ ایک تو یہ ہماری زبان میں ہر جذبہ یا ہر محسوس کے لئے جداگانہ الفاظ نہیں ہیں، دوسرے خود الفاظ کا صرف بھی بعض وقت کئی کئی معانی کا حامل ہوتا ہے، شمع اور پروانہ کی نسبت سے لفظ روشن کا انتخاب کس قدر مناسب اور موزوں ہے، پردہ کی بعض برکات جو سبب واثر کے ماتحت ہیں میں اُن کی تشریح حوالۂ ناظرین کرتا ہوں تاکہ کوئی غلط فہمی نہ واقع ہو۔

ذیل کے چند اشعار مرحوم کی ایک نظم سے منتخب ہیں۔ اکبرؔ نے سوداؔ کی طرح واعظ کو مخاطب کر کے پردہ کی چند خوبیوں کا اظہار نہایت دلکش پیرایہ میں فرمایا ہے، زمین بھی وہی ہے، ردیف بھی وہی ہے صرف قافیوں کا فرق ہے۔ سوداؔ کا یہ مصرعہ "دکھلا کے سبز باغ عذاب وثواب کا"

شاعری کے نقطۂ نظر سے نہایت حسین ہے۔ اکبر کا طرز بیان مخصوص لطف و خوبی سے لبریز ہے سودا کا نفس مفہوم صرف "مجبوری مے نوشی" اور "تاثرات حسن" تک محدود ہے۔ یہاں اخلاقی تعلیم اور بے پردگی کی بے تکلفی کا مرقع کھینچا گیا ہے۔

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی ۔۔۔ کمسن بتوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا
نوخیز دلفریب گل اندام نازنین ۔۔۔ عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا
رکئے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسین ۔۔۔ دل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا

امیر کے گھر کی خصوصیت اس لئے ہے کہ سرور و لطف کی تمام باتیں موجود ہوں "ذکر الفت" مغربی تہذیب میں داخل ہے، چوتھے مصرعہ کی نزاکت ملاحظہ فرمایئے۔ نقاب تو کجا دامن نگاہ کا بار بھی ناگوار "رکئے" کو ذرا ڈوب کر دیکھئے۔ چھٹے مصرعہ میں انگریز نژادوں کی مخصوص اردو موجود ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب کچھ کہہ گئے مگر متانت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا، اس کے خلاف سودا کا یہ مصرعہ " دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا"
کس قدر گرا ہوا ہے۔

بٹھائی جائیں گی پردہ میں بی بیاں کب تک ۔۔۔ بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

اس شعر میں ہماری نسلوں کی تدریجی تنزل کا بہترین فوٹو موجود ہے۔

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی ۔۔۔ تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

ذرا تواریخ اسلام کی ورق گردانی فرمایئے، اور اس کے بعد موجودہ مسلمین خصوصاً ہندستان کے مسلمانوں کی حالت دیکھئے "تیغ" اور "تیلی" جو فرق ہے وہی ہمارے اسلاف میں اور ہم میں ہے۔

طبیعتوں کا نمو ہے ہوائے مغرب میں ۔۔۔ یہ غیرتیں یہ حرارت یہ گرمیاں کب تک
عوام باندھ لیں دوہر کو تھرڈ وانٹر میں ۔۔۔ سکنڈ و فرسٹ کی ہوں بند کھڑکیاں کب تک

واقعہ یہ ہے کہ تعلیم یافتہ خواتین میں ایسی فردیں بھی موجود ہیں جو حالت سفر میں پردہ کی اہمیت کو ضروری نہیں سمجھتیں اس لئے کہ مسافروں کی نگاہیں کچھ بہی مانوس شناسا نہیں ہوتیں خصوصاً ایسی حالت میں جب سکنڈ اور فرسٹ میں ٹھاٹھ کے ساتھ سفر ہوتا ہو، اس واقعہ کے

علاوہ اُس خاص فرق کا اظہار بھی نہایت عمدگی سے ہے جو غربا اور امرا نئی روشنی اور پرانی روشنی والوں میں ہے۔

جو منھ دکھائی کی رسموں پہ ہے مصر ابلیس　　چھپیں گی حضرت حوّا کی بیٹیاں کب تک

"ابلیس" سے جن لوگوں کا تخاطب ہے وہ بھی پردہ کی بات ہے، خود ہی سمجھئے اور لطف اُٹھایئے۔ "حضرت حوّا" کی تخصیص بھی نہایت نازک ہے، بیٹیوں کی مناسبت سے بھی اور اس لئے بھی کہ شیطان نے پہلے حضرت حوّا ہی کو بہکایا تھا اور انھیں نے جناب آدم کو کمال اصرار پُر اسرار سے گیہوں کھلا دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنّت کا ذرّہ ذرّہ ان محترم ہستیوں سے پرہیز کرنے لگا اور ہزار ہا خرابیاں واقع ہوئیں۔ یہ شعر پوری ایک کتاب ہے، اس میں ابلیس فطرت حضرات کی چالاکیاں، صنف لطیف کی کمزوریاں اور ضدی طبیعتوں کی اصلیت اور نتائج پردہ دری کا کچا چٹھا سب کچھ موجود ہے۔

جناب حضرت اکبؔر ہیں حامیٔ پردہ　　مگر وہ کب تک اور ان کی رباعیاں کب تک

"جناب حضرت" کی ترکیب محض جمعیت مترادفات نہیں ہے ورنہ ایک کی موجودگی میں دوسرے کا عدم اختصار حسین ہوتا، بلکہ حضرت اکبرؔ میں خطاب شوخ ہے جو پردہ در حضرات کی طرف سے آپ کو عطا ہوا تھا۔ دوسرے مصرعہ میں فنا کا ذکر ہے اور نہایت لطیف، خدا کے واسطے کہیں یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ مرحوم کے انتقال کے ساتھ ہی ساتھ ان کی رباعیاں بھی ختم ہوگئیں، یہ بات نہیں ہے اس لئے کہ فنائے مادہ کے ساتھ فنائے رُوح لازم نہیں مطلب صرف اتنا ہے کہ تلوّن طبع جمہور کے نزدیک حضرت اکبرؔ اور اُن کی رباعیوں کا یہ اثر جو اَب ہے کم ہوتا جائے گا۔

پردہ اُٹھ جانے سے اخلاقی ترقی قوم کی　　جو سمجھتے ہیں یقیناً عقل سے فارغ ہیں وہ
سن چکا ہوں میں کہ کچھ بوڑھے بھی ہیں اسمیں شریک　　یہ اگر سچ ہے تو بے شک پیر نابالغ ہیں وہ

اس معمورۂ عالم میں جو قومیں سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جاتی ہیں اُن کی تمام ترقیاں صرف "مادیات" ہی تک منحصر ہیں۔ اخلاقی ترقی دیکھنا ہو تو ذیل کی کتابیں دیکھئے۔

"اسرار دربار لندن" ۱۴ جلد۔ "اسرار لندن" ۱۲ جلد "اسرار دربار فرانس" ۸ جلد

"اسرار فرانس" ۶ جلد ۔ وغیرہ وغیرہ ۔

تمھیں دھوکہ میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے وہاں سایہ حکومت کا ہے یا غربت کا پردہ ہے
فاتح اور مفتوح کا فرق ہماری روزانہ زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں ہے ، ہم بے بس ہیں ، وہ صاحب اختیار ہیں "سایہ" کا لفظ کس قدر جامع ہے ۔

پردہ کا کیا ہے خود اڑنگا پیدا خود ہم نے کیا اِزار و اَنگا پیدا
کیا خوب کہا ہے مولوی مہدی نے فطرت نے کیا ہے ہم کو ننگا پیدا

یہ رُباعی ان لوگوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہے جو "پردہ دری" کی دلیل میں "فطری آزادی" کو پیش فرماتے ہیں ۔ حضرات ! ہر چیز میں حدیں ہوتی ہیں ، واقعی جب فطری آزادی ہی مدنظر ہے تو اِزار و انگا کی کیا ضرورت ، سب کے سب ننگے ہو جایئے اور رہئے ، آہاہا ، کیا اچھی دنیا ہو جائے گی ۔

پردہ میں ضرور ہے طوالت بے حد انصاف پسند کو نہیں چاہئے ہٹ
تشبیہ بری نہیں اگر میں یہ کہوں بیگم تو ہے پیچواں لیڈی سگریٹ

واقعی کس قدر زبردست تشبیہ ہے ۔ پیچوان بیگم کے حصول و صرف میں جو طوالتیں اور لیڈی سگریٹ کے استعمال میں جو سہولتیں ہیں وہ صاف ظاہر ہیں ۔ نے درست کیجئے ، پانی تازہ کیجئے ، حقہ کا پانی بدلئے ، چلم پر تمبا کو جما کر آگ رکھیئے ، سانس اور پانی میں قلقل کی موسیقی پیدا کیجئے ، دم ہونے کا انتظار فرمایئے ، جب پیجئے اور لیڈی سگریٹ کو ڈبہ سے ایک منٹ میں نکال کر جھٹ سے سلگایئے اور شغل شروع فرما دیجئے ۔ لیکن شعر کا لطیف ترین پہلو ملاحظہ فرمایئے ، جو لوگ تمباکش ہیں وہ خوب جانتے ہیں کہ پانی سے دُھل کر آنے والے دھوئیں میں کس قدر سبکی و لطافت ، لذت و فرحت شامل ہوتی ہے اور کاغذ دار تمباکو کا دھواں کتنا تیز و مضر ہوتا ہے ، اور آگے چلئے ، طبی اُصول سے دونوں کے اثرات میں نہایت درجہ فرق ہے ۔

نظر میں تیرگی ہے اور رگوں میں ناتوانی ہے ضرورت کیا ہے پردے کی جہاں بیبے کا پانی ہے

بد قسمت ہندوستان ، غلام ہندوستان کے نوجوان طبقہ کی حالت قابل رحم ہے ، اکثر

ایسے ہیں کہ جوانی سے پہلے ہی جوانی کی حدیں ختم کر چکے ہیں اور روزانہ صدہا خودکشیاں عمل میں آتی رہتی ہیں، واقعی ان لوگوں کے لئے پردہ کا عدم و وجود دونوں برابر ہیں۔

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے ۔۔۔ خدمت میں وہ ہے لیزی اور ناچنے کو ریڈی
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر ۔۔۔ شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

ذرا نگاہ عبرت سے جہالت کے پردے اٹھا کر بزم رقص کی سیر کیجئے اور "بی بی" کی تفریق مزاجی کو دور تک سوچئے۔

ہر چند کہ ہے مس کالونڈر بھی بہت خوب ۔۔۔ بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن ۔۔۔ اُس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ذرا شان امتیازی ملاحظہ فرمایئے، جتنا ہی سوچئے گا اتنا ہی پردے اُٹھتے جائیں گے۔

نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ ۔۔۔ شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

قوم کے تنزل کا اس سے بہتر نقشہ کھینچا نہیں جا سکتا، دوسرے مصرعہ کا اثر دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھیے۔

سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات ۔۔۔ میاں بدلے تو بی بی کیوں نہ بدلیں

ظرافت سے قطع نظر کرتے ہوئے بھی واقعہ یہ ہے کہ ہم اخلاقی کمزوریوں کے طفیل اس قدر بدلتے رہتے ہیں کہ اگر بیویاں بھی بدل جائیں تو انتقام جائز سے زیادہ کوئی بات نہ ہو گی۔

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں ۔۔۔ حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
لطف آزادی کی دل میں بڑھ گئی ہے چاشنی ۔۔۔ اب تو شیشہ میں اترنے کی نہیں یہ جیلیاں
اپنے ہاتھوں اپنے سانچے کا کریں گی بند و بست ۔۔۔ یہ نہیں وہ گڑ کہ تم اُن کی بناؤ بھیلیاں

قافیوں کی خوبی ایسی ہے کہ بار بار دُہرانے کو جی چاہتا ہے، زبان ایسی پیاری ہے کہ چاشنی دار جیلی کا لطف قوت ذائقہ کو بیتاب کئے دیتا ہے، محاوروں کی بندش تمام عیوب سے پاک ہے۔

آنکھیں ساقی کی تھیں رسیلی ۔۔۔ اب تک میں بچا تھا آج پی لی

پھاڑے مغرب نقاب نسواں　　　مشرق نے تو آنکھ اپنی سی لی

"آج پی لی" کی مجبوریاں صاف ظاہر کرتی ہیں کہ اگر متواتر و پیہم مواقع ملتے رہیں تو صادق و خالص دل بھی شباب بے حجاب کی کیفیت سے فطری طور پر کبھی نہ کبھی لذت اندوز ہو ہی جائیں گے آخر کے دونوں مصرعوں میں مغرب اور مشرق دو لفظوں کو زندہ مردہ سمجھ کر دیکھئے۔ کیسا عبرت خیز نظارہ ہے، حضرت مغرب پوری بے دردیوں کے ساتھ پردہ دری فرما رہے ہیں اور جناب مشرق ایسے بے حس ہیں گویا دیکھتے ہی نہیں۔

حجاب تمکنت کو دُور کرتا ہے زبیدہ سے　　　سوا اس کے جو باتیں ہیں فقط اک پردہ پوشی ہے

بعض اعتدال پسند حضرات کا خیال یہ ہے کہ ہندوستان میں پردہ قائم رکھا جائے لیکن اس کی سخت گرہیں اُس حد تک ڈھیلی کر دی جائیں جتنی فارس و عرب میں ہیں۔ میں ان حضرات سے ادب کے ساتھ ملتمس ہوں کہ اکبر کے اس شعر کو نگاہ میں رکھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہاں ہر گھرانے کی عورت بازار جاکر تمام ضروریات زندگی کی خرید و فروخت کرتی ہے۔ حمام و مجالس میں بھی آزادانہ جاتی ہے، لیکن ہندوستان میں یہ آزادی ابھی دو سو برس تک مضر ثابت ہوگی، اس واسطے کہ وہاں کے معیار اخلاق و مراسم و طرز معاشرت میں نہایت درجہ صلاحیت ہے، وہاں اگر اتفاقاً کسی شخص کی نگاہ کسی حسین چہرہ پر ایک بار پڑ جاتی ہے تو وہ شخص دوبارہ اُس برقعہ پوش عورت کی طرف نہیں دیکھتا اور اس کو حسب السن اپنی ماں یا بہن یا لڑکی کے برابر سمجھتا ہے، لیکن یہاں کی گلیوں میں اگر کوئی عورت برقعہ پوش نظر آوے تو آوارہ مزاج، بد طینت، شوخ وضع حضرات کی پوری جماعت ہر ممکن دغابازی کے لئے مستعد ہو جاتی ہے بعض عامیانہ پھبتیاں کستے ہیں، بعض راستہ بہکاتے ہیں، بعض تعاقب کرتے ہیں اور بعض ظلم و تعدی سے کام لیتے ہیں۔

پردہ کے متعلق خود اکبر کے خیالات

ذیل کے اقتباسات خود اس قدر مسلسل اور واضح ہیں کہ مزید توضیح کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

اقتباسات خطوط بنام حسن نظامی صاحب۔ خطوط اکبر۔ صفحہ ۱۰۹۔ ۸ اگست ۱۹۱۸ء

"بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں، پوچھتی ہیں بی اکرم صاحبہ کہ یہ بی بیاں کہاں نظر آئیں۔ مولوی بشیر احمد صاحب ایڈیٹر البشیر سے پوچھیں، وہی بمبئی گئے تھے۔ کسی جلسہ میں عورتوں کے اعضا ظاہر ہوئے، شوخیاں ظاہر ہوئیں اسی مضمون کو دیکھکر میں نے یہ قطعہ کہا تھا"

صفحہ ۱۰۹۔ ۹ اگست ۱۹۱۸ء

"کلیات کے دوسرے حصّہ میں ایک ظریفانہ نظم ہے اس میں تو بے پردگی کا دعوے بیان کیا ہے آپ نے نہ دیکھی ہو تو دیکھئے ؎

لڑکیاں بول اُٹھیں خود بہ طریق تائید کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید

وغیرہ وغیرہ۔ اس نظم پر نسواں کو نظر کرنا چاہیئے۔

صفحات ۱۰۹ و ۱۱۰

معلوم نہیں پرانی نظموں کو تہذیب نسواں صاحب کیوں لے بیٹھے سب کو معلوم ہے کہ سر سید احمد خاں مرحوم نہ صرف پردے کے حامی تھے بلکہ لڑکیوں کے سرکاری اسکول میں جانے اور جدید کورس پڑھنے کے مخالف تھے۔

میری نظموں کا اثر ہی کیا ہو سکتا ہے۔ لڑکیاں اسکول میں جانے لگیں پردہ بھی شدہ شدہ جاتا رہے گا۔ میں نے اس بات کو بھی کہدیا ہے حصہ دوئم میں دیکھئے۔ ۳۰۔ ۴۰ کا اندازہ کیا ہے (اگر یہی دور رہے)۔

نصرت الاخبار دہلی نے تو ابھی ایک رسالہ حمایت پردہ میں شائع کیا ہے۔ قریباً تمام عالم اس وقت تک پردے کا حامی ہے۔ میری کیا تخصیص ہے اگر میں اس بات میں سخت ہوں تو

اس سے کیا ہوتا ہے۔

میں نے تو کچھ جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ .... تہذیب نسواں کے اعتراض سے یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ پردے کی ضرورت سے تو وہ بھی انکار نہیں کرتے۔ .... اگر بعض خواتین کو کچھ زیادہ ضرورت آزادی کی محسوس ہو تو عام طریقہ کو اس سے کیا تعلق؟

صفحہ ۱۱۱ ۱۲ اگست ۱۹۱۸ء

"........ میری نظمیں تو مدت کی ہیں اس وقت کون سی نئی بات ہوئی کہ یہ اعتراض شروع کیا گیا .... مجھ کو تو شبہ ہوتا ہے کہ بہت دور سے یہ جراءت دلائی گئی ہے، یورپ کی کمیٹیاں تعلیم و تہذیب نسواں پر بڑا زور دے رہی ہیں چونکہ پردہ توڑنا مقصود ہے لہٰذا یہ بنیاد قائم کی گئی ہے ـــــ بعض دوست تو شاید اس ڈر سے چُپ ہو جائیں کہ بیگمات سے ڈاڑھی کون نچوائے۔ اگرچہ خواہر مذکر بھی اس پردے میں ہوں، میں نے تو ان کو لکھدیا ہے کہ یہ نظم انقلاب روکنے کو نہیں ہے یادگار انقلاب ہے۔ .... بات یہ ہے کہ میری نظم کی شہرت مغربی مجالس تک پہنچ چکی ہے میں نشانہ بنایا گیا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ ساری قوم سُنے اور پردہ شکنی پر تیار ہو جائے بتدریج (اگر یہی لیل و نہار ہیں) سب کچھ ہوگا۔ مردوں کا احساس بھی بدل چلا ہے بدل جائے گا۔ اس وقت کچھ ہرج بھی نہیں ہے

صفحات ۱۱۲ و ۱۱۳

.... اگر پردہ قائم ہے اس کی پابندی ہے اور میں نے خلاف واقع بے پردگی کی شکایت کی ہے تو یہی کہنا چاہئے کہ الزام غلط اور خلاف واقع ہے یہ کیا شکایت کہ پردے کے باب میں مَیں بہت سخت ہوں اور اس سے ترقی میں خلل پڑتا ہے۔ اگر یہ شکایت ہے تو یہ نہیں ظاہر ہوتا کہ کس چیز کی ترقی میں خلل پڑتا ہے، تعلیم میں یا پبلک سے ملنے میں اور کہاں تک آزادی کی اجازت مانگی جاتی ہے۔

.... اس بحث سے تمام شرفا کو تعلق ہے، میں نے غالباً (تمام) پہلو اپنے اشعار میں دکھا دیئے ہیں۔ لیکن اشعار یکجا نہیں ہیں۔ میرے دیوان سے کبھی تمام اشعار اسی بحث کے

متعلق یکجا کر لیجئے۔ لیکن میں یہ بھی کہتا ہوں کہ اظہار خیالات میں مَیں نے مُدبّرانہ رنگ نہیں اختیار کیا بلکہ شاعرانہ ؎

نظم پردہ کا ہے غصہ اکبرِ رنجور پر — حاشیہ اچھا چڑھایا سورۂ والنّور پر

ایک اور شعر ہے ؎

نصیحت میں نے پردہ کی لکھی ہے خوش مزاجی سے
وہ کیوں دلوا رہے ہیں مجھ کو گالی اپنی باجی سے

..... زمانہ بر سر انقلاب ہے ...... ہم کیا ہمارے دعوے کیا قانون قدرت ہم کو مٹانے ہی پر مائل ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں ...... ہم کو اپنے مذاق مذہبی اور رسمی کی حمایت کی اگرچہ آزادی ملی ہے لیکن ترقی اور اطمینانی حالت سر دست انھیں کی ہے اور وہی روشنضمیر سمجھے جاتے ہیں جو ایسے مذاق اور اُن رسوم و عادات کے دشمن اور مخالف ہیں —— ہم کو میاں بی بی سے بحث ہے نہ کہ لیڈی جنٹلمین سے مسلمات سے مطلب ہے نہ کہ نئی تُتلیوں سے۔

صفحہ ۱۱۴ — ۲۵ اگست ۱۹۱۸ء

"میں تو آصف جہاں صاحبہ سے صلح کرنے پر آمادہ ہوں کہ جب تک آپ کا شباب ہے میں اپنی نظموں کو واپس لیتا ہوں۔"

صفحہ ۱۱۵ — ۲۹ اگست ۱۹۱۸ء

اب لوگ ان اشعار پر بھی ہنسیں گے ؎

مدح اکبر میں ہر اک نے قوم میں — کچھ زیادہ خواہ تھوڑا کہہ دیا
ہاں مگر آصف جہاں نے بے گناہ — اُن کو دَر پردہ نگوڑا کہہ دیا

صفحات ۱۱۵ لغایت ۱۱۸ — ۳۱ اگست ۱۹۱۸ء

"راشد الخیری صاحب کو میرا سلام پہنچایئے اور کہئے کہ مدعی سست گواہ چست کی بات نہیں ہے۔

ساری قوم مدعی ہے گواہ اللہ ہے قرآن ہے سورۂ نور ہے سورۂ احزاب ہے بیشمار۔ مدعیوں میں سے ایک مدعی کو جو شاعر ہے اگر کسی بیگم نے اپنی شوخی سے ڈھیلا کر دیا تو مقدمہ

خراب نہیں ہو سکتا ـــــ میرا طرز بیان مدعیانہ یا واعظانہ نہیں رہا اگرچہ مقصود یہی ہے لیکن اسلوب کلام شاعرانہ ہے ـــــ مجھ کو یاد نہیں کہ میں نے تہذیب نسواں کو کیا لکھا لیکن جو کچھ کیا میں نے اپنی نظمیں واپس نہیں لیں۔ وہ ملک میں اور کانوں میں گونج رہی ہیں لیکن یاد رکھیے کہ نظموں کی داد ایک طرف اور نئی تعلیم نسواں جو درپردہ ہو رہی ہے (اگر یہی لیل و نہار ہیں) اس کا اثر ایک طرف...... تہذیب نسواں صاحب نے میرا ہی نام کیوں لیا، اور کہا کیوں بجز اس کے کہ قبول عام اور مرحبائے جن و ملک نے آتش حسد کسی سینے میں مشتعل کی۔ کسی عورت کے نام سے خواہ مخواہ نیش زنی کی گئی۔ میری نظم کی داد تو مجھ کو انگریزوں نے دی آزادی مفرط سے تو وہ پریشان ہیں ـــــ بہت خوشی سے بے تکلف حجت کیجئے ـــــ بحث بہت لطیف اور جنگ بہت لذیذ ہو گئی۔ مجھ کو بھی بذلہ سنجی کا موقع ملیگا ـــــ لیکن میں اپنے پوزیشن کے خلاف بھی سمجھتا ہوں کہ ان غیرت فروش پردہ نشینوں کی آویزش میں مبتلا ہوں۔ آویزش بے سود۔ کیونکہ ایک دن میں نہ کوئی انقلاب پیدا کر سکتا ہے نہ انقلاب کو روک سکتا ہے۔

ہندوستان بڑا ملک ہے حالتیں مختلف ہیں، سوشیل طبقات مختلف ہیں، ضرورتیں مختلف ہیں پولیٹکل تعلقات مختلف ہیں غریب کی بی بی ٹیکس دے کر سبکدوش ہو جاتی ہے خواص آنریبل کی بی بی کو بال اور پارٹی میں لیڈیوں سے ملنے اور اظہار آزادی کی تحریک ہوتی ہے۔

اُٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون سا حق   بے بلائے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
ترک پردہ یہ نہیں اس کے لئے میں نے کیا   صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

ایک بڑا دھوکا جو مغرب کی طرف سے دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عورتیں قید کی گئی ہیں۔ یہ غلط فہمی ہے۔ پردہ قید نہیں ہے بلکہ ان کو حق تمکنت دیا گیا ہے۔ اب یہ حق ان سے چھینا جاتا ہے...... ۵

شوخی مغربی کے خریدار ہیں بہت   گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکان کا

...... جب اعتراض کیا گیا تھا کہ قرآن نے چار کی اجازت کیوں دی، میں نے

ظرافتاً کہدیا کہ ؎
پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی پردہ نہ ہو تو ایک کی بھی احتیاج کیا
ـــــــ میں نے ہرگز سپر نہیں ڈالی مقصود یہ ہے کہ انقلاب نہیں رک سکتا.... ؎
نئے طریقوں سے مقصد شرع کارفرما نہ ہو سکے گا اِدھر جو پردہ نہ ہو سکے گا اُدھر بھی تقویٰ نہ ہو سکے گا

صفحات ۱۱۹ و ۱۲۰ و ۱۲۱ ۳ ستمبر ۱۹۱۸ء

.... عورتوں کی طبیعتیں رسموں کی ماتحت ہیں۔ مغرب کو بڑی فکر تعلیم نسواں کی ہے جس کا اثر خواہ مخواہ شوخی و بے حجابی ہے ـــــــ اللہ مالک ہے جو مناسب ہو گا کریگا اور کر رہا ہے۔

...... پردہ یہاں تمکنت کا نشان ہے۔ عورتوں کا حق ہے قید نہیں ہے ـــــــ جو دولتمند ہو گئے ان کی عورتیں پردہ نشین ہو گئیں۔ اس بات کو میں نے کسی نظم میں ظاہر کر دیا ہے۔

صفحہ ۱۲۱ ۴ ستمبر ۱۹۱۸ء

ـــــــ مسز عشرت لکھنے والی تھیں۔ پریانواں میں ناگہانی حادثہ پیش آیا۔ الزام لگایا گیا ہے کہ بے پردہ نظر آنا خلاف واقع کہا گیا ہے ـــــــ مجھ سے تو چشم دید گواہوں نے کہا ـــــــ دوسرے یہ کہ جو خطرات ساختہ و پرداختہ والی نظم میں ظاہر کئے گئے وہ بے اصل اور شرمناک ہیں اس کی تردید ہونا چاہئے ـــــــ ہاں تیسرا الزام یہ تھا کہ میں سختی کرتا ہوں۔ میں نے کہدیا کہ نہیں اس سبب سے نہیں کہ بے پردگی کے نتائج بد ظاہر ہوتے جاتے ہیں۔ یورپ خود آزاد ہونے سے نالاں ہے لہٰذا خواتین کو خود سمجھ آگئی، سختی کی کیا ضرورت ہے اگر ضرورت ہو تو لکھا جائے ورنہ حوالہ فطرت۔

صفحات ۱۲۲ و ۱۲۳ ۵ ستمبر ۱۹۱۸ء

میری نظموں نے پردے کے جذبات نہیں قائم کئے بلکہ قوم میں پردے کے جذبات سے میری نظمیں پیدا ہوئیں۔ قرآن ان کا موید تجربہ ان کا سفارشی ـــــــ

سنا ہے کہ تہذیب نسواں نے ایسی تمہید لکھی ہے گویا اُس نے فتح پائی۔ کوئی پوچھے کہ میں نے بے پردگی کی اجازت کب دی۔ حق شعر گوئی سے کب دست بردار ہوا تعلیم و آزادی

مغربی کی کب اجازت دی۔

——— بیگم صاحب بھوپال بھی پردے کی حمایت میں کچھ لکھ رہی ہیں لیکن سید سلیمان صاحب (ندوی) کہتے ہیں کہ بے پردگی غالب آئے گی۔

مجھ کو اپنی ایک نظم یاد آئی جو حال ہی کی ہے یعنی جب دسمبر گذشتہ میں سروجنی نائیڈو صاحبہ مجھ سے ملیں اس کے بعد کی ؎

ادھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں
ادھر خواتین خلوت آرا ہنوز مست اپنی فوج میں ہیں
مگر یہ قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک
کہ گبر و ترسا کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

صفحہ ۱۲۴ ۷ ستمبر ۱۹۱۸ء

ہاں بیگم صاحب نے آخر میں لڑکوں کو زندہ دفن کرنے کا جو ذکر کیا ہے اس پر کوئی کچھ لکھے کہ کیا تم نے (بیگم صاحب کی طرف اشارہ ہے) پردہ کو زندہ دفن ہونا سمجھا ہے یہ تو خدا نے تمھاری عزت بڑھانے اور تمھاری فضیلت کے لئے تم کو پردے کا حق دیا ہے کیا خوشی ہوگی کہ آیا کی طرح میموں کے پیچھے پھرو۔ اگر انقلاب مجبور کرے تو وہ صدمے کی بات ہوگی نہ کہ ترقی تہذیب کی اور پھر عورتوں کے مدارج ہیں۔

نوح

صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵ ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء

میرا یہ کہنا کہ انقلاب کو روک نہیں سکتا۔ یہ اشعار صرف یادگار انقلاب ہیں یہ معنی نہیں رکھتا کہ آصف جہاں صاحبہ کی دھمکی میں آگیا یا ڈر کے مارے اپنی رائے بدل دی میرے کلیات حصہ دوئم کو ذرا اٹھایئے صفحہ ۸۲ میں چوتھا شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

یہ پُرانا شعر ہے دیکھ لیا جائے کہ میری رائے یہی تھی اور ہے اور ہر سمجھدار آدمی اس سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوگا۔ صفحہ ۶۷ میں چودھواں شعر یہ ہے ؎

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہ محض شاعری اور ظرافت ہے .... یہ شہادت تو مقبول عام ہے

صفحہ ۱۷۵ ۹ ستمبر ۱۹۱۸ء

ہاں ایک بات تہذیب نسواں کی نسبت لکھنا بھول گیا۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ جو کرتے ہیں مرد کرتے ہیں عورتیں اُن کے تابع ہیں جواب دینا چاہیئے کہ تم نے سچ کہا لیکن یہ اشعار بھی مردوں ہی کی تنبیہ کرنے کے لئے لکھے گئے ہیں۔

آخر میں مصلح جلد ۱ نمبر ۵ مئی ۱۹۲۸ء صفحہ ۴ کا ایک جملہ لکھے بغیر نہیں رہا جاتا۔ کسی صاحب نے نہایت قابلیت سے " ہندوستانی پردہ کا کیا انجام ہوگا " کی سرخی سے ایک مضمون حوالہ قلم فرمایا۔ سلسلہ میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

" سید اکبر حسین صاحب مرحوم کا یہ مقولہ مجھے یاد ہے کہ غیر قوموں کی اندھی تقلید کرنا غبی ہونے کی قاطع دلیل ہے۔"

پردہ

کوئی موقع نکل آئے کہ بس آنکھیں مل جائیں
راہیں پھر آپ ہی کریں گی جوانی پیدا

راہ پر اُن کو لگالائے ہیں ہم باتوں میں
اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں

دل ہو وفا پسند نظر ہو حیا پسند
جس حُسن میں یہ وصف ہو وہ ہے خدا پسند

کہا جو اُس نے کہ اب میں پھروں گا بے پردہ
منہ اس کا دیکھ کے بس رہ گئے نقاب فروش

معلوم نہیں اکبر صاحب نے منہ کا لفظ کیوں پسند کیا حالانکہ اس سے زیادہ رخ سے روانی آتی تھی۔

گھر سے جب پڑھ لکھ کے نکلیں گی کنواری لڑکیاں
دلکش و آزاد و خوش رو ساختہ پرداختہ

یہ تو کیا معلوم کیا موقع عمل کے ہوں گے پیش
ہاں نگاہیں ہوں گی مائل اس طرف بے ساختہ

مغربی تہذیب آگے چل کے جو حالت دکھائے
ایک مدت تک رہیں گے نوجواں دل باختہ

اوج قومی سے شرافت کا ہُما گر جائے گا
ماکیاں سے پست تر دکھلائی دے گی فاختہ

ڈال دے گی سینۂ غیرت سپر میدان میں
تیغ ابرو ہی نظر آئے گی ہر سو باختہ

کھول کر در کو کہا اس بت اسکولی نے
جب نقاب اُٹھ گئی آگے سے تو چلمن بھی سہی

('کو' زائد ہے) یہ ترقی شاعر کی نگاہ میں فطری ہے۔

اکبر دبے نہیں کسی سلطان کی فوج سے
لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے
کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے

یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن
ازار بند کو کہہ دیں گے حبس بیجا ہے

بحر آزادی میں یہ کیسا تموج ہو گیا
"قاصرات الطرف[1]" کو شوق تبرج[2] ہو گیا

[1] نیچی نگاہ والیاں [2] اپنا سنگار دکھانا۔ قرآن کے الفاظ ہیں اور کس سلاست سے نظم ہوئے ہیں

مرد جنٹلمین ہو کر پا رہے ہیں جب عروج
بی بیاں پھر گھر میں رہ کر کس مپرسی کیوں سہیں

مطمئن رہیئے نہ رہ جائے گا عورت کا حجاب
چادر قومی کی آخر کھلتی جاتی ہیں تہیں

حفظ عظمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں
مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی

پردہ در کہتا ہے اب اس کی ضرورت ہی نہیں
میرزایانہ ادا تھی سلطنت کی بات بھی

خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

شمشیر زن کو اب نئے سانچے میں ڈھالئے
شمشیر کو چھپایئے زن کو نکالئے

کالج بنا عمارت فخر النسا بنی
شکر خدا کہ مل گئے آخر بنا بنی

بے پردگی کی ہو نہ یہ در پردہ اک بنا
جن کو یہ ڈر ہے ان کی تو جانوں پہ آبنی

لیکن نگاہ نبض شناسان وقت میں
امراض قوم کے لئے عمدہ دوا بنی

جب تک ہم میں ہے قومی خصلت باقی
بیشک پردے کی ہے ضرورت باقی

چالیس برس کی بات ہے یہ شاید
بعد اس کے رہے گی پھر نہ حجت باقی

چالیس برس کے بعد عام طور سے عورتیں خواہشات نفسانی سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

نہ یہ قید شریعت ہے نہ یہ غفلت کا پردہ ہے
رواج و مصلحت کی بات ہے حکمت کا پردہ ہے

تمھیں دھوکے میں ڈالا ہے مثال اہل یورپ نے
وہاں سایہ حکومت کا ہے یاں عزت کا پردہ ہے

دکھائی فلسفہ مغربی نے وہ مردمی
کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں کا

پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں
حوریں کالج میں پہنچ جائیں گی غلمان تو ہیں

پردہ در کی رائے سنکر بیبیاں کہنے لگیں
اب ہمارے وارث ایسے ہی نگوڑے رہ گئے

پردہ کا مخالف جو سنا بول اٹھیں بیگم
اللہ کی مار اس پہ علیگڈھ کے حوالے

دوسرا مصرعہ عورتوں کی زبان میں کس بے تکلفی سے نظم ہوا ہے۔

مذہب کا تو دم بھرتے ہیں بے پردہ بتوں کو کرتے ہیں
اسلام کا دعوے ایک طرف یہ کافرادائی ایک طرف

اسٹیج پہ دنیا کے کیا رنگ دکھاؤ گے
کیا لطف اٹھا پردہ درجے سے اگر گر کے

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اٹھ گیا تو وہ باہر نکل گئی

کسی خاص واقعہ کی طرف اشارہ نہیں ہے۔

تمکین اک نشان ہے عصمت کی آن کا
پردہ بس اک ظہور ہے عورت کی شان کا

پردہ تو ان کا حق ہے نہیں ان پہ جبر کچھ
آیا ہے ان پہ وقت یہ سخت امتحان کا

شوخی مغربی کے خریدار ہیں بہت
گاہک مگر خدا ہے حیا کی دکان کا

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بی بیاں نکلیں

ادھر جوانوں کو ہے یہ سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں
ادھر خواتین خلوت آرا ہنوز[۱] مست اپنی نوج میں ہیں
مگر یہ قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک
کہ گبر و ترسا کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی فوج میں ہیں

کس طرح پردے میں رہے اے شیخ عورت اک طرف
سارے خیالات اک طرف ملکی ضرورت اک طرف
مشرق کے واعظ اک طرف مغرب کی زینت اک طرف
عقلی دلیلیں اک طرف اور دل کی رغبت اک طرف

کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ بہت سے پردہ در محض نفس پرستی کی وجہ سے اس کی تحریک کر رہے ہیں۔

بحث میں آ ہی گیا فلسفۂ شرم و حجاب — زہرہ ممبر ہوئیں ووٹر تھے جناب خورشید
دبی آواز کہا بھی جو کسی نے کہ جناب — کچھ مناسب نہیں اس وقت میں ایسی تمہید
شیخ صاحب ہی کا ہے بزم میں کیا رعب و وقار — کہ خواتین کو پبلک میں ہو وقعت کی امید
نعرے تحقیر کے اس پر ہوئے یاروں میں بلند — لڑکیاں بول اٹھیں خود بطریق تائید
جب حکومت نہیں باقی تو یہ غمزے کیسے — کون کونے میں کرے بیٹھ کے مٹی کو پلید
تم نے شلوار کو پتلون سے بدلا اے شیخ — پھر مرے واسطے محرم رہے کیوں حبل ورید
خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دیئے دیتے ہو — ہم سے کہتے ہو کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید
لال جب خود ہی گینری کا ہوا ہے بندہ — تو یہ منیا رہے کیوں گوشۂ عزلت میں شہید
دولہ بھائی کی ہے یہ رائے نہایت عمدہ — ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید
در نظارہ مقفل رہے ہم پر کب تک — کیوں نہ غنچوں کے لئے باد صبا کی ہو کلید
اکبر افسردہ شد از گرمیٔ ایں طرز سخن — شیخ بگریخت و در صومعۂ خویش خزید
کھل گئے ورنہ رہا شاہد مشرق میں حجاب — غل مچا ہرّے کا بول اٹھے یہ مغرب کے مرید

[۱] خدا نہ کرے ایسا ہو۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست　　آخر آمد ز پس پردۂ تقدیر پدید

کس قدر لاجواب اور مرصع نظم ہے۔ اکبر کی شاہکار نظموں میں سے یہ بھی ایک ہے۔

فرض عورت پہ نہیں ہے چار دیواری کی قید　　ہو اگر ضبط نظر کی اور خودداری کی قید
ہاں مگر خودداری و ضبط نظر آساں نہیں　　منہ سے کہنا سہل ہے کرنا مگر آساں نہیں

قول و عمل میں واقعی نہایت درجہ فرق ہے جب ہماری تہذیب و تمدن و اخلاق کی سطح حقیقتاً بلند ہو جائے تو پردہ کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

تم میں وہ ضبط نظر اُن میں وہ خودداری کہاں　　رعب قومی مثل فاتح ملک پر طاری کہاں
اب رہی تعلیم کون اس امر کا مفتوں نہیں　　بی بیوں پر مغربی سانچا مگر موزوں نہیں

اکبر تعلیم نسواں کے مخالف نہ تھے طرز تعلیم کے مخالف ضرور تھے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں　　حجاب اس کو نہیں آتا انھیں غصہ نہیں آتا

غریب اکبر نے بحث پردہ کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا
نقاب الٹ ہی دی اس نے کہہ کر کرے گا کر ہی لے گا مرا مُوا کیا

نئے طریقوں سے مقصد شرع کار فرما نہ ہو سکے گا
اِدھر جو پردہ نہ ہو سکے گا اُدھر بھی تقوے نہ ہو سکے گا

کیا گذری جو اک پردے کے عدو رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی دولت بھی گئی بی بی بھی گئی زیور بھی گیا

مس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور ہم کہاں　　بوٹ کی چرچر میں کیا رکھا ہے یہ چھم چھم کہاں
مس یہ بولی پڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے　　اور ہی چالیں نظر آئیں گی یہ عالم کہاں

کتنا ہی ہو وقت بے حجابی　　تم پیروی حیا کیے جاؤ

کس قدر سادہ الفاظ میں کیسی ہمت افزا نصیحت ہے۔

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو　　پردہ اُٹھنا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تمھاری تعلیم کے مصالح جو چاہیں برسائیں ان پہ شوخی
میری نظر میں تو حسن یہ ہے کہ چشم خوباں سے شرم ٹپکے

خدا کی مار کا کرتا نہیں میں کچھ مذکور ‏ طبیعت اور ہی پہلو پہ جا کے لڑتی ہے
نہ رہ سکے گی لطافت جو زن ہے بے پردہ ‏ سبب یہ ہے کہ نگاہوں کی مار پڑتی ہے

کیا پردہ در حضرات چوتھے مصرعہ کی حقیقت سے انکار کر سکتے ہیں؟

بُت پرستی میں بھی پردے کا ہوں حامی اکبر ‏ بخش ہی دے گا خداوند خطا پوش مجھے
جنوں پردہ در ہے شائق رسوائی مجنوں ‏ عجب کیا ہے کہ اب لیلیٰ کو بھی وحشت ہو محمل سے
ضرورت کم ہے راہ عشق میں خضر ہدایت کی ‏ بہ قدر شوق سالک خود کشش ہوتی ہے محمل سے
حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی ‏ اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی
پردہ تے میاں ہم کو بنا رکھا ہے اب تک ‏ بگڑی ہوئی حالت ہے مگر بات بنی ہے

ہماری عزت، افلاس، بداخلاقی اور شرمناک حالت کا فوٹو ہے۔

اے بانوے خلوت نشیں تا کے بہ قید آں وایں ‏ از پردہ بیروں آو بیں ناز زنان لشکری

ہمارے مصلح اگر یہی ہیں بدل ہی دیں گے مزاج لیلیٰ
یہ مشورے دے رہے ہیں حضرت کو بھیجدو قیس کو بریلی

پہلے سنتے تھے صدائیں مرد میدان کون ہے ‏ اب تو یہ سرگوشیاں ہیں میری گوئیاں کون ہے
اٹھ گیا پردہ تو اکبر کا بڑھا کون ساحق ‏ بے پکارے جو مرے گھر میں چلا آتا ہے
بے حجابی میری ہمسائے کی خاطر سے نہیں ‏ صرف حکام سے ملنے میں مزا آتا ہے

عام واقعات عالم ہیں کوئی صاحب کسی خاص واقعہ کی طرف منسوب کریں تو کوتاہ نظری ہوگی۔

گو ڈر جدید روشنی کے مشعلوں کی ہے ‏ پردے کی احتیاج ہے کیا اس بنا پر
جب شمع ہو تو اس کی حفاظت ضرور ہے ‏ فانوس کوئی رکھ نہیں سکتا الاؤ پر

کس قدر بھیانک تصویر کھینچی ہے۔ اس موقع پر اکبر کا وہ غیر فانی قطعہ بار بار یاد آتا ہے۔

نئی تہذیب کی عورت میں کہاں دین کی قید ‏ بے حجابی جو ہوا اس میں تو قباحت کیا ہے
نور اسلام نے سمجھا تھا مناسب پردہ ‏ شمع خاموش کو فانوس کی حاجت کیا ہے

تغزّل

بزم یاراں سے پھری باد بہاری مایوس ایک سر بھی اسے آمادۂ سودا نہ ملا

(غالب)۔ کون ہوتا ہے حریف مئے مردانہ عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

گل کے خواہاں تو نظر آئے بہت عطر فروش طالب زمزمہ بلبل شیدا نہ ملا

ناقدری زمانہ کی کس قدر موثر داستان ہے۔

قیس کا ذکر مری شان جنوں کے آگے اگلے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

شعر کے تیور دیکھنے کے قابل ہیں کیا عمدہ مصرعہ لگایا ہے۔

تری چشم فسوں گر کا اشارہ ہے یہ نرگس سے فقط نظارہ کرنے سے کوئی ساحر نہیں ہوتا

روانی و جوش بیان سے لبریز ہے

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

کیا سادگی ہے اور کس قدر موثر ہے۔

اترا دریا میں پے غسل جو وہ غیرت گل شور امواج کو میں شور عنادل سمجھا

رعایت لفظی سے قطع نظر نہایت مناسب نغمہ پیدا کیا ہے۔

اس تمنا میں کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو ماہ نو بھی چرخ پر شکل گریباں ہو گیا

پرانی وضع کے کرتوں میں کالر کی جگہ ہلال لگتا تھا۔ حسن تعلیل دیکھئے۔

محبت کا تم سے اثر کیا کہوں نظر مل گئی دل دھڑکنے لگا

نیچرل شاعری کے گردیدہ اکبر کے اس شعر کو ذرا غور سے دیکھیں۔

رشک آتا ہے جو تکیئے پہ وہ سر رکھتے ہیں صاحب حس نہ کہیں ہو مرے زانو کی طرح

رشک کا کس قدر نرالا پہلو نکالا ہے۔

کھلیں وہ شرمگیں آنکھیں شب وصلت زباں ہو کر محبت کی نظر نے دی اجازت مجھکو ہاں ہو کر

شوخی طبیعت برسی پڑتی ہے۔

مجال گفتگو کس کو ہے ان کے حسن کے آگے زبانیں بند کر دیں ان بتوں نے بے زباں ہو کر

دیکھئے کتنے معمولی الفاظ ہیں مگر حسن نظم نے جادو بھر دیا ہے۔

نگاہیں مل گئیں تھیں میری ان کی رات محفل میں — یہ دنیا ہے بس اتنی بات پھیلی داستاں ہو کر

اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کر دیا۔

بھری قسمت ہوا کی آپ کی زلفوں کے صدقہ میں — پریشاں ہو کے آئی تھی چلی عنبر فشاں ہو کر

مضمون پائمال ہے مگر اکبر کی طبیعت نے جدت پیدا کر لی۔

نہیں کوئی شب تار فراق میں سوز دل — خموش شمع ہے خود جل رہے ہیں شام سے ہم

ہجر کی رات یوں ہوتی ہیں حسرت دیدار میں — جیسے لحد میں ہو کوئی حشر کے انتظار میں

بھونرے ہیں مست بوئے گل تیتریاں ہیں سوئے گل — سب کو ہے جستجوئے گل موسم خوشگوار میں

پیاری ترصیع ہے اور ایسی پیاری کہ آورد کی چھاؤں بھی نہیں ہے۔

میری نگاہ شوق کا اللہ رے اثر — معشوق بھول جاتے ہیں اپنی نہیں نہیں

مرض عشق بھی کیا چیز ہے جس سے صحت — آرزوئے دل رنجور یہی ہے کہ نہ ہو

تعقید ہے مگر ایسی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔

دل مرا اُن پہ جو آیا تو قضا بھی آئی — درد کے ساتھ ہی ساتھ اس کی دوا بھی آئی

بیتابیاں نصیب میں تھیں ورنہ ہمنشیں — یہ کیا ضرور تھا کہ انھیں پر نظر پڑے

دوسرا مصرعہ کتنے نفیس بول چال میں ہے۔

مذاق فطرت میں بس نہ جاتے جو قامت و گیسوئے حسیناں
یہ راستی سرو میں نہ ہوتی یہ سنبل تر میں خم نہ ہوتا

اللہ بچائے مرض عشق سے دل کو — سنتے ہیں کہ یہ عارضہ اچھا نہیں ہوتا

ہے صاف نگاہوں سے عیاں جوش جوانی — آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن ان کا

بے خودی شباب کی تصویر اس سے اچھی آج تک میری نگاہوں سے نہیں گذری۔

کوئی اکبر سا بھی دیوانہ نظر آیا ہے کم
پہروں روتا ہے جو پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں

دوسرا مصرعہ لاجواب ہے۔ تیر اور درد کی نشتر زنی کا لطف حاصل ہوتا ہے۔

سنبھالیں دل کو کہ ہم حالت جگر دیکھیں　　تمام آگ لگی ہے کدھر کدھر دیکھیں

"رگ رگ میں نیش غم ہے کہئے کہاں کہاں کی"

اثر دکھانے پہ یہ جذب دل جو آتا ہے　　کنویں سے حضرت یوسف کو کھینچ لاتا ہے

سورۂ یوسف کلام پاک میں ملاحظہ فرمائیے "کہ عشق از پردہ عصمت بروں ارد زلیخا" کا جواب ہے۔

آج آرائش گیسوے دوتا ہوتی ہے　　پھر مری جان گرفتار بلا ہوتی ہے

شوق پابوسی جاناں مجھے باقی ہے ابھی　　گھاس اُگتی ہے جو تربت پہ حنا ہوتی ہے

جس نے دیکھی ہو وہ چتون کوئی اس سے پوچھے　　جان کیونکر ہدف تیر قضا ہوتی ہے

نزع کا وقت برا وقت ہے خالق کی پناہ　　ہے وہ ساعت کہ قیامت سے سوا ہوتی ہے

روح تو اک طرف ہوتی ہے تن سے رخصت　　آرزو ایک طرف دل سے جدا ہوتی ہے

ہوں فریب ستم یار کا قائل اکبر　　مرتے مرتے نہ کھلا یہ کہ جفا ہوتی ہے

اس غزل کو جس پہلو سے دیکھئے لاجواب ہے۔

کیا پوچھتے ہو مجھ سے پہلو میں ترے کیا ہے　　اب تو نہیں ہے کچھ بھی دل تھا سو کھو گیا ہے

معلوم ہوتا ہے کہ میرؔ کی زبان سے شعر ادا ہوا ہے۔

نگاہ پڑتی ہے ان پر تمام محفل کی　　وہ آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھتے کسی کی طرف

یوں خیال گلرخاں میں ہے منوّر داغ دل　　جل رہا ہوں جس طرح پھولوں کی چادر میں چراغ

کر رہا ہے وصف آئینہ کا جو وہ شعلہ رو　　ہے یہ گویا شکر احسان سکندر میں چراغ

دیکھئے کتنے اچھوتے چراغ ہیں۔

یہی نظر ہے جو اب قاتل زمانہ ہے　　یہی نظر ہے کہ اٹھتی نہ تھی کسی کی طرف

نگاہوں کے اشارے سے جو حکم اٹھنے کا ہوتا ہے　　مجھے بھی آپ کیا درد دل شیدا سمجھتے ہیں

کس لُطف کا راز و نیاز ہے۔

میں اپنے نقد دل سے جنس الفت مول لیتا ہوں
اطبّا کو ذرا دیکھو اسے سودا سمجھتے ہیں

پیغام آ رہا ہے دل بے قرار کا　　قائم ہے سلسلہ مرے اشکوں کے تار کا

صبا بھی اس گل کے پاس آئی تو مرے دل کو ہوا یہ کھٹکا
کوئی شگوفہ نہ یہ کھلائے پیام لائی نہ ہو کہیں کا

ترا صبا و مرا آب دیدہ شد غماز
وگرنہ عاشق و معشوق رازدارانند (حافظ)

شگوفہ کھلانا = فتنہ پیدا کرنا۔ کلی کو پھول کرنا۔

خواب نوشیں سے ترا بیدار ہونا الاماں
یہ خمار نرگس مستانہ یہ آثار صبح

مری بیتابی دل پر ادا سے مسکراتے ہیں
قیامت کرتے ہیں بجلی پہ وہ بجلی گراتے ہیں

جنبش ابروئے قاتل کا اشارہ ہے یہی
کام چلتا ہے جو دنیا میں تو شمشیر کے ساتھ

مری تقدیر موافق نہ تھی تقدیر کے ساتھ
کھل گئی آنکھ نگہبان کی بھی زنجیر کے ساتھ

ناتوانی مری دیکھی تو مصور نے کہا
ڈر ہے تم بھی کہیں کھنچ آؤ نہ تصویر کے ساتھ

قامت سے تیرے صانع قدرت نے اے حسیں
دکھلا دیا ہے حشر کو سانچے میں ڈھال کے

شوق وصل شعلہ خوباں کیوں نہ ہو برسات میں
ابر کو بھی دیکھتا ہوں برق در آغوش ہے

دیکھئے آرزو کا پہلو کس حسن سے نکالا ہے۔

حال میری بیقراری کا بھی کچھ سُن لیجئے
یہ بھی اک آویزہ ہو بجلی جو زیب گوش ہے

تا بہ کے دید حسیناں تا بہ کے وارفتگی
آنکھ میں جبتک نظر ہے سر میں جب تک ہوش ہے

سوال و جواب نے عمل اثر کو مکمل کر دیا۔

آئینہ سے بھی وہ بچتے ہیں کہ پڑ جائے نہ عکس
شرم کہتی ہے کہ یہ بھی صاحب آغوش ہے

آئینہ کو صاحب آغوش کہنا میرے نزدیک بالکل اچھوتی بات ہے۔

کیوں نہ اپنے بل پہ نازاں ہو وہ زلف پرشکن
اس کی خود بینی کو آئینہ صفائے دوش ہے

ہے اگر امید فردا ہی پہ صرف اس کی بنا
کل نہ ہوگا آج اکبرؔ کے جو دل میں جوش ہے

ترے سحر نظر سے ہوا یہ جنوں مرے دل کی تو اس میں خطا ہی تھی
ترے کوچہ میں آکے بیٹھ رہا بجز اس کے کچھ اور دوا ہی نہ تھی

دن رات کی یہ بے چینی ہے یہ آٹھ پہر کا رونا ہے
آثار برے ہیں فرقت میں معلوم نہیں کیا ہونا ہے

(افسر میرٹھی) آغاز ہوا ہے الفت کا اب دیکھئے کیا کیا ہونا ہے
یا ساری عمر کی راحت ہے یا ساری عمر کا رُونا ہے

ناز سے دامن اٹھاتی تھی جو اپنا لیلےٰ زیر لب کہتی تھی مجنوں کے گریبان کی خیر

کس قدر چلبلا شعر ہے

فلک جو برباد بھی کرے گا بلند ارادے مرے رہیں گے
جو خاک ہوں گا تو خاک سے بھی سدا بگولا اُٹھا کرے گا

کرو نہ کچھ فکر جام و ساقی بہار آنے تو دو چمن میں
گلوں سے ٹپکے گا رنگ مستی ہوا کرے گی شراب پیدا

نہ آس کو ٹوٹنے کا موقع نہ شوق گستاخیوں کا حامی
اَداؤں میں کچھ لگاوٹیں ہیں نگاہ سے ہے عتاب پیدا

کشمکش کی کتنی پیاری تصویر ہے۔

تضمین

خوب اک ناصح مشفق نے یہ ارشاد کیا
بزم میں اس نے تعلی جو کل اکبر کی سنی

تضمین اس حسن سے کرتے ہیں کہ اصل شعر یا اصل مصرعہ اسی سلسلہ کا معلوم ہوتا ہے آورد کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی۔

نہ تری فوج نہ شاگرد نہ پیر اور نہ مُرید
نہ تو ارجن ہے نہ سقراط رشی ہے نہ مُنی

کس نگیں پر ہیں ترے نقش کے آثار عیاں
نوٹ بک تیری شکستہ تری پنسل ہے گھُنی

فکر سے ذکر سے عبرت سے تجھے کام نہیں
واہ واہ کے لئے لفظوں کی دُکاں تو نے چُنی

خود پرستی ہے بہت خلق کی خدمت کم ہے
دل دہی کم ہے تو ہے دل شکنی چار گُنی

طبع میں تیری وہی خامیٔ حرص دنیا
آتش خوف خدا سے نہ جلی ہے نہ بھُنی

تکیہ بر جائے بزرگاں نتواں زد بہ گزاف
مگر اسباب بزرگی ہمہ آمادہ کُنی

مشرقی کو ہے ذوق روحانی
مغربی میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

ھنس کے کہنے لگے مرے اک دُوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اُوست

ڈارون (DARWIN) یورپ کا ایک زبردست حکیم جس نے تخلیق عالم کی تحقیق کی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ انسان مختلف اجسام و ہئیات میں ہوتا ہوا فیض ارتقار سے آج آدمی بنا ہے اس کے ماتحت سب سے آخیر درجہ جس کے بعد ہم آدمی ہوئے ہیں بندر کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اور تمام حیوانات کے نسبتاً ہم عادتاً اور جسماً بندر سے بہت زیادہ مشابہ ہیں۔ اکبر نے کس مزے سے تردید کردی ہے۔

مغرب کے لعبتوں نے اسٹیج کو سنوارا
بجنے لگا پیانو چپ ہو گیا چکارا

بیتاب ہو کے آخر یہ شیخ نے پکارا
دل می رود ز دستم صاحبدلاں خدا را

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

حافظؒ کی نہایت مشہور غزل ہے۔ یہ دیکھئے کہ مصرعے لگانے میں لطف یہ ہے کہ اُردو فارسی کا پیوند بُرا نہیں معلوم ہوتا اور شعر کے اثر مصرعوں کے بعد بالکل بدل جاتے ہیں۔

گم ہیں مری نظر سے وہ ساحل دلاویز — ناکامیوں کی موجیں بہنے لگیں بہت تیز
اسٹیمر اپنی ہم کو دیتے نہیں یہ انگریز — کشتی شکستگانیم اے باد شرطہ برخیز
باشد کہ باز بینیم آں یار آشنا را

فہمیدن معانی ہر طبع کے تواند — لذت ببایدآں دل کو زارہا بداند
موجے بہ سینہ خیز داز شوق عرق ماند — گر مطرب حریفاں این نظم من بخواند
در وجد و حالت آرد پیران پارسا را

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری۔
رفت دنبال ڈارون آں شوخ — بوزنہ ماند آدمی گم شد
سگ اصحاب کہف روزے چند — پئے نیکاں گرفت مردم شد
پسر نوح بابداں بنشست — خاندان نبوتش گم شد

شیخ جی دیر میں بیٹھے ہوئے گاتے تھے بھجن — نگراں سوئے برہمن تھے بشوق بھوجن
میں نے ٹوکا تو لگے کہنے مناسب نہیں کد — ہر کسے مصلحت خویش نکو می داند
تھی مرے پیش نظر وہ مس تہذیب پسند — کبھی وھسکی[۵۱] مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زغند — پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قید میں بند
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
روئے گُل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

کوئی کہتا ہے رکھو صاحب سے میل — کہ آنر[۵۲] کی گھر میں رہے ریل پیل
کسی کی صدا ہے کہ ہند و بھلے — مری انجمن بھی اُسی رُخ چلے
کسی سمت کونسل کی ہے دل میں چوٹ — عوض لٹھ کے آپس میں چلتے ہیں ووٹ
کسی سر میں ہے لیڈری کی ہوس — کوئی شہد اسپیچ کی ہے مگس

[۵۱] WHISKY ایک انگریزی شراب۔ [۵۲] HONER = عزت

کوئی شوق تحقیق میں غرق ہے
کوئی راہ تقلید میں برق ہے
کسی کو ہے مضموں نگاری کی دھن
کوئی چندہ دینے کو سمجھا ہے پُن
کسی کو عمارت بنانے کا شوق
کسی کو نمود و نمائش کا ذوق
کسی کو کوئی ٹوک سکتا نہیں
سڑک کو کوئی روک سکتا نہیں
جدھر بحر ہستی بہائے ہمیں
خدا سے دعا ہے کہ سب خوش رہیں
مگر شیخ سعدی کی ہے ایک بات
مسلماں کو ہے فرض ادھر التفات

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بہ منزل نخواہد رسید

دیکھیے تمام کی سیر کر کے کس آسانی سے منزل مقصود اور مرکز اصلی پر آ گئے ہیں۔

اجسام کے علوم کا کرتے ہیں خود عمل
اجرام کے علوم کا دیتے ہیں ہم کو درس
ہوتا ہوں معترض تو وہ کہتے ہیں واہ واہ
میں نے تو کر دیا تیرا رتبہ بلند تر

از صحن خانہ تا بہ لب بام ازان من
وز بام خانہ تا بہ ثریا ازان تو

خود فن حرب سیکھ رہے ہیں پریڈ پر
میرے لئے چمن میں شٹل کاک کا ہے کھیل
اظہار ناخوشی پر وہ فرماتے ہیں کہ دیکھ
تیرا ہی شغلہ ہے بہت صاف و بے ضرر

واں اشتر ضعیف و لکدزن ازان من
ویں گربہ مصاحب بابا ازان تو

یہ نظم BLANK VERSE میں یعنی بلا قافیہ لکھی گئی ہے۔

جو اڈورڈ نے چھوڑا شاہی کا چارج
ہوئے جلوہ آرا شہنشاہ جارج
خوشی ان کی ہے اور اُن کا اَلم
دو دل ہو رہی ہے زبان قلم

کیا حسن تعلیل ہے۔

لحد بھی ہے اور مسند جاہ بھی
مبارک سلامت بھی ہے آہ بھی
بڑے شور ایوان دولت میں ہیں
وہ تربت میں ہیں اور یہ حیرت میں ہیں

بگڑتا ہے دنیا میں جو گھر بنا — مسلسل ہے رفتار موج فنا

کس قدر ڈھلا ہوا مصرعہ ہے۔

خوشی کی بھی لیکن ہے پیہم نمود — بلا ہے تو نعمت کا بھی ہے ورود
ہمیں است آئین چرخ کہن — چہ خوش گفت سعدی شیریں سخن

یکے را چو پایاں رسد دور عہد
جواں دولتے سر برآرد ز مہد

انور سے کہا میں نے کہ خاموش ہو کیوں تم — تقریر نہ تحریر نہ غصہ نہ خوشامد
بابو کے نہ دمساز نہ یاروں کے ہم آواز — ماہی میں نہ ممتاز نہ اشتر میں سر آمد (مرتبہ)
کہنے لگے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے — "کاں را کہ خبر شد خبرش باز نیامد" (سعدی)
اگر ہیں بھی باقی کچھ اب دردمند — تو پس پھینکتے ہیں وہ لفظی کمند
بہ یک لکچر آواز ہرہ بلند — بہ یک بزم مقدار چندہ دوچند
کہاں اب وہ دل اور طبع بلند — جنھیں کہہ گئے سعدی ارجمند

"بہ یک نعرہ کوہ زجا برکنند
بہ یک نالہ ملکے بہم برزنند

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی — من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاق نظر میں اس سے تو بہتر ہے وہ — من ترا "پاجی" بگوئم تو مرا پاجی بگو

لفظوں کے ذرا سے تبدیل کر دینے سے کیا عمدہ نقشہ کھینچ دیا ہے۔

قدیم وضع پر قائم رہوں اگر اکبر — تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں — خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر — زیادہ حد سے دیئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لمینڈ بھی چھو نہیں سکتے — ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک — ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را — بلائے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلےٰ

یہ تسبیح تکبیر و حمد و دعا ہے نور دل بندگان خدا
یہ پلٹن کے گورے ہر اتوار کو سجاتے ہیں گرجا کے دربار کو
اگر یہ کہو ہیں وہ بالکل وحوش تو دیکھو کہ عابد ہیں حضرت لیٹوش
جب ایڈورڈ ہفتم ہوئے تھے علیل تو کی قوم نے یاد رب جلیل
کمی کی نہ اسٹیٹ نے خرچ میں دعائیں ہوئیں دھوم سے چرچ میں
وہ جنرل کہ دبتی تھی جن سے زمیں ہیں گرجا میں راکع مع الراکعین
ہوئے جنگ سے زار اندیشہ ناک گرے سجدے میں پیش اللہ پاک

سر بادشاہان گردن فراز
بدرگاہ او بر زمین نیاز

بتان خود فروش آخر فرستادند ایں بلہا طلب کردند زر چندانکہ خون افتاد در دلہا
نشاط طبع برہم شد شکست آں رنگ محفلہا الا یا ایہا الساقی ادر کاسا و ناولہا
کہ عشق آساں نمود اول وے افتاد مشکلہا

ادھر بے علم دیں ہے نور ایماں قلب سے زائل ادھر کالج کا بیڑا پار کرنے پر ہیں دل مائل
ادھر ہے نوکری دشوار چکر میں ہے ہر سائل شب تاریک و بیم موج و گرداب چنیں حائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحلہا

نہ قید شرع باقی ہے نہ آزادی کی ہے کچھ حد نہیں کچھ گفتگو اس بات میں یہ نیک ہے یا بد
بزرگوں کا بھی فتویٰ ہے کہ پڑھ قانون سر سیّد بہ سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

سیّد دراصل سیِّد ہے۔ حرکت قافیہ اساتذہ کو اختلاف ہے مگر اکبر نے ضرورت سے اور بالعمد استعمال کیا ہے۔

ہوئی جو مجھ سے یہ فرمائش بت طناز کہ فن شعر میں تو آج ہے بہت ممتاز
لگا دے اس پہ کوئی مصرعہ حسین و نفیس "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"
کہا میں نے کہ ہے قید حسن و خوبی کی تو سن یہ شعر نشاط آور و نگاہ نواز

پہن لے سایہ مری جان اُتار کر شلوار　　زمانہ با تو نسازد تو بازمانہ بساز

اہل یورپ کے ساتھ یورپ میں　　چکھی سیّد نے ایک دن کاری

خانساماں نے کان میں یہ کہا　　آپ تو علم سے نہیں عاری

پڑھیے کوئی دعائے اکل طعام　　دین سے بھی رہے وفاداری

تب یہ اشعار حضرت سعدی　　ہوئے اُن کی زبان پر جاری

اے کریمے کہ از خزانۂ غیب　　گبر و ترسا وظیفہ خور داری

دوستاں را کجا کنی محروم
تو کہ بادشمناں نظر داری

محض لطف تضمین کی غرض سے یہ کہانی گڑھی گئی ہے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

نگرانی مَراحل کبھی ایسی تو نہ تھی　　تند[51] موج لب ساحل کبھی ایسی تو نہ تھی

بدگمانی تری قاتل کبھی ایسی تو نہ تھی　　بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی

جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی

کرتی ہے خلق کو لیلائے لبرٹی[52] مفتوں　　ہند کے دل کو لبھا لیتا ہے بل[53] کا یہ فسوں

لاجپت[54] بھی ہوئے شاید کہ اسیر و محزوں　　پائے کوباں[55] کوئی زنداں میں بنا ہے مجنوں

آتی آواز سلاسل کبھی ایسی تو نہ تھی

پیشتر اس سے طبائع کے نہ تھے یہ پہلو　　کہیں اشناں[56] کی تھی لہر کہیں موج وضو

اے مس سیم تن و ماہ جبین و گلرو　　تیری آنکھوں نے خدا جانے کیا کیا جادو

کہ طبیعت مری مائل کبھی ایسی تو نہ تھی

---

۵۱ سخت۔ تیز۔ ۵۲ ارادے۔ ۵۳ بل۔ بتلی گھر۔ ایک زبردست انگریز فلسفی۔ ۵۴ لالہ لاجپت رائے شیر پنجاب۔ ۵۵ پانوں کوٹنے یا پیٹنے والا۔ ۵۶ نہانا۔ غسل۔ سیاست والے جو چاہیں وہ معنی پیدا کرلیں ورنہ کوئی خاص پہلو مراد نہیں ہے۔

تاریخ گوئی

دھرم پور آج کیوں اس درجہ وقف حسرت و غم ہے
یہ کیا باعث کہ برپا ہر طرف اک شور ماتم ہے
کنور عبدالعزیز اک نوجواں ماں باپ کا پیارا
گل باغ ریاست اور اک کی آنکھ کا تارا
اسے دور فلک نے ناگہاں تیر اجل مارا
کسی کا بس نہیں اللہ کی مرضی میں کیا چارا

اگر تاریخ رحلت تم کو لکھنی ہے صفائی سے
رہو ساکت ملا دو صبر کو داغ جدائی سے

۲۹۲ ۱۰۲۳ ۱۳۱۵ھ

حضرت اکبر نے تاریخیں بہت زیادہ نہیں کہیں مگر جتنی کہی ہیں نہایت عمدہ ہیں۔

آں نونہال خوبی ماہ دو ہفتہ من
در نو بہار عمرش رفت از فضائے ہستی
پیمانۂ مئے غم سرشار و بیہشم کرد
رفتم سر مزارش در بے خودی و مستی
آہے ز دل کشیدم گفتم کہ اے مہ من
با ایں کمال و رفعت حیف است میل پستی
آخر چہ شد کہ رفتی در رونق گلستاں
در موسم بہاراں رنگ چمن شکستی
ناگہ ندائے از غیب آمد بگوش جانم
کائے بے خبر زایماں اے محویت پرستی
آں راکہ شعلہ خوانی واں راکہ برق دانی
آں حیلہ بود رنگ نقش طلسم ہستی
عبرت کشود چشمم حیرت بہ ہوشم آورد
در سینہ دفن کردم جوش و خروش مستی

تاریخ فوت گفتم در صنعت عجیبے
بوٹا بروں شد اکبر از گرد باغ ہستی

۴۰۹ ۲۰۲ ۲۰۹ ۱۲۹۳ھ

دیکھئے کتنی اچھوتی صنعت میں تاریخ کہی ہے اور پھر رعایات لفظی کا بھی خیال رکھا ہے۔

شبلی ہی اُٹھ گئے تو میں اب جاؤں کس کے پاس
شعر و سخن کی بزم نظر آتی ہے اوداس
ڈھونڈھا جو دل نے مادۂ سال انتقال
پھرنے لگا نگاہ میں یار سخن شناس

۱۳۳۲ ہجری

تاریخیں کہنے میں ہاتف غیبی اور سروش غیبی کی امداد کے بغیر شاعر بہت کم مصرعہ تاریخ کہتے تھے اکبر کی اکثر تاریخیں اس رسم سے بے نیاز ہیں۔

حضرت اقبال میں جو خوبیاں پیدا ہوئیں
قوم کی نظریں جو ان کے طرز کی شیدا ہوئیں

یہ حق آگاہی یہ خوشگوئی یہ ذوق معرفت
یہ طریق راستی خودداری بے تمکنت

اس کے شاہد ہیں کہ ان کے والدین ابرار تھے
باخدا تھے اہل دل سے صاحب اسرار تھے

مادر مخدومہ اقبال جنت کو گئیں
چشم تر ہے آنسوؤں سے قلب ہے اندوہگیں

روکنا مشکل ہے آہ وزاری و فریاد کو
نعمت عظمیٰ ہے ماں کی زندگی اولاد کو

اکبر اس غم میں شریک حضرت اقبال ہے
سال رحلت کا بیان منظور اسے فی الحال ہے

واقعی مخدومہ ملت تھیں وہ نیکو صفات
رحلت مخدومہ سے پیدا ہے تاریخ وفات

۱۳۳۲ھ

اس تاریخ سے ایک نہایت عمدہ پہلو اکبر کے کیریکٹر کا ظاہر ہوتا ہے، حق گوئی اور نکتہ سنجی کے علاوہ صاف باطنی اور اعتراف کمال معاصرین میں ان کو کبھی کوئی باک نہ تھا۔

فخر ملت تھے مہدی مرحوم
کیوں نہ غم ان کا ہو ہر اک دل کو

سال رحلت کا مادہ اکبر
مومن پاک بے نظیر لکھو

۱۳۳۱ھ

رئیس جائس ضلع رائے بریلی، وکیل الہ آباد۔

تعلیم

رنگ چہرہ کا تو کالج نے بھی رکھا قائم　　رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

ہماری موجودہ طرز تعلیم میں مذہب روحانیت تزکیہ نفس وغیرہ کے نصاب کی بہت کمی ہے۔

علوم دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے　　زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

یہ پاس اور وہ پاس موجد بہ اہل زر　　اخبار میں جو چھپ گئے ارمان نکل گیا

ہماری تعلیم اور فراغ تعلیم کے بعد غربت کی کیسی اچھی تصویر ہے پھر صنعت وحرفت کی ترغیب بھی ہے۔

کتاب دل مجھے کافی ہے اکبر درس حکمت کو　　میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مِل نہیں ملتا

SPENCEP اور MILL دونوں یورپ کے زبردست فلسفی گذرے ہیں۔

انجن آیا نکل گیا زن سے　　سن لیا نام آگ پانی کا

علم پورا ہمیں سکھائیں اگر　　تب کریں شکر مہربانی کا

ٹاٹا کمپنی کو جو دقتیں تشہیر کار، نظم فروخت وغیرہ میں ہوتی ہیں ان کو کون نہیں جانتا اس کے علاوہ ہم کو صنعتی اور حکمی تعلیم نا مکمل ملتی ہے۔

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے　　جناب ڈارون کو حضرت آدم سے کیا مطلب

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

مضامین متعلقہ ہندوستان حصہ اول ملاحظہ فرمائیے۔

ان مدعیوں کا طرز عمل اکبر یہ شہادت دیتا ہے

پڑھنے کو کتابیں پڑھ لی ہیں سمجھے یہ مگر کچھ خاک نہیں

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اس شعر کی تطبیق بہت سے سندیافتہ حضرات پر ہوتی ہے۔

فلسفہ کی نور باطن کر نہیں سکتیں　　کواکب کی شعاعیں رات کو دن کر نہیں سکتیں

پیچیدہ دلیلیں مسائل کے لئے جاتے ہیں انگلینڈ

زلفوں میں الجھ آتے ہیں شامت ہے تو یہ ہے

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے — مگر یونہی کہ گویا آب زمزم مے میں داخل ہے

دیکھئے کمی تعلیم مذہب کو کس عمدگی سے دکھایا ہے آب زمزم کے چند گھونٹ خم شراب میں ڈالدیئے جائیں تو بیکار ہیں۔

ایسی منطق سے تو دیوانگی بہتر اکبر — کہ جو خالق کی طرف دل کو جھکا ہی نہ سکے

فیض تعلیم سے اب اس کی سمجھ ہی نہ رہی — دل تو بڑھ جاتا تھا اجداد کے افسانے سے

بہت آساں ہے تشریح منطق کے نتیجوں کی — بہت مشکل ہے لیکن فرق کرنا حق و باطل میں

واقعی یہ صلاحیت صرف علم پر نہیں بہت کچھ عمل پر موقوف ہے۔

تکمیل میں ان علوم کے ہو مصروف — نیچر کی جو طاقتوں کو کردیں مکشوف

لیکن تم سے امید کیا ہو کہ تمھیں — عہدہ مطلوب ہے وطن ہے مالوف

غیر ملکوں میں جا کر اعلیٰ تعلیم اعلیٰ فنون حاصل کرنے کی کتنی موثر تحریک ہے۔

علم و حکمت میں ہو اگر خواہش فیم[۵۱] — سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم[۵۲]

شادی نہ کر اپنی قبل تحصیل علوم — بت ہو کہ پری ہو خواہ وہ ہو کوئی میم

تکمیل درس کے لئے شادی کرلینے سے حقیقتاً بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں

خدا علی گڈھ کے مدرسہ کو تمام امراض سے شفا دے

بھرے ہوئے ہیں رئیس زادے امیر زادے شریف زادے

کمال محنت سے پڑھ رہے ہیں کمال عزت سے بڑھ رہے ہیں

سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے

ہر اک ملے ان میں کا بیشک ایسا کہ آپ اسے چاہتے ہیں جیسا

دکھائے محفل میں قد رعنا جو آپ آئیں تو سر جھکادے

فقیر مانگے تو صاف کہدیں کہ تو ہے مضبوط جا کما کھا

قبول فرمائیں آپ دعوت تو اپنا سرمایہ کل کھلادے

---

[۵۱] FAME - شہرت - عزت [۵۲] AIM - نصب العین -

بتوں سے ان کو نہیں لگاوٹ مسوں کی لیتے نہیں وہ آہٹ
تمام قوت ہے صرف خواندن نظر کے بھولے ہیں دل کے سادے
نظر بھی آئے جو زلف پیچاں تو سمجھیں یہ کوئی پالسی[1] ہے
الکٹرک لائٹ[2] اس کو سمجھیں جو برق وش کوئی مسکرا دے
لطیف و خوش وضع چست و چالاک و صاف و پاکیزہ شاد و خرم
طبیعتوں میں ہے ان کی جودت دلوں میں ان کے ہیں نیک ارادے
نکلتے ہیں کر کے غول بندی بنام تہذیب و درد مندی
یہ کہکے لیتے ہیں سب سے پہلے ہمیں جو تم دو تمہیں خدا دے
انھیں اسی بات پر یقین ہے کہ بس یہی اصل کار دین ہے
اسی سے ہوگا فروغ قومی اسی سے چمکیں گے باپ دادے
مکان منزل کے سب مکیں ہیں انھیں ابھی تجربے نہیں ہیں
خبر نہیں ہے کہ آگے چل کر ہے کیسی منزل ہیں کیسے جادے
دلوں میں ان کے ہے نور ایماں قوی نہیں ہے مگر نگہباں
ہوائے منطق ادائے طفلی یہ شمع ایسا نہ ہو بجھا دے
فریب دے کر نکالے مطلب سکھائے تحقیر دین و مذہب
مٹا دے آخر کو وضع ملت نمود ذاتی کو گو بڑھا دے
یہی بس اکبر کی التجا ہے جناب باری میں یہ دعا ہے
علوم و حکمت کا درس ان کو پروفیسر دیں سمجھ خدا دے

فیض کالج سے جوانی رہ گئی بالائے طاق — امتحاں میش نظر اور عاشقی بالائے طاق
وہ چراغوں سے ہیں جلتے ایسے ہیں روشن ضمیر — کہتے ہیں رکھیے پرانی روشنی بالائے طاق
سیاہ کرنا دلوں کا اسے ہے کیا مشکل — تمھارا علم لگاتا ہے آفتاب میں داغ
سائنس کا اکتشاف ہے کہ آفتاب میں بہت سے داغ پڑے ہوئے ہیں۔

[1] -POLICY - مصلحت - [2] -ELECTRIC LIGHT - برقی روشنی -

ظاہر میں اگرچہ راز سربستہ ہے — مضمون لطیف و خوب و برجستہ ہے
پودا نہیں پھول کا علیگڈھ کالج — گل اِن میں مسلموں کے گلدستہ ہے

غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا — محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے

باغوں میں تو بہار درختوں کی دیکھ لی — کالج میں آکے کانوکیشن[51] کو دیکھئے
لیموئے[52] کاغذی تو بہت دیکھے آپ نے — اب کاغذی ترقی فیشن کو دیکھئے

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رُک نہیں سکتی — کسی سے مشرق و مغرب کی سازش رک نہیں سکتی
وہ نزلہ رُک نہیں سکتا یہ پیچیش رُک نہیں سکتی — بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رُک نہیں سکتی

مذاق قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے
یہ نقش جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

دست فلک سے ہند کی خلقت بہت پٹی — جو کچھ تھی اس کی عظمت و وقعت وہ سب مٹی
اس کی دوا قناعت و نیکی ہے بس فقط — ہاں مشغلے کے واسطے ہو یونیورسٹی

کالج میں کسی نے کل یہ نغمہ گایا — قومی خصلت کا اٹھا سر سے سایہ
کہتے تھے ولد[53] کو لوگ سر لابیہ — سر للہاسٹر کا اب وقت آیا

طفل دل محو طلسم رنگ فالج ہو گیا — ذہن کو تب آگئی مذہب کو فالج ہو گیا

سعادت روح کی کس بات میں ہے آپ کیا جانیں — کہ کالج میں کوئی اس بات کا ماہر نہیں ہوتا

وسعت ہے در علم میں ہے راہ عمل بند — ہے صاف سڑک پاؤں پہ لیکن ہے شکنجہ
علم بے عمل بیکار ہے۔

کالج نے بٹھا دیا ہے مانند شجر — کچھ پھول پھلے تھے اس نے پھلنے نہ دیا

طفل مکتب کہ سخنہا بزباں می گوید — شکوہ کم کن کہ چنیں گفت و چناں می گوید
طبع او فونوگراف[54] است و سر دوش سبقش — انچہ بستند برو نقش ہماں می گویند

---

۵۱ CONVOCATION = جلسہ تقسیم اسناد۔ ۵۲ ہلکے چھلکے والا لیموں ۵۳ الولد سرٌ لابیہ بیٹا وہی قدم بقدم ہو جو باپ کے (انیس) ۵۴ PHONOGRAPH = ایک انگریزی باجا ہے جو کوک دینے سے آپ سے آپ بجتا ہے۔

"درپس آئینہ طوطی صفتم واشتہ اند — انچہ استاد ازل گفت ہماں می گویم"

نوکر کو سکھاتے ہیں میاں اپنی زبان — مطلب یہ ہے کہ سمجھے ان کے فرمان
مقصود نہیں میاں کی سی عقل و تمیز — اس نکتہ کو کیا وہ سمجھیں جو ہیں ناداں
اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں — جو اہل نظر ہیں اس سے شرمندہ ہیں
حکام کی ہے یہ صرف عیسی نفسی — اعضا کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں
خواہاں نوکری نہ رہیں طالبان علم — قائم ہوئی ہے رائے یہ اہل شعور کی
کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی — عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

واقعات عالم شاہد ہیں کہ اب بیس بیس کی غیر مستقل ملازمت کے لئے صدہا ایم۔ اے اور بی۔ اے چکر کھاتے رہتے ہیں۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم — استاد اچھے ہوں مگر استاد جی[ا] نہ ہوں
مناسب ہے نئی تعلیم نسواں — یہی راہ آپ اب بے ردّو کد لیں
سمجھ لیں لاکھ باتوں کی یہ اک بات — میاں بدلے تو بیوی کیوں نہ بدلیں
کون کہتا ہے کہ تعلیم زنان خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے یاں حکمت کو
دو اُسے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

آج مغرب کے عمدہ وسائل دیکھئے باکمال معلمین اکبر کی رائے سے متفق ہیں

اعزاز بڑھ گیا ہے آرام گھٹ گیا ہے — خدمت میں ہے وہ لیزی[۵۲] اور ناچنے کو ریڈی[۵۳]
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر — شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی

سعدی علیہ الرحمۃ

یکے ذی علم در اسکول روزے — گلے خوشبوئے در حمام روزے
فتاد از جانب اپبلک بدستم — رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ کفری یا بلائی — بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری

[ا] استاد جی = مکار۔ شریر۔ بدوضع [۵۲] = LAZY سست [۵۳] = READY تیار۔ چست

گر بپش اعتقادات تو پستم — کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا مسلم مقبول بُودم — بگفتا من گل ناچیز بودم
ولے یک عمر با ملحد نشستم — ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال نیچری در من اثر کرد — جمال ہمنشیں در من اثر کرد
وگرنہ من ہماں شیخم کہ ہستم — وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

حافظ شیراز کا کیا پوچھنا تھے خوش بیاں — ان کا یہ مطلع ہے اب تک انجمن میں برزباں
"دوش از مسجد سوئے میخانہ آمد پیر ما — چیست یاران طریقت بعد ازاں تدبیر ما"
حضرت اکبر بھی لیکن اس زمانے میں ہیں فرد — ان کا یہ مطلع کوئی پڑھتا تھا کل با آہ سرد
دوش از صحن حرم آمد بہ کالج قوم ما — دیدنی گردیدہ است اکنوں صلوٰۃ وصوم ما

میرے عزیز ہیں شیعہ میں کس طرح یہ کہوں — کہ میں ہوں خوش جو ہوئی ان کی درسگاہ[1] جدا
دلی دعا ہے مگر یہ کہ رکن قوم رہیں — گریجویٹ وہ ہوں سب کے ساتھ خواہ جدا
بنائے کالج شیعہ الگ ہوئی بھی تو کیا — وہی ہے منزل مقصود گو ہے راہ جدا
برائے دولت و آنر[2] ہے ایک ہی مرکز — نہیں ہے اب بھی طریق حصول جاہ جدا
یہ دونوں سایہ الطاف مغربی میں ہیں — نہیں ہے فضل الٰہی سے بادشاہ جدا
جو نسخہ تھا رزولیشن کا ہے ادھر بھی وہی — نہ کوئی حصن جدا ہے نہ ہے سپاہ جدا
یہ دونوں[3] اب بھی بدستور پیر بھائی ہیں — نہیں ہے حرج جو ہو جائے خانقاہ جدا
ٹرین ایک ہے پھر کیا جو دو ٹکٹ گھر ہیں — کہ اپنا بیگ سنبھالیں ملے پناہ جدا
وہ شیخ کی تھی ترقی یہ مجتہد کا عروج — نئے طریق کے ہیں خوب دو گواہ جدا
شب وصال کے نغمے الگ چھڑے دو سمت — جنھیں ہے ہجر وہ کرلیں گے اپنی آہ جدا
عجب نہیں جو بلندی و اتحاد بڑھے — دکھائے رنگ جو دنیا کا انتباہ[4] جدا
ہزار دور ہوں اپنے جو ہیں وہ اپنے ہیں — کسی کی آنکھ سے ہوتی نہیں نگاہ جدا

[1] شیعہ کالج لکھنؤ کی طرف اشارہ ہے۔ [2] آنر۔ عزت۔ [3] شیعہ و سنی مراد ہیں۔
[4] تنبیہ کرنا۔

مگن ہیں ٹیچر و انجینئر رہے ذاکر
وہ کر ہی لیں گے کسی طور سے نباہ جدا
ثواب نیک خیالی بھی پائے گا اکبر
سوسائٹی میں بزرگوں کی واہ واہ جُدا

انسان یا بہت سے دلوں کو ملا سکے
یا کوئی شے مفید خلائق بنا سکے
ہم تو اسی کو علم سمجھتے ہیں کام کا
پڑھنے کو مستعد ہیں جو کوئی پڑھا سکے
میں نے اکبر سے کہا آیئے حجرے میں مرے
اس چٹائی پہ نمازیں پڑھیں حسب دستور
چھوڑیئے آپ یہ ہنگامۂ تعلیم جدید
کاٹ ہی دے گا کسی طرح خدا وند غفور
بولا جھنجھلا کے کہ ہے سہل جہنم مجھ پر
اس کی نسبت کہ میں کالج میں ہوں احمق مشہور
سب جانتے ہیں علم سے زندگی روح
بے علم ہے اگر تو وہ انسان ہے ناتمام
بے علم و بے ہنر ہے جو دنیا میں کوئی قوم
نیچر کا اقتضا ہے رہے بن کے وہ غلام
تعلیم اگر نہیں ہے زمانہ کے حسب حال
پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا
ڈالی بنا ہے مدرسہ کے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سنیں
لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانہ کو زور دل و دماغ
بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت تھی بخیر تو برکت خدا نے دی
کالج ہوا درست بصد شان و احتشام
سرمایہ میں کمی تھی سہارا کوئی نہ تھا
سید کا دل تھا درپئے تکمیل انتظام
آخر اٹھا سفر کو وہ مرد خجستہ پے
احباب چند ساتھ تھے ذی علم و خوش کلام
قسمت کی رہبری سے ملی منزل مراد
فرماں روائے ملک دکن کو کیا سلام
حالت دکھائی اور ضرورت بیان کی
خوبی سے التماس کیا قوم کا پیام
رحم آ گیا حضور کو حالت پہ قوم کی
پھر کیا تھا موجزن ہوا دریائے فیض عام
ماہانہ دو ہزار کیا اک ہزار سے
امید سے زیادہ عطا تھی یہ لا کلام

---

۱ بے خود۔ مسرور ۲ استاد TEACHER ۳ ماہر تعمیرات = ENGINEER ۴ ذاکر۔ ذکر حسینؑ کرنے والے۔ مجلسیں پڑھنے والے ۵ مدنی محفلیں = SOCIETY ۶ فطرت = NATURE

کیا وقت پر ہوئی ہے کہ بے احتیاج فکر　　تاریخ اپنی آپ ہے فیاضی نظام

۱۸۹۲ء

میں نے اس نظم کو تاریخ گوئی کے سلسلہ سے اس واسطے جدا کر لیا ہے کہ تاریخ محض برائے بیت ہے اصل تو سید صاحب کی تعلیمی کارگزاریوں کا اعتراف مد نظر ہے۔ ایک عام غلط فہمی لوگوں میں یہ ہے کہ اکبر سید صاحب کا مضحکہ اڑاتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو فرضی خیال حقیقت سے بہت دور ہے ان کے اکثر شعر آپ کو سید صاحب کی تعریف میں اور ان کی خدمات کے اعتراف میں ملیں گے۔ کہیں کہیں طعن بھی ہے مگر ذات سید پر نہیں بعض مسائل میں حد سے زیادتی پر ہے یا غلط سمجھنے والے تضحیک و تحقیر کا نشانہ بنے ہیں۔

بے علم اگر عقل کو آزاد کریں گے　　دنیا تو گئی دین بھی برباد کریں گے

عزت کا ہے نہ اوج نہ نیکی کی موج ہے　　حملہ ہے اپنی قوم پہ لفظوں کی فوج ہے

اس طرز تربیت پہ ہیں اغیار خندہ زن　　لاحول باپ کی ہے تو ماؤں کی نوج ہے

مسجد کا ہے خیال نہ پروائے چرچ ہے　　جو کچھ ہے اب تو کالج و ٹیچر میں خرچ ہے

CHURCH کلیسا انگریزوں کا معبد۔

یہی سبب ہے اب ان کی باتوں پہ کان دھرتے نہیں ہیں لڑکے

کھنچا نہ ہو دست مولوی سے نہ تھا یہاں کوئی کان ایسا

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے　　خزانہ بن گیا یورپ کے دوستوں کے لئے

تعلیم اونچے درجہ کی ہوتی نہیں نصیب　　پھر گھر میں بیٹھ کر بجز اے[۱] بی کے[۲] کیا کریں

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو　　کس کو سونپیں تمھیں اللہ نگہبان رہے

ہماری محفلیں اب بھی لطیف اجزا سے مملو ہیں

بزاخفش تھے قبل اس کے اب اسپنسر کے ٹٹو ہیں

یہ اتنی ستر پوشی تیری اے شرقی غنیمت ہے　　دیئے جا چندہ بس تعلیم کی غرقی غنیمت ہے

---

[۱] حرف تہجی [۲] تخاطب۔ ڈاگری وغیرہ کی سندوں کے لئے باہر کی یونیورسٹیوں کی احتیاج آج بھی باقی ہے۔

یہ اتنی گوشمالی طفل مکتب کی نہیں اچھی
زباں آتی ہے اس کو بیچ ہے لیکن کان جاتا ہے

ماسٹر ہیں پر نزع میں لڑکوں کی شامت دیکھئے ۔ ان کا نوٹ لیتے ہیں پڑھتے نہیں لیسن ہائے

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی ۔ یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

وضع و روش اطفال کی ہے قوم پر بار گراں
رسموں کا شکوہ اک طرف مذہب کا رونا اک طرف
کہتے ہیں لڑکے بھی کہ کالج سے فرصت ہے کہاں
یہ ساری باتیں اک طرف اور پاس ہونا اک طرف

تعلیم دختران سے یہ امید ہے ضرور ۔ ناچے وہی خوشی سے خود اپنی برات میں

بعض جگہ اکبر اظہار رائے میں حدوں سے باہر ہو جاتے ہیں۔

کہاں جہنم و جنت کہاں عذاب و ثواب ۔ دل اب تو رہتے ہیں کالج کے فیل پاس کے ساتھ

FAIL ناکامیاب ؛ PASS کامیاب۔

کام نکلے گا نہ اے دوست کتب خانوں سے ۔ رہئے کچھ روز کسی محرم اسرار کے ساتھ

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں اُن سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں سے دعا کہیئے

آئے دن نصاب زیادہ اور قابلیت کم ہوتی جاتی ہے۔

دل کو جنبش نہیں چلتی ہیں زبانیں بے سود ۔ بے عمل علم کی تکرار سے کیا ہوتا ہے

ہزار آرائشیں صدقے ہیں اس کی سادہ وضعی پر
نہیں محتاج فیشن علم نے جس کو سنوارا ہے

توپ سر کی پروفیسر پہونچے ۔ جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

اک علم تو ہے بت بننے کا اک علم ہے حق پر مٹنے کا
اک علم کی سب دیتے ہیں سند اس علم میں ماہر کون کرے

سلہ عکسی تصویر سلہ COURSE (کورس) نصاب۔

جب علم ہی عاشق دنیا ہو پھر کون بتائے راہ خدا
جب خضر اقامت[1] پر ہوں فدا تائید مسافر کون کرے

شکر ہے سنی و شیعہ کا ارادہ نیک ہے
طرز طاعت دو سہی ترکیب کالج ایک ہے

گھر میں گو یہ فرق ظاہر ہو کہ حلوا یا پلاؤ
خوان مغرب پر مگر دونوں کے آگے کیک[2] ہے

علیگڈھ کالج اور شیعہ کالج کی طرف اشارہ ہے غالباً یہ شعر ۱۹۱۶ء میں کہا گیا ہے جب شیعہ کالج کی تجویز آل انڈیا شیعہ کانفرنس میں طے ہو چکی تھی۔

ہیں مست اس مزے میں جو ہم نے چکھ لیا ہے
صراف کی نظر نے ہم کو پرکھ لیا ہے

اغیار کے عمل کو ہوں گے کچھ اور میداں
ہم کو تو آب فلک نے کالج پہ رکھ لیا ہے

نہ بھول شہر خموشاں کا نقشہ اے کالج
خیال رکھ کہ یہی ہسٹری کی بستی ہے

کل واقعات دہر کہاں ہسٹری میں ہیں
فوٹو ہے صرف سطح پر پیش نگاہ کا

وہ بھی فقط خیال مصنف پہ قید خود
کیا بن سکے چراغ صداقت کی راہ کا

اکبر کی وسعت نظری اور ذوق تحقیق پر عش عش ہوتا ہے۔ عام طور پر آجکل کی ۹۰ فیصدی تاریخیں بھی آلائشوں سے بلبریز ہوتی ہیں۔

(تعلیم نسواں ایک پنڈت صاحب کی فرمائش سے)

تعلیم عورتوں کو بھی دینا ضرور ہے
لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

حسن معاشرت میں سراسر فتور ہے
اور اس میں والدین کا بیشک قصور ہے

ان پر یہ فرض ہے کہ کریں کوئی بند و بست
چھوڑیں نہ لڑکیوں کو جہالت میں شاد و مست

لیکن ضرور ہے کہ مناسب ہو تربیت
جس سے برادری میں بڑھے قدر و منزلت

آزادیاں مزاج میں آئیں نہ تمکنت
ہو وہ طریق جس سے ہو نیکی و مصلحت

ہر چند ہو علوم ضروری کی عالمہ
شوہر کی ہو مرید تو بچوں کی خادمہ

مذہب کے جو اصول ہوں اس کو بتائے جائیں
با قاعدہ طریق پرستش سکھائے جائیں

---

[1] ٹھہر جانا۔ [2] CAKE (کیک) انڈے کی انگریزی مٹھائی۔ [3] تاریخ عالم

اَوہام جو غلط ہیں وہ دل سے مٹائے جائیں
سکتے خدا کے نام کے دل میں بٹھلائے جائیں

عصیاں سے محترز ہو خدا سے ڈرا کرے
اور حُسنِ عاقبت کی ہمیشہ دعا کرے

تعلیم خوب ہو تو نہ آئے گی دام میں
خالق پہ لَو لگائے گی وہ اپنے کام میں

خیرات ہی سے ہوگی غرض خاص وعام میں
اس کو سکھایا جائے یہ واضح کلام میں

اچھا بُرا جو کچھ ہے خدا ہی کے ہاتھ ہے
نیکی اگر کرے گی تو فطرت کے ساتھ ہے

تعلیم ہے حساب کی بھی واجبات سے
دیوار پر نشان تو ہیں واہیات سے

یہ کیا زیادہ گن نہ سکے پانچ سات سے
لازم ہے کام لے وہ قلم اور دوات سے

گھر کا حساب سیکھ لے خود آپ جوڑنا
اچھا نہیں ہے غیر پہ یہ کام چھوڑنا

کھانا پکانا جب نہیں آتا تو کیا مزا
جوہر ہے عورتوں کے لئے یہ بہت بڑا

لندن کے بھی رسالوں میں میں نے یہی پڑھا
مطبخ سے رکھنا چاہئے لیڈی کو سلسلا

وقت آپڑے تو گاڑھے گزی میں بھی عذر کیا
گھر کے لئے طعام پزی میں بھی عذر کیا

سینا پرونا عورتوں کا خاص ہے ہنر
درزی کی چوریوں سے حفاظت کی ہو نظر

عورت کے دل میں شوق ہے اس بات کا اگر
کپڑوں سے بچے جاتے ہیں گل کی طرح سنور

کسب معاش کو بھی یہ فن ہے کبھی مفید
اک شغل بھی ہے دل کے بہلنے کی بھی اُمید

سب سے زیادہ فکر ہے صحت کی لازمی
صحت نہیں درست تو بیکار زندگی

کھانے بھی بے ضرر ہوں صفا ہو لباس بھی
آفت ہے ہو جو گھر کی صفائی میں کچھ کمی

تعلیم کی طرف ابھی اور اک قدم بڑھیں
صحت کے حفظ کے جو قواعد ہوں وہ پڑھیں

پبلک میں کیا ضرور کہ جا کر تنی رہو
تقلید مغربی پہ عبث کیوں ٹھنی رہو

اس شعر کے بعد سے طرز تخاطب بدل گیا ہے۔ مصلح اب براہ راست عورتوں سے مخاطب ہے۔

داتا نے دھن دیا ہے دل سے غنی رہو
پڑھ لکھ کے اپنے گھر ہی میں دیوی بنی رہو

مشرق کی چال ڈھال کا معمول اور ہے
مغرب کے ناز و رقص کا اسکول اور ہے

دنیا میں لذتیں ہیں نمائش ہے شان ہے
اُن کی طلب کی حرص میں سارا جہان ہے

اکبرؔ سے یہ سُنو کہ جو اس کا بیان ہے
دنیا کی زندگی فقط اک امتحان ہے

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب
"آج" اس کا خوشنما ہے مگر ہوگا "کل" خراب

اعتدال پسندی جوہر عمل ہے۔ "آج" زمانہ حال، "کل" زمانہ مستقبل۔

کالج و اسکول کی بجتی ہے ہر سو تومڑی
چار و ونے آٹھ ہیں اور فاکس معنی لومڑی

نزول وحی مغرب نوجوانوں پر ہے اے اکبر
زبانیں کالجوں کی کھل گئیں اب آپ چپ رہئے

ماسٹر کی بحث اگر مانیں نتیجہ ہے یہی
اب ہیں اچھے جانور پہلے بُرے انسان تھے

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

آج کل وطن پرست اور قابل حضرات کے انھیں شکایتی طویل مضامین سے فضائے ہند گونج رہی ہے۔

تصوف

خدا کے در سے اگر میں نہیں ہوں بیگانہ — تو ذرہ ذرہ عالم ہے آشنا میرا

خداشناسی کے بعد واقعی عالم شناسی نہایت معمولی اور ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا بنتا تھا منصور اس لئے مشکل یہ پیش آئی — نہ کھنچتا دار پر ثابت اگر ہوتا خدا ہونا

بننے اور ہونے میں کتنا عظیم الشان فرق ہے

دلیل خود بیں سے پوچھتی ہے کہ ہم مُسلّم مگر خدا کیا
دل اس کے عاشق سے کہہ رہا ہے کہ اس کے ہوتے یہ ماسوا کیا

اللہ و غیر اللہ کے نازک مسئلہ کو عاشقانہ رنگ میں کس عمدگی سے بیان کر دیا ہے۔

جو تمہارے لب جاں بخش کا شیدا ہوگا — اُٹھ بھی جائے گا جہاں سے تو مسیحا ہوگا

جیسے حضرت عیسیٰؑ۔

غنچۂ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا — میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

سرشاری کا نیا اثر ملاحظہ فرمائیے۔

اک عکس ناتمام پہ عالم کو وجد ہے — کیا پوچھنا ہے آپ کے حسن و جمال کا

صنعت اور صانع کا امتیاز دکھایا ہے۔

عالم فطرت پہ ہے میری نظر بھی اے حکیم — فرق یہ ہے کہ تجھ کو عقل آئی مجھے حال آگیا

حال بھی عقل سے کم نہیں، عارف ہی کو سچے طور پر حال آسکتا ہے۔

انتشار اہل معنی فیض سے خالی نہیں — بوئے خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہوگیا

فریب عقل ظاہر بیں ہے یہ سب ورنہ اے اکبرؔ
ہمیں فانی ہمیں باقی ہمیں پنہاں ہمیں پیدا

ہر شخص کو اس شعر کے معنی اور لطف بقدر عقل و ادراک لے سکتا ہے عجیب عالمگیر بات ہے۔

ہوش بھی بار ہے طبیعت پر — کیا کہوں حال ناتوانی کا

آتا ہے وجد مجھ کو ہر دین کی ادا پر — مسجد میں ناچتا ہوں ناقوس کی صدا پر

رواداری کا بہترین سبق اور بے خودی و معرفت کا دلچسپ ترین درس ہے۔

رند عالی مقام ہے اکبرؔ | بو ہے تقویٰ کی اور شراب کا رنگ

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالبؔ | تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

مری ہستی ہے خود شاہد وجود ذات باری کی | دلیل ایسی ہے یہ جو عمر بھر ہو نہیں سکتی

ثبوت خالق میں بہترین شعر ہے۔ یورپ کے فلاسفر متقدمین و متاخرین سب اس بات پر متفق ہیں کہ خود اپنے وجود کے علم سے انسان بے خبر نہیں ہو سکتا۔

مقام بیخودی میں آرزو کیا عرض مطلب سے | وہاں یہ دل نہیں ہوتا ہے یہ عالم نہیں ہوتا

پھر کیا عالم ہوتا ہے یہ تو وہی جانے جس پر گذری ہو۔

ہم نے مخلوق میں خالق کی تجلی پائی | دیکھ لی آئینہ میں آئینہ گر کی صورت

فدا سو جان سے ہوتا ہوں پروانوں کی ہمت پر
جلے جاتے ہیں لیکن شمع سے لپٹے ہی جاتے ہیں

دل شکستہ ہوں مگر دل میں خدا کا نور ہے | یہ وہ ویرانہ روشن جس میں شمع طور ہے

سمجھے وہی اس کو جو ہو دیوانہ کسی کا | اکبرؔ یہ غزل ہے مری افسانہ کسی کا

پہنچی جو نگہ عالم مستی میں فلک پر | ہم سمجھے مہ نو کو بھی پیمانہ کسی کا

فطرت کا قاعدہ ہے کہ جیسے جذبات ناظر ہوتے ہیں ویسی ہی چیزیں اس کو نظر آتی ہیں۔

نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں | بلبل کی طرح گل بھی ہے دیوانہ کسی کا

گل کو دیوانہ کہہ کر محبوب گل کی لطافت و عظمت کتنے لطیف پیرایہ میں دکھائی ہے۔

اہل دل کو ذکر قمری سے یہ آتی ہے صدا | باغ دل میں چاہئے سرو قد دلجوئے دوست

قمری ایک مشہور چڑیا جو سرو کی عاشق ہے۔ ذکر قمری صوفیوں کے ایک طریقہ ذکر کا نام ہے۔

غنچہ رہتا ہے دل گرفتہ پہلے | رنگ چمن فنا سے گھبراتا ہے

کہتی ہے نسیم آ کے راز فطرت | سنتے ہی پیام دوست کھل جاتا ہے

دیکھئے بند رہنے اور کھلنے کی وجہ کتنی لطیف و نازک بیان کی ہے۔

یہ بزم ساقی عجب جگہ ہے کہ روح بیخود پڑی ہوئی ہے | حواس منطق کی عقل گم ہے دلیل حیران کھڑی ہوئی ہے

فلسفیوں کا ایک گروہ اس کا قائل ہے کہ

تواں در بلاغت بسحباں رسید | نہ در کنہ بے چوں سبحاں رسید
موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی | نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا
افسانہ بہار وزبان نسیم واہ ! | گل جامہ چاک کرتے ہیں اس داستان پر
جو دیکھا غور سے یہ بات ثابت ہو گئی آخر | وہی ظاہر وہی باطن وہی اول وہی آخر
طلب ہے حق کی تو مل آکے ہم آلیسے ستوں سے | نہیں ہے بتکدہ خالی خدا پرستوں سے

شان دماغ عشق کے جلوے سے یہ بڑھی | رکھتا ہے ہوش بھی قدم اپنے سنبھال کے
ستی نشو و نمائے فصل گل کا جوش ہے | ہے ہوا میں فیض ساقی ہر کلی مینوش ہے
بزم میں ایمائے چشم ساقی مینوش ہے | وہ بہک جانے کے خطرہ میں ہے جس کو ہوش ہے
جس کے آنکھیں ہیں وہ ہے دیوانہ چشم آفریں | عالم عرفاں میں جو ذی ہوش ہے بیہوش ہے

ایام شباب اور موسم گل تقوے کی یہاں کیا ہستی ہے
ہر عضو بدن ہے لذت جو ہر قطرۂ خوں میں مستی ہے

ترنم میں در دلبست الفاظ سے نہایت درجہ جوش و اثر پیدا ہو گیا ہے۔

نہ بہار تھی نہ خزاں ہی رہی کسی اہل نظر نے یہ خوب کہا
یہ کرشمۂ شان ظہور ہیں سب کبھی خاک اڑی کبھی پھول کھلا

حقیقتاً ان مظاہر فطرت سے بھی فہم والوں کی آنکھ کو بڑی مدد ملتی ہے۔

حال دل میں سنا نہیں سکتا | لفظ معنی کو پا نہیں سکتا
عشق نازک مزاج ہے بےحد | عقل کا بوجھ اٹھا نہیں سکتا
ہوش عارف کی ہے یہی پہچان | کہ خودی میں سما نہیں سکتا
پونچھ سکتا ہے ہمنشیں آنسو | داغ دل کو مٹا نہیں سکتا
دکھ درد نہیں کہ بانٹ لیجئے | دکھ راہ نہیں کہ ساتھ دیجئے (تسنیم)
مجھ کو حیرت ہے اسکی قدرت پر | علم اس کو گھٹا نہیں سکتا

بعض فلاسفہ کا اعتقاد ہے کہ انتہائے علم ابتدائے حیرت ہے۔

کسی سے پوچھتا میں کیوں تصوف کس کو کہتے ہیں
خود اپنے دل کو دیکھا اور سمجھا اس کو کہتے ہیں

اس سے بہتر تصوف کی تعریف نہیں ہو سکتی۔

چشم ابراہیم و دور انجم و شمس و قمر — اس کو کہتے ہیں نظر اور عقل کا یہ کام ہے
اگرچہ تکلیف نزع میں ہوں سکون خاطر بھی کم نہیں ہے
کسی[1] سے ملنے کی ہیں امیدیں کسی[2] سے چھٹنے کا غم نہیں ہے
جو حرا[3] کے جاننے والے تھے صوفی ہو گئے — داستان بدر[4] والے شیعہ سنی ہو گئے

ورنہ حقیقتاً سب ایک ہیں۔

خلوت ناز میں کیا شان خود آرائی ہے — حسن خود عالم حیرت میں تماشائی ہے
الف بے تے ہی کو پڑھ کر میں سمجھا — الف اللہ کا اور ماسوا بُت
پوچھے کوئی اگر تعصب کیا — کہہ دو اکبر کہ لفظ بے معنی
پوچھے کوئی اگر شریعت کیا — کہہ دو اکبر کہ لفظ با معنی
پوچھے کوئی اگر تصوف کیا — کہہ دو اکبر کہ معنی بے لفظ

آ ب ت کا وصل کس قدر لطف افزا ہے۔ تعصب شریعت اور تصوف کی ایسی جامع اور ایسی سہل تعریف دوسرے الفاظ میں ناممکن، اور لطف یہ ہے کہ جبر و مقالہ کی طرح محض "لفظ" اور "با" اور "معنی" کے الٹ پھیر سے ساری حالتیں پیدا کی گئی ہیں۔

---
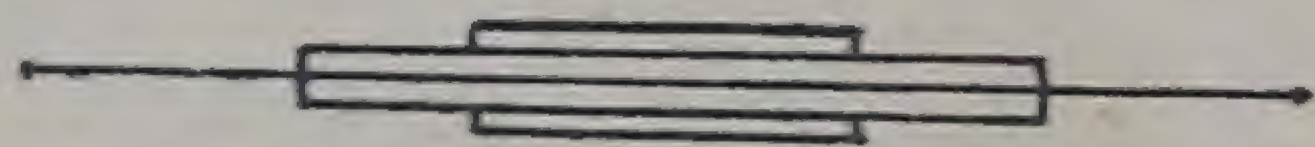
[1] خدا سے [2] کسی چیز شخص سے [3] حرا حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے واقعات پہلے مختلف آسمانی مخلوق کی پرستش پھر خالق کی پرستش کا حال کلام مجید میں مفصل حالات ہیں [4] بدر۔ ایک اسلامی لڑائی ہر تاریخ اسلامی میں مل سکتی ہے۔

تمدن

جس روشنی میں لوٹ ہی کی آپ کو سوجھی
تہذیب کی میں اس کو تجلی نہ کہوں گا

ضروری چیز ہے اک تجربہ بھی زندگانی میں
تجھے یہ ڈگریاں بوڑھوں کا ہمسر کر نہیں سکتیں

مکیں کو دیکھ کر اکبر میں جھکتا ہوں کسی در پر
نظر اپنی مرید طاق و گنبد ہو نہیں سکتی

ظاہر پرستیوں سے بے نیاز رہنا چاہئے۔

رشوت ہے گلوے نیک نامی کا چھرا
عیاشی ہے بدی کے پہئے کا دُھرا

ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری
گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

چار مصرعوں میں چار چیزوں سے اجتناب کرنے کی ہدایت ہے خوشامد اور گستاخی کا موازنہ بھی ہے اور قافیہ ایسے دلچسپ ہیں کہ اثر تو ہوتا ہے مگر نصیحت نہیں معلوم ہوتی۔

آزادی دین کا گرفتار اچھا
شرمندہ ہو دل میں وہ گنہگار اچھا

ہر چند کہ زور بھی ہے اک خصلت بد
واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

اس میں بھی وہی رنگ ہے مگر کہیں کوئی یہ معنی نہ لگائے کہ خوشامد اور مکر اچھی چیزیں ہیں ہرگز نہیں۔ خوشامد بری ہے۔ مکاری کی خصلت خصلت بد ہے۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور
کہتا نہیں تم سے میں کہ اس سے ہو نفور

سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن
اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

جیسا کہ میں اس سے پہلے کہیں عرض کر چکا ہوں، اکبر صاحب نہایت فیاضی سے سر سید کی خدمات قومی و تعلیمی کا اعتراف کرتے رہتے ہیں۔

کہدوں کہ میں خوش ہوں رکھوں گر آپ کو خوش
بجلی چمکاؤں اور کروں بھاپ کو خوش

سیکھوں ہر علم و فن مگر فرض یہ ہے
ہر حال میں رکھوں اپنے ماں باپ کو خوش

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبرؔ
اس میں کیا ہے کہ نقل انگریز کرو

صرف نقل سے آدمی معزز ہونے کے بجائے ذلیل ہوتا ہے۔

شیطاں سے دل کو ربط ہو جاتا ہے — دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی — اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

حریص کو مال کی چاٹ ہر لمحہ رہتی ہے۔ مغرور کو اپنی بڑائی کا خیال ایک منٹ بھی چین نہیں لینے دیتا

شکم ہوتا تو میں اس عہد میں پھولا ہوا رہتا — سراپا دل بنا ہوں اس سبب سے کشتۂ غم ہوں

بے حیا اور خود غرض فربہ خواہ مخواہ مرد آدمی ہو جاتا ہے۔

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں — کافی ہے یہ شرف کہ وفاتی سے کم نہیں

لوگ یہ دیکھتے ہیں کہ فلاں سے اچھے ہیں یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جس سے اچھے ہیں وہ کس پایہ کا ہے اور ہم کتنوں سے بُرے ہیں۔

علمی ترقیوں سے زباں تو چمک گئی — لیکن عمل فریب و دغا ہی کے ساتھ ہیں

سن لیجئے بس یہ چند الفاظ — کہنا مجھ کو نہیں ہے اب کچھ
ہر اک کو ہے صبر کی ضرورت — کوئی بھی نہیں جو پائے سب کچھ

"سب" کی طلب انسان کو کہیں کا نہیں رکھتی ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔ ع

'انسان یہی بس غور کرے اس کا کل میں مرا کیا حصہ ہے'

کینہ و پیکار میں بھی یوں تو ہے اک حظِ نفس — زیست کا اصلی مزا لیکن محبت ہی میں ہے
تقلید غذا میں ہو پپرمنٹ یہی ہے — کر ضبط ہوس سلف گورنمنٹ یہی ہے

پپرمنٹ بچوں کی انگریزی مٹھائی اور لذیذ سفوف، سلف گورنمنٹ = حکومت خود اختیاری۔

پہچان بزرگی کی ہے یہی دل خوف خدا کی زد میں رہے
اندیشہ بہت گستاخ نہ ہو اور وہم ادب کی حد میں رہے

روح کا ہے امتحان اور زندگی کا کورس ہے — ہے مبارک وہ سمجھ قرآن جس کا کورس ہے

کورس = نصاب، کورس = سرچشمہ۔

کیا وہ درست ہو مری نظموں کے فورس سے
فرصت کہاں ہے قوم کو کالج کے کورس سے

فورس = اثر - دباؤ۔

مرجائیں مگر رکھیں گے ثابت قدم اپنا
ہے مرد میں جو دال کبھی گل نہیں سکتی

لفظ مرد کی دال بہت سخت ہے۔ مرد اپنی مردی کبھی چھوڑ نہیں سکتا۔

اپنی محنت کو اپنا آنر[1] سمجھو
اپنے پاؤں کو اپنا موٹر سمجھو

صحبت اچھی تو ہر جگہ ہے آرام
اپنے ہی بدن کو اپنا ٹم گھر سمجھو

اے بی بیو شرم ہی کو تم سمجھو حسن
اور اپنے ہنر کو اپنا زیور سمجھو

بی بی میں جو طرز مغربی ہو تو کہو
احسان ہے یہ جو مجھکو شوہر سمجھو

عالم نے یہاں قبول و رد کو جانا
دیکھا دنیا کو نیک و بد کو جانا

عاقل وہ ہے کہ جس نے ہنگام عمل
اپنی قوت کو اپنی حد کو جانا

اس بت نے کہا کہ تو ہے بے عمل و خرد
کھول آنکھ زمانے کے موافق ہو جا

آخر میں کھلا کہ اس کا مطلب یہ تھا
اللہ کو چھوڑ مجھ پہ عاشق ہو جا

سمجھا رہے تھے مجھ کو کمٹ کی وہ گردشیں
خود کر رہے تھے تاک کی ٹٹی سے سازشیں

نقشے میں دیکھتا تھا وہ پیتے تھے جام مے
میں نے کہا حضور یہ مضمون عجیب ہے

ہیں خود تو مست بادۂ عشرت کے خم سے آپ
الجھا رہے ہیں مجھ کو ستاروں کی دم[2] سے آپ

بولے کہ اس زمین میں کوئی اور شعر بھی
میں نے کہا یہ بات مرے ذہن میں بھی تھی

کوئی شعر بیچ میں رہ گیا ہے جس میں "آپ" کے لفظ سے تخاطب ہوا ہو۔

اللہ رے ارتقائے سگان در حضور
کل تو سے تم ہوئے تھے ہوئے آج تم سے آپ

ہنس کر کہا انھوں نے الٹ بحث کا ورق
گانے لگے وہ گیت میں پڑھنے لگا سبق

محرم اور دسہرہ ساتھ ہوگا
نباہ اس کا ہمارے ہاتھ ہوگا

خدا ہی کی طرف سے ہے یہ سنجوگ
تو کیوں رکھیں نہ باہم صلح ہم لوگ

مالوی کا حال کچھ اور مولوی کا مول کچھ
کہتے ہیں بازار میں اکبر سے تو بھی بول کچھ

بولا وہ دنیا کا سودا تو فقط اک کھیل ہے
عمدگی ہے مال میں اور مول میں جیب میل ہے

---

[1] عزت = HONOUR [2] دم دار ستارہ۔

حافظ

الا یا ایہا الساقی مکن تصنیف نا ولہا — الا یا ایہا الساقی اور کا سا و نا ولہا
دروغ آساں نمود اول ولے افتاد مشکلہا — کہ قرآں سہل بود اول ولے افتاد مشکلہا

لطافت کو نہ چھوڑے رنگ تیری شادی و غم کا
ہنسی آئے تو پھولوں کی جو رونا ہو تو شبنم کا

بدبو مرے گھر نہ اے شرابی پھیلا — ہے تیرا دین نجاستوں کا تھیلا
ہر لحظ طلب شراب کی ہے تجھ کو — ہر دم تیرے منہ سے ہے نکلتا میلا[1]

ہم کو نہیں ان کی عیش و راحت پہ رشک — بے غیرت کو دن اس پہ برساتے ہیں اشک
کافی ہے ہمیں عبادت حق کے لئے — ایک اونٹنی ایک پال پانی ایک مشک

رسول اور اکثر اصحاب صرف انھیں چیزوں پر قانع تھے۔

ہم ایسی کل کتابیں قابل ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں
مزاج شریف ان میں باقی نہیں ہے — تو کیا منہ سے الحمد للہ[2] نکلے

قاعدہ ہے کہ جب کوئی پوچھتا ہے مزاج شریف تو دوسرا جواب دیتا ہے الحمد للہ۔

مارا فلک نشاند بہ پہلوے آں صنم — مدہوش لذتیم و ندانم دگر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز پانیر — کز زن چہ گفت و دل چہ شنید و ملر چہ کرد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز جبرئیل — احمد چہ گفت وا و چہ شنید و خدا چہ کرد

قائم یہی بوٹ اور موزا رکھئے — دل کو مشتاق مس ڈسوزا رکھئے
ان باتوں پہ معترض نہ ہو گا کوئی — پڑھیے جو نماز اور روزا رکھیے

قافیوں کی سحر بھری لطافت میں نصیحت کا ایک دفتر موجود ہے۔

اے اکبر ہمارے دل کا تڑپانا نہیں آتا — کہ جس کو علم تو آتا ہے شرمانا نہیں آتا
بدن میں روح آجاتی ہے جب بے گوری رنگت کے — تو بے انگلش پڑھے روٹی بھی مل سکتی ہے نیٹیو[3] کو

اللہ بہر طور رزق دیتا ہی ہے۔

۱؎ شراب لا۔ ۲؎ غلیظ۔ ۳؎ NATIVE = دیسی آدمی۔

زمیں زیر قدم پا کر بشر نے پانوں پھیلائے　　نہ رکھا یاد اُس نے چرخ کا بالائے سر ہونا

انسانی فطرت ہے کہ ذرا سا آرام پایا اور غفلت میں کھو گئے اور ان ڈراؤنی چیزوں سے بے خبر ہو گئے جو آرام کے ساتھ ہی ساتھ ہیں۔

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے　　خدا کی مار سے ووٹوں کی مار کم کیا ہے

یہ کچھ اس کا غم نہیں آفس میں ہو کر مل میں رہے　　شکم کے ہاتھ نہ پھیلے حدود دل میں رہے

قائل تقدیر یہ تھے قائل تدبیر وہ　　یہ قضا سے اور وہ اپنی حماقت سے مرے

نہ تیر افگنی ہے نہ اب حکمرانی　　نہ وہ وضع ملت نہ قرآن خوانی

نہ باہم ادب ہے نہ وہ مہربانی　　یہی کہتی پھرتی ہے لڑکوں کی نانی

ہر اک شاخ میں پاس اب یہ ہوا ہے　　مرا لال کالج کا ٹھکاکاتوا ہے

قید ہر کروٹ پہ ہر بوسے پہ اک مضمون ہے　　عشق مس کیا ہے نرا قانون ہے قانون ہے

جون ۱۹۲۸ء کے "لیڈر" انگریزی اخبار الہ آباد کے کسی پرچہ میں انگلستان کے ایک دلچسپ مقدمہ کا حال شائع ہوا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ میری صاحبہ نے شوہر پر دعویٰ دائر کیا کہ اس نے ایک بوسہ اُن کے خلاف مرضی لے لیا۔ شوہر صاحب پر جرمانہ ہوا انھوں نے کابینہ وزراء میں اپیل کی مگر وہ مسترد ہو گئی۔

عقد سے کیا ہوں وہ خوش کہتی ہے بیوی ان کی　　بے نماز آئے تو کب ہاتھ لگانے دوں گی

میں مسلمان کی لڑکی ہوں مسلمان ہوں خود　　سامنے بھی انھیں واللہ نہ آنے دوں گی

ساس کہتی ہیں کہ پڑھواؤں گی سمجھا کے نماز　　ایسے مسٹر کو بھلا ہاتھ سے جانے دوں گی

یعنی ہرگز نہ جانے دوں گی۔

علم پر گو غرور بے جا ہے　　جاہلوں سے ہے اجتناب روا

دُنیا

خوب آتا ہے صاحب کو خود اک بات کا کرنا
اور بات پڑے جب تو مرا نام لگانا

وقت آئے۔ ہو تع ہو۔

شیخ درگور و قوم در کالج
رنگ ہے دور آسمانی کا

جسے مزانہ ہو وہ حشر تک کی فکر میں الجھے
بدلتی ہے اگر دنیا تو بدلے ہم سے کیا مطلب

مجھے ہمنشیں ملا کیا انھیں حال دل سنا کر
وہ کہہ آئے ساری باتیں مرے دشمنوں سے جا کر

C. I. D. (سی۔ آئی۔ ڈی) کی طرف خفیف سا اشارہ ہے ورنہ کوئی تخصیص نہیں منافقوں کی باتیں۔

زندگانی کا مزا ملتا تھا جن کی بزم میں
ان کی قبروں کا بھی اب مجھ کو پتہ ملتا نہیں

تعجب نخوت اہل زمیں پر مجھ کو آتا ہے
یہ اس پر کیوں اکڑتے ہیں کہ جس میں مر کے گڑتے ہیں

مذہب چھوڑا یا عشوہ دنیا نے شیخ سے
دیکھی جو ریل اونٹ سے آخر اتر پڑے

کبھی ہے صبح عید اس میں کبھی شام محرم ہے
یہ عالم چشم بینا کے لئے عبرت کا عالم ہے

عروج ہستی فانی پہ کیا سرگرم عشرت ہوں
فروغ چند ساعت ہے یہاں مثل شرر اپنا

عالم ایجاد بھی اک عالم موہوم ہے
جتنی تعمیریں ہیں یاں کی سب ہیں وہ تعمیر خواب

دنیا کی تعمیرات کو خواب کی تعمیرات کہنا کتنی اچھوتی تشبیہ ہے۔

چشم نرگس سے کوئی حال چمن کا پوچھے
دیکھتے دیکھتے کیا کیا گل خنداں نہ رہے

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

پئے تسلیم سر جھکتا تھا سب کا جن کے ایواں میں
انھیں کی خاک اب پامال ہے گور غریباں میں

دنیا کرتی ہے آدمی کو برباد
افکار سے رہتی ہے طبیعت ناشاد

دو ہی چیزیں ہیں بس محافظ دل کی
عقبےٰ کا تصور اور اللہ کی یاد

شباب عمر نے کھویا طمع نے دین لیا　　فلک نے ہم سے بڑی دولتوں کو چھین لیا

جو آکے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا　　جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

دنیا سے تعلق رکھنے میں ہرگز نہیں یہ تمہید بری
کیا خوب کہا ہے اکبرؔ نے احسان اچھا امید بری

بنیاد دین ہوائے دنیا نے منہدم کی　　طوفان نے شجر کو جڑ سے اکھاڑ ڈالا

آماجگاہ تیر حوادث ہوں رات دن　　پتلا بنا ہوا ہوں غم روزگار کا

محرومی کا شکوہ بھول گئے یکتائی پہ اپنے فخر رہا
پیش در دولت میرے سوا جب کوئی گدا باقی نہ رہا

کہاں ہیں جم و کسریٰ۔ کدھر ہے وہ بزم انکی　　فنا کا تسلسل ہے کسی کو نہیں رہتا

غرور تھا۔ نمود تھی۔ ہٹو بچو کی تھی صدا　　اور آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

برباد و منتشر بھی ہو گے اس ہوا میں　　کس زعم میں اٹھے ہو تن کر تم اے بگولو

اسی لئے رہ گئی ہیں آنکھیں مرے مٹنے کا رنگ دیکھیں
سنوں وہ باتیں جو ہوش اڑائیں اسی لئے ہیں یہ کان باقی

ہمیشہ پیش نظر ہیں وضو شکن منظر　　اس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی

حقیقت یہ ہے کہ ترغیبات نفسانی سے بچنا بہت مشکل کام ہے۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی　　نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

کیسے کیسے زر نگار ایوان ملے ہیں خاک میں　　ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے

اے صبا اس باغ میں ترا عمل ہے مشتبہ　　ہنس دیئے گل ہو گے غنچے یا پریشان ہو گئے

مفتوں ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے　　آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی نے پھول بن کے

جہاں فانی کا حشر ہی کو خیال کر مستقل نتیجہ　　یہاں تو پیہم یہی تردد یہی تغیر رہا کرے گا

ہے دو روزہ قیام سرائے فنا نہ بہت کی خوشی نہ ہے کم کا گلا
یہ کہاں کا فسانہ سود و زیاں جو گیا وہ گیا جو ملا وہ ملا

جو گونج رہا تھا خوشیوں سے اس قصر پہ کل رویا میں بہت
کوئی متنفس تھا نہ وہاں باہر بھی پھرا اندر بھی گیا

قال جہاں معشوق جو تھے خالی ہیں پڑے مرقد اُن کے
یا مرنے والے لاکھوں تھے یا رونے والا کوئی نہیں (آرزو)

کل کی امیدوار ہے دنیا عالم انتظار ہے دنیا
بے خبر رکھتی ہے حقیقت سے ہوش پر میرے بار ہے دنیا

فردائے قیامت سے مراد ہے۔

چال دنیا کی تمھیں محسوس ہو دشوار ہے یہ زمیں چلتی ہے تیزی سے مگر ہلتی نہیں

یورپ کے زبردست فلسفی برکلے (BERKELEY) بھی ایک معترض کے جواب میں یہی کہتا ہے کہ زمین کی چال "معلوم" ہوتی ہے محسوس نہیں ہوتی۔

نئی ترکیب اب شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی خدا کی حمد کیجے ترک بس مجھ کو برا کہئے

محض بری چیزوں کو بُرا کہنے سے یا بُری چیزوں سے بچ جانے سے انسان اچھا نہیں ہو سکتا۔ اچھے افعال ہی سے اچھائی پیدا ہو سکتی ہے۔

زبان

کرتا ہوں میں جو آہیں کہتے ہیں ہے یہ مہمل　　　یہ اعتراض ان کے دل کی زبان پر ہیں

زبان کی زبان پر اعتراضات ہو سکتے ہیں دل کی زبان پر اعتراض کرنا شعور کے خلاف ہے۔

نہ روح مذہب نہ قلب عارف نہ شاعرانہ زبان باقی
زمیں ہماری بدل گئی ہے اگرچہ ہے آسمان باقی

صورت لیلیٰ نہ دیکھی پڑھ لیا دیوان قیس　　　شاعری آئی نہیں لیکن زباں داں ہو گئے

جن کے دلوں میں سچا درد محبت نہیں ہے وہ حقیقی شاعر نہیں ہو سکتے۔

اُردو پہ یہ خدمت برگد ہے بار　　　خیر اب اس کام کو بھاشا کرے

انگریزی کے غلط سلط اور بے موقع الفاظ کا استعمال اُردو پر حقیقتاً بار ہے۔

ہیٹ ہی کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول　　　دخل انگریزی پہ اُردو کی شکایت ہے فضول
وہ مس بولی میں کرتی آپ کا ذکر اپنے فادر سے　　　مگر اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کے مافک ہے

FATHER = پدر، مافک = موافق ۔ خیالات اور زبان میں کس قدر تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔

وسعت ہو زباں کی ادھر جھک　　　متروک کو دیکھ کر تو مت رُک

کس قدر عمدہ ہدایت ہے ورنہ زبان محدود ہوتے ہوتے ایک روز غائب ہو جائے گی۔

قوم کیسی کس کو اب اُردو زباں کی فکر ہے　　　غم غلط کرنا ہے بس اور آب و ناں کی فکر ہے
ایک پر اجماع اکثر کا بہت مشکل ہے اب　　　سب ہیں مضطر اپنے منہ مٹھو میاں کی فکر ہے

اپنے منہ میاں مٹھو بننا خود اپنی تعریف آپ کرنا۔

ہو نہیں سکتی مرتب کوئی بزم سامعیں　　　ہر زباں کو ایک تازہ داستاں کی فکر ہے

بتوں کی مدح سے کل شاعری اردو کی مملو ہے
شکست اُردو جو پائے گی تو میں سمجھوں گا بت ٹوٹا

بھائیو تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو　　　بعد مرنے کے کھلے گا کہ یہ تھی کام کی بات
بسکہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں　　　کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

ہندی کا رسم الخط اُردو سے یوں تو مشکل نہیں ہے مگر شکست ہندی شکست اُردو سے زیادہ دشوار ضرور ہے۔

ہم اُردو کو عربی کیوں نہ کریں اُردو کو وہ بھاشا کیوں نہ کریں
بحثوں کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں نہ کریں

واقعی غریب اُردو پر بڑی مصیبت ہے ایک طرف عربی و فارسی کے الفاظ اس کثرت سے آتے ہیں کہ توبہ بھلی دوسری طرف سنسکرت اور بھاشا کی وہ بھرمار ہے کہ ساری فصاحت رفوچکر ہوگئی ہے۔

دل ہی باقی نہیں اے دوست مضامیں کیسے آپ موتی کے طلبگار ہیں دریا بھی تو ہو

"جامہ ندارم دامن از کجا آرم"

اس عہد میں شاعر کے لئے قوت نہیں ہے اس باغ میں طوطی کے لئے توت نہیں ہے
لفظوں ہی کے چکر میں ہیں اب افعل و فعلُ چرخہ ہی چلا کرتا ہے اور سوت نہیں ہے
معنی کی گرہ کہاں کھلی ہے الفاظ ہی کی دکان کھلی ہے
ہر واہ کی تہ میں ہے یہاں آہ دم بند ہے اور زبان کھلی ہے

واہ کا 'و' جدا کر کے دیکھئے 'آہ' نظر آئے گی۔

ہم سے چھن کر ہوگئی بزم ترقی کے سپرد سچ کہا مرزا نے اب اُردو بھی کورٹ ہوگئی

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن

اے فلک انگلش و جرمن ہو مبارک تجھ کو ہم کو تو اُردو ہندی میں بسر کرنا ہے

جو لوگ اپنی مادری زبان سے ناآشنائے محض ہوتے ہیں ان کے لئے یہ شعر تازیانۂ عبرت ہے۔

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردّی بڈھوا اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

منطق کا ایک مغالطہ یہ ہے کہ بجائے دلیل لانے کے کسی بات کی صحت ثابت کرنے کے واسطے کسی بڑی ہستی کا حوالہ دیدے۔

کہاں اُردو ہندی میں زر نقد وہی اچھا ہے جو گنتا منیؑ ہے
مرے نزدیک تو بے سود یہ بحث میانِ ہمدم چنتا منی ہے

ؑ روپیہ پیسہ = MONEY

چنتامنی کا قافیہ گنتامنی ڈھونڈھ لینا اکبر ہی کا کام ہے اور پھر اس طور پر سج دیا ہے کہ آورد نہیں معلوم ہوتی

پپیہے سے کہتے ہیں اب "پی" کو چھوڑ — ضرورت ترقی کی ہے "کیو" پکار

(Q) کیو (P) پی کے بعد ہے ترقی کو رومن میں لکھیے تو (Q) کیو سے لکھنا ہوگا۔

ترجمے والے کرتے ہیں محنت — پا لیتے ہیں اپنی اُجرت
سینے ہوجاتے ہیں خالی — بھرتی جاتی ہے الماری
دل کا کورس تو ٹھہرا غربی — لب پہ اُردو ہو یا عربی
اُردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرا القیس بنیں — پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں
ڈال دے جان معانی میں وہ اُردو یہ ہے — کروٹیں لینے لگے طبع وہ پہلو یہ ہے
دل چھوڑ کر زبان کے پہلو پہ آپڑے — ہم لوگ شاعری سے بہت دور جا پڑے
سرحد پر باغیوں کو سکھ ماریں گے — گردن اُردو کی رام رکھ ماریں گے

دوسرے مصرعہ کے قافیہ کے لئے طبع آزمائی ہوئی تھی۔

قائم رہے البشیر کا یہ پرچہ — ہم بھی مضمون کوئی لکھ ماریں گے
سچ کہتے ہیں حضرت کرامت اکبر — رخصت ہوئی فارسی تو اُردو بھی گئی

کرامت حسین صاحب جج ہائی کورٹ الہ آباد۔ ظاہر ہے کہ اُردو میں فارسی کے الفاظ بہت زیادہ شامل ہیں۔

علم پر بھی عشق کی تاثیر آخر پڑ گئی — تخلیہ کی بات پبلک کے دلوں میں گڑ گئی
وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں — یہ اثر اس کا ہوا اُردو سے ہندی لڑ گئی
معنے جنگ اُردو ہندی — میں یہ سمجھا بہ عالم رندی
یعنی ہے اس میں لطف وصل بتاں — خوب ملکر لڑی زباں سے زباں
اُردو کے تین ربع کے مالک ہیں خود ہنود — پھر کیا سبب جو اس سے انھیں انحراف ہے
یعنی اُردو ہے چیز انھیں کے مذاق کی — اُردو کی تین جز وہی صاف صاف ہے
ایک قسم کی دال۔

دل میں جو پڑ گئی ہے گرہ کھول ڈالیئے — اک دم میں کل متاع سخن تول ڈالیئے
ترکیب ہے ترقی اُردو کی بس یہ خوب — جو آپ بول سکتے ہیں سب بول ڈالیئے

آیندہ اُردو زبان کا نمونہ

بابو جی کا وہ بُت ہوا نوکر — غیر اس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتے ہیں وہ نہ جلئے گا — میرے انڈر ہیں کام دیتا ہے

کہا جو میں نے کہ ان کی ادا انوکھی ہے — بتوں نے کہدیا اردو میاں کی چوکھی ہے
قصہ منصور سُنکر بول اٹھی وہ شوخ مس — کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو کیوں پھانسی دیا
لفظوں میں اجتماع نہ معنی میں نور ہے — ویران آج کوچہ بین السطور ہے
شبلی کا خامہ صفحہ ہستی سے اُٹھ گیا — اب مد آہ و لوح دل ناصبور ہے

وہ درمیانی جگہ جو دو سطروں کے بیچ میں ہوتی ہے۔

زبان سنسکرت اس وقت پنڈت جی سے کہتی ہے — کہ اچھا ہے مری الفت تمہارے دل میں رہتی ہے
میں خوش ہوں گی بلا شک تم اگر مجھ کو جلاؤ گے — مگر وھسکی پلاؤ گے کہ گنگا جل پلاؤ گے
جیوں گی میں کہ پھر تم کو ملاؤں دیوتاؤں سے — بھڑاؤ گے مجھی کو یا کہ دنیا کی بلاؤں سے

اگر شوق عبادت ہے تو میں موجود ہوں اب بھی
اگر دنیا کا سودا ہے تو میں کب اس سے راضی تھی

یہ کہتے تھے اک لالہ باوقار — کہ عربی حروف اب تو ہم پر ہیں بار
رُکی ہے انھیں سے ہماری نمود — یہ کھسکیں تو ثابت ہو اپنا وجود
کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال — ہٹے حائے حطی رہیں رام لال

حرام اور حلال سے "ح" کو نکال ڈالئے تو رام لال رہ جائے گا۔

زمانہ

رنگ اڑانا اہل یورپ کا تو ہے اکبر محال
مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

اکثر تقلیدیں نامکمل ہوتی ہیں اور پھر "چیتا" اپنی کھال نہیں بدل سکتا۔

ذرا تو پختہ شریفوں کو باغ دہر میں دیکھ
انھیں کا حال ہر اک سے زیادہ خستہ رہا

مجھ کو دم بھر بھی زمانے میں نہیں چین نصیب
مضطرب شیشہ ساعت میں ہوں بالو کی طرح

پرانے زمانہ کی گھڑی جس میں ریگ بھر دی جاتی تھی اور اس کے گرنے سے وقت کا اندازہ کیا جاتا تھا۔

عوض قرآن کے ہے اب ڈارون کا ذکر یاروں میں
جہاں تھے حضرت آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں

ڈارون کا ذکر پہلے مفصل آچکا ہے۔

مذہب چھوڑو ملت چھوڑو صورت بدلو عمر گنواؤ
صرف کلر کی کی امید اور اتنی مصیبت توبہ توبہ

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہو گیا چہلم اس کا
پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

اخبار وجرائد کی غیر ذمہ دارانہ روش کا فوٹو کھینچا گیا ہے۔

ہم فلسفہ کو کہتے ہیں گمراہی کا باعث
وہ پیٹ دکھاتے ہیں کہ شیطان یہی ہے

قدم شوق بڑھے ان کی طرف کیا اکبر
دل سے ملتے نہیں یہ ہاتھ ملانے والے

اِدھر ہم سے بھی باتیں آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
اُدھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیماں ہوتے جاتے ہیں

دو دلی اور دو رنگی اس زمانہ میں بہت کثرت سے ہے۔

توجہ اپنی کیا ہو فن شاعری کی طرف
نظر ہر ایک کی جاتی ہے عیب ہی کی طرف

حسن کے دیکھنے والے اور تنقید کے اصلی معنی سمجھنے والے کتنے ہیں۔

کامل کم ہیں اور اہلِ ارشاد بہت
ساحر کم ہیں ملیں گے صیّاد بہت

ہے بزم سخن کا حال یہ اے اکبر
شاعر کم ہیں مگر ہیں اُستاد بہت

ہر شخص بجائے خود استاد بنا بیٹھا ہے۔

لفظوں کے چمن بھی اس میں کھل جاتے ہیں　　بے ساختہ قافئے بھی مل جاتے ہیں
دل کو مطلق نہیں ترقی ہوتی　　تعریف میں سر اگرچہ ہل جاتے ہیں

یہ اس شاعری کا ذکر ہے جس میں لفاظی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

اوروں کی کہی ہوئی جو دہراتے ہیں　　وہ فونوگراف کی طرح گاتے ہیں
خود سوچ کر حسب حال مضمون نکال　　انسان یونہی ترقیاں پاتے ہیں

جب تک جدت تخیل نہ ہو اور صلاحیت فکر نہ ہو ترقی نہیں ہو سکتی۔

اب تو ہے عشق بتاں میں زندگانی کا مزہ　　جب خدا کا سامنا ہوگا تو دیکھا جائے گا
"آج تو چین سے گذرتی ہے　　عاقبت کی خبر خدا جانے"
رہے نہ اہل بصیرت تو بے خرد چمکے　　فروغ نفس ہوا عقل کے زوال کے بعد

کس قدر عمدہ دلیل پیش کی ہے۔

تہذیب کے خلاف ہے لائے جو راہ پر　　اب شاعری وہ ہے جو اُبھارے گناہ پر

SELF CULTURE (سلف کلچر) کا قابل مصنف لکھتا ہے اور رسکن ایسا مدبر کہتا ہے کہ آجکل کا ہر دلعزیز ادب نوجوان کے لئے نہایت مضر ہے۔

ہیں مشاغل محفل احباب کے ناگفتہ بہ　　دم بخود بیٹھا ہے اکبرؔ ساخنداں ان دنوں
وفا بتوں میں نہیں ہے خدا کو پائیں کہاں　　اسی فراق میں کٹتے ہیں دن کہ جائیں کہاں
بڑے جو ہیں وہ بے ثمر جو خورد ہیں وہ خیرہ سر　　عطا نہیں۔ کرم نہیں۔ ادب نہیں۔ وفا نہیں

لف و نشر مرتب ہے۔

معترض ہو نہ مری عزلت و خاموشی پر　　کیا کروں میں جو کوئی محرم اسرار نہیں
شور تحسین تو سخن پر ہے تمہارے اکبرؔ　　زر کی جھنکار بھی سنتے ہو کہیں واہ کے ساتھ
مخلصانہ جو نہ ہو مدح تو کیا لطف آئے　　چشم غماز کی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ
وہی انساں وہی آنکھیں وہی جینا وہی مرنا　　کہیں اللہ اکبر ہے کہیں ایجاد کا غل ہے
نگاہ ناز بتاں پر نثار دل کو کیا　　زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کر لی

دنیا میں امر حق کو کس طرح صاف کہیے ... کرتا ہے دشمنی وہ جس کے خلاف کہیے

ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی دیکھیں ... اُٹھے ہیں جو بگولے برباد ہوں گے تن کے

اس مضمون کو ایک جگہ اور کہہ چکے ہیں کہ بگولے خود اپنی ہوا میں برباد ہو جائیں گے۔

دست گلچیں پھر رہا ہے شاخ گل پر بے دریغ ... کون سنتا ہے چمن میں عندلیب زار کی

ہر سر میں ہے یہ سودا وائم چرا نگویم ... وہ کون ہے جو واعظ بن کر اٹھا نہیں ہے

بے پاس کے تو ساس کی بھی اب نہیں ہے آس ... موقوف شادیاں بھی ہیں اب امتحان پر

ملاحظہ ہو وہ نظم "سناؤں اک تمھیں فرضی لطیفہ"

مرے شکوؤں سے کیوں بھرتے ہیں وہ اخبار کے کالم ... کوئی یہ شیخ سے کہدے کہ سنئے قبلۂ عالم

جدھر صاحب ادھر دولت جدھر دولت ادھر چندہ ... جدھر چندہ ادھر آنر جدھر آنر اُدھر بندہ

نیست کس مصروف کار دیں بقلب مطمئن ... یک فنائی الآنر است ویک فنائی الڈارون

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں ... کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اللہ اللہ یہ حالت عداوت اور زمانے کا یہ انقلاب گویا ذکر خدا باعث عجب ہے اور نعوذ باللہ مستوجب تادیب۔

اتو کھے ہیں مشاغل حضرت اکبر کے ان روزوں ... "الم ترکیف" بیٹھے پڑھ رہے ہیں فیل خانے میں

ایک سورۂ قرآنی ہے جس میں قدرت یزدانی کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔

مریدان کے تو شہروں میں اڑے پھرتے ہیں موٹر پر
نظر آتے ہیں لیکن شیخ جی اب تک میانے میں

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے ... بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

اکثر سند یافتہ حضرات کی مکمل حیات یہی ہوتی ہے۔

جیب سے مفروری زر بے تحاشا دیکھیے ... جلوۂ بازار مغرب کا تماشا دیکھیے

آنے والے نہ رہے انجمن دل کی طرف ... کوئی کالج کی طرف ہے کوئی کونسل کی طرف

اصل تلفظ COUNCIL (کاؤنسل) ہے کونسل نہیں ہے۔

ہر حریف زباں نہیں ہے شمع اخلاص ... جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمساز جدا　　دور فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا

فونوگراف = انگریزی باجا (PHONOGRAPH)

وجد یاروں کو ہے اس بزم میں حیران ہوں میں　　سر سے آواز جدا راگ سے ہے ساز جدا

ہمارا بھی کوئی ہمدرد ہے اس وقت دنیا میں　　پکارا ہر طرف منھ سے کسی کے ہم نہیں نکلا

بہت سے بچے ہوں اور پکاریئے کہ یہ مٹھائی کون لے گا تو "ہم ہم" کی صدا فضا میں گونج جائیگی

اس عام مشاہدہ سے استقرا کیا ہے۔

آپ کے ہاتھوں میں میں ہاتھ نہیں دے سکتا　　داد دیتا ہوں مگر ساتھ نہیں دے سکتا

یہ مرض عالمگیر ہے۔

سر تراشا ان کا کاٹا ان کا پانوں　　وہ ہوئے ٹھنڈے گئے یہ بھی پگھل

شیخ کو یخ کر دیا مومن کو موم　　دونوں کی حالت گئی آخر بدل

شیخ کا سر "ش" کاٹ دیجئے، یخ رہ گئے، یعنی برف سے ٹھنڈے ہو گئے۔ مومن کا پانون یعنی 'ن' کاٹ دیجئے موم رہ گئے یعنی پگھل گئے۔

جہاں سوئی گھڑی کی ہوتی ہے وقت اس کو کہتے ہیں
گئی چوری تو ہم سمجھے زمانہ اس کو کہتے ہیں

کس کو امید ہے اس کی کہ یہ اچھا ہوگا　　کون اس وقت میں کرتا ہے عیادت میری

جس وقت لوگ مریض کے شفا سے مایوس ہو جاتے ہیں ترک عیادت کر دیتے ہیں۔ عیادت بھی کس قدر بلوث ہے۔

تاکید عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے　　پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

بدل گئی ہے ہوا ایسی کچھ زمانے کی　　دعائیں مانگتا ہوں ہوش میں نہ آنے کی

یہ قومی ترقی بھی ہے پریوں کا فسانہ　　کانوں سے سنا سب مگر آنکھوں سے نہ دیکھا

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا　　حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے　　شاہ اڈورڈ کی دہائی ہے

پرچہ رکھا جو اس نے میں یہ سمجھا　　پاکٹ میں یہ بیس روپے کا نوٹ گیا

گھر پر کھولا تو بس یہی لکھا تھا
کیا شعر تھے واہ واہ میں لوٹ گیا

سچ کہا اکبر نے ہاتھاپائی کا ہے کیا علاج
زور منطق سے تو ممکن ہے انھیں ساکت کریں

ARGUMENTUMAD BACULUM منطق کا ایک مغالطہ یہ ہے کہ دلیل نہ لاسکیں تو لاٹھی ڈنڈے سے حریف کو خاموش کردیں۔

کوٹھی میں جمع ہے نہ ڈیپازٹ ہے بنکیں میں
قلاش کردیا مجھے دوچار تھینکس نے

DEPOSIT = جمع - THANKS = شکریہ۔

کل مست عیش وناز تھے ہوٹل کے ہال میں
اب ہائے ہائے کر رہے ہیں اسپتال میں

کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر۔

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند
کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں
یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

کچہریوں میں ہے پرسش گریجویٹوں کی
سڑک پہ مانگ ہے قلیوں کی اور میٹوں کی

نہیں ہے قدر تو بس علم دین وتقوے کی
خرابی ہے تو فقط شیخ جی کے بیٹوں کی

ان کو کیا کام ہے مروت سے
اپنے رخ سے یہ منہ نہ موڑیں گے

جان شاید فرشتے چھوڑ بھی دیں
ڈاکٹر فیس تو نہ چھوڑیں گے

محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے
تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جاکر کود اچھل آیا

بہت سے خودساختہ لیڈر اسی قماش کے ہوتے ہیں۔

کوئی ہنس رہا ہے کوئی رو رہا ہے
کوئی پا رہا ہے کوئی کھو رہا ہے

کوئی تاک میں ہے کسی کو ہے غفلت
کوئی جاگتا ہے کوئی سو رہا ہے

کہیں ناامیدی نے بجلی گرائی
کوئی بیج امید کے بو رہا ہے

اسی سوچ میں میں تو رہتا ہوں اکبر
یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے

سادہ سے سادہ الفاظ میں جذبات وخیالات کا ایک عالم نظر آتا ہے خصوصاً اس مصرعہ کی تو تعریف ہی نہیں ہوسکتی "یہ کیا ہو رہا ہے یہ کیوں ہو رہا ہے۔"

اک بات ہم نے کہدی ورنہ یہ وقت وہ ہے — تم بھی ہو زخمیوں میں ہم بھی ہیں بسملوں میں

حکم گردوں ہے کہ حلقۂ چھوڑ دو صوفیوں کی نسبت — یا پریس میں جاؤ یا اسکول میں

صاحب سلامت اب بھی میری شیخ جی سے ہے — لیکن چھٹے چھ ماہے وہی راہ ہاٹ میں

دو محاورے "چھٹے چھ ماہے" شاذونادر اور "راہ ہاٹ" کس قدر خوبی سے نظم ہوئے ہیں۔

چین کے ساتھ ہم اس وقت بھی رہ سکتے ہیں — شرط یہ ہے کہ فقط پیٹ ہو، اور آنکھ نہ ہو

بصارت سے آدمی واقعات دنیا کو دیکھکر اثر پذیری کو مجبور ہو جاتا ہے۔

دیوار شکستہ نے ترقی کی دعا کی — گردوں کی عنایت سے سڑک بن گئی کٹ کے

میرے نسبت جو ہوا ارشاد وہ میں نے سُنا — یہ تو کہئے اپنی نسبت آپ کی کیا رائے ہے

کہاں کا گیان اور دھیان کیسا خدا کہاں کا کہاں کا وشنو
عمل کے بدلے اسی کا غل ہے ببیں وبشنو ہبیں وبشنو

وشنو اور وبشنو کا قافیہ لسان العصر کے سوا کس کو سوجھ سکتا تھا۔

صدائے فونوگراف بشنو ببیں تماشائے لمپ برقی
زسینہ و دل محو تجلی خموش کن شمع ہائے شرقی

بھائیو گیہوں کا آٹا ڈھائی آنہ سیر[۱] ہے — پھر عجب کیا ابن آدم زندگی سے سیر[۲] ہے

[۱] وزن [۲] آسودہ

صاف کہتا ہوں رہیں خوش یا ہوں ناخوش مولوی — آسماں اب چاہتا ہے مولوی کش مولوی

تعلیم اس کی اچھی جو اپنے گھر میں خوش ہو — مذہب اُسی کا اچھا جس کو پولس نہ پکڑے

نبوت کا زمانہ اور تھا اب اور جھمیلا ہے — وہاں سینے میں قرآں تھا یہاں سینے میں بسکٹ ہے

طاعون کی بدولت ان کو بھی ارتقا ہے — جو مارتے تھے مکھی اب مارتے ہیں چوہے

چوہوں پر طاعون کا اثر بہت جلد ہو جاتا ہے اور وبا کے جراثیم مرے ہوئے چوہے سے بہت جلد منتشر ہو کر فضا میں پھیل جاتے ہیں۔

حمد

غرور اُنھیں سے ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبرؔ — سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

صفات حق تعالےٰ فہم منکر میں نہیں آتے — وہ کہتا ہے کہ گویا کچھ نہ ہونا ہے خدا ہونا

تصور جب اس کا بندھا تو پھر نظر میں کیا رہا — نہ بحث این و آں رہی نہ شور ما سوا رہا

آئے گی تجھ کو نظر صانع قدرت کی جھلک — سامنے کچھ نہ رکھ آئینہ فطرت کے سوا

کیا پھولوں نے شبنم سے وضو صحن گلستاں میں — صدائے نغمۂ بلبل اٹھی بانگ اذاں ہو کر

ہوائے شوق میں شاخیں جھکیں خالق کے سجدے میں — ہوئی تسبیح میں مصروف ہر پتی زباں ہو کر

زبان برگ گل نے کی دعا رنگین عبارت میں — خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہو کر

بہار آئی ہے اک آئینہ معنی نشاں ہو کر — چمن میں بوئے گل پھیلی ہے تیری داستاں ہو کر

تدبیر سدا راست جو آتی نہیں اکبرؔ — انسان کی طاقت کے سوا بھی ہے کوئی چیز

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

معرفت خالق کی عالم میں بہت دشوار ہے — شہر تن میں جبکہ خود اپنا پتا ملتا نہیں

بیگانہ سرور سے ہے وہ دل جو ترے لئے غمناک نہیں
سرمہ وہ بصر افروز نہیں جس میں ترے در کی خاک نہیں

سالک کو دم تیغ ہے قطع رہ توحید — دو ہو گیا اک آن میں چوکا جو ذرا بھی

انھیں نے عطا کی تھی جان حزیں — ہوا خوب انھیں پر فدا ہو گئی

(غالبؔ) جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

آئینہ رکھدے بہار باغ غفلت ہو چکی — دل سنوار اپنا جوانی خود آرا ہو چکی

بے خودی کی دیکھ لذت کر کے ترک آرزو — ہو چکی حد ہوس شوق تمنا ہو چکی

حسن مطلق کے تصور سے بھی لے دو ایک جام — روئے زیبا ہو چکا زلف چلیپا ہو چکی

میں زباں پہ لاؤں کیونکر وہ حدیث حسن مطلق
کہ نہ بار لفظ اٹھائے گی نزاکت معانی

اے صانع ازل تیری قدرت کے میں نثار | کیا صورتیں بنائی ہیں مشت غبار سے

کہ ہر صورت کلیجہ سے لگا لینے کے قابل ہے۔

تمھاری بحثوں سے میرے شبہے خدا کی ہستی سے کم نہ ہوتے
مگر یہ بات آگئی سمجھ میں خدا نہ ہوتا تو ہم نہ ہوتے

ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ خود اپنی ہستی ہستی خالق کی شاہد ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا | بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے
ذہن میرا وہ قیامت کہ دو عالم پہ محیط | آپ ایسے کہ مرے ذہن میں آہی نہ سکے

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم۔

زبانوں کو نہیں کھلنے کی طاقت بزم میں تیری | نگاہوں کو نہیں اٹھنے کا یارا تیری محفل میں
ہوگیا بدر ہلال اس کا سبب روشن ہے | روز گھستا تھا ترے در پہ جبیں تھوڑی سی

کیا جذبہ عشق نے مرے اثر رہی غیرت حسن پہ ان کی نظر
پس پردہ صدا تو سنائی مجھے مگر اپنا جمال دکھا نہ سکے

معراج کی تصویر حبیب ومحبوب کی محفل کا نقشہ کس انداز سے کھینچا ہے۔

آپ کو پردہ نشینی ہی جو رہتی ہے پسند | مجھکو کیوں مفت میں دیوانہ بنا رکھا ہے
آپ کے شہرۂ رحمت نے جو ڈھایا ہے غضب | ایک عالم کو گنہگار بنا رکھا ہے
ترے پرتو سے اے جانِ جہاں ظلمت میں نور آیا | ترے فیض تجلی سے یہ ذروں میں شعور آیا
ذہن میں جو گھر گیا لا انتہا کیونکر ہوا | جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیونکر ہوا

خدا کی اس سے بڑی تعریف میں نے آج تک نہ دیکھی نہ سنی۔

خدا سے مانگ جو کچھ مانگنا ہو اے اکبر | یہی وہ در ہے کہ ذلت نہیں سوال کے بعد
ہر ذرہ چمکتا ہے انوارِ الٰہی سے | ہر سانس یہ کہتی ہے ہم ہیں تو خدا بھی ہے
اللہ کا حال کچھ نہ پوچھو | دیکھا نہیں نام رکھ لیا ہے
جاری طریق فضل وعطا سب کے ساتھ ہے | دیکھو جو غور سے تو خدا سب کے ساتھ ہے
تنویر چاہتا ہے گر آتش دروں کی | ہو اس کا محو جس نے مٹی میں روح پھونکی

نہیں سائنس واقف کارِ دیں سے　　　خدا باہر ہے حد دُوربیں سے
اثبات خدا کو منطقی اُٹھ نہ سکا　　　خاک حیرت سے ذہن ہی نہ اُٹھ سکا
اللہ رے نزاکت وجود باری　　　ثابت ہونے کا بار بھی نہ اُٹھ سکا

پیارا ہے فقط اللہ کا نام آرام اسی سے روح کو ہے
اور یوں تو حوادث بے حد ہیں دنیا میں بہت افسانے ہیں

بہ رہا ہے لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحرِ فنا　　　درد کے قابل فقط یا حیّ یا قیّوم ہے

حیّ اور قیوم جو ہمیشہ باقی ہے اور ہمیشہ باقی رہیگا۔

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی ذہنی دھوم ہے　　　ہست میں شبہ نہیں ہے حیثیت لامعلوم ہے
اس تغیر پہ بھی ذہنوں میں ہے قائم کوئی چیز　　　اور وہ کیا ہے فقط یا حیّ یا قیّوم ہے

اظہار اس معنیٔ نازک کا الفاظ کے حد سے باہر ہے
ہر پھیر کے سمجھ ہے گرد اس کے جو حد خرد سے باہر ہے

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں اُمیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

(۱) حشر کی امیدیں ہیں (۲) بہت سی امیدیں ہیں۔

اگرچہ ہے درد و غم سے مضطر یہی ہے ورد زبان اکبر
یہ درد جس نے دیا ہے ہم کو وہی ہماری دوا کرے گا

میں کیا کہوں اسے اور کیا کروں گلا اسکا　　　مجھے ہنوز پتہ ہی نہیں ملا اس کا

خدا ہی نے مجھے بنایا مجھ کو خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا
خدا کی ہستی ہے مجھ سے ثابت خدا نہ ہوتا تو میں نہ ہوتا

میں نام سعی کا اپنی خدا نہ رکھوں گا　　　جو بن پڑے گا مگر وہ اٹھا نہ رکھوں گا

شکل تسکین مرے دل کو مرے اللہ دکھا　　　راہیں سب بند ہوئیں اپنی طرف راہ دکھا
چھپکے وہ مہر کہ گم ہوں یہ چراغ اوہام　　　نور عرفاں سے ہو مملو وہ شب ماہ دکھا
آنکھ کو صورت فانی نے کیا ہے پُرخوں　　　چشم باطن کو مرے معنیٔ دلخواہ دکھا

ہوش اڑا دیتا ہے ان خاک کے پتلوں کا جمال — خود وہ کیا ہوگا انھیں ہوش میں لانے والا

ہر دم خیال رکھے حق کا اگر ہے طالب — ہر سانس کھینچتی ہے جان آفریں کی جانب

نہ پوچھو کیا اثر اس مصرعہ اکبر کا ہے ہم پر — ہر اک کے علم کا ہے خاتمہ واللہ اعلم پر

خدا بہترین جاننے والا ہے۔ مجتہدین وفقیہ عام طور پر ختم تحریر کے بعد لکھتے ہیں واللہ اعلم۔

کیونکر ذلیل دیکھ سکے اس جمال کو — جس کا خیال برق گراتا ہے ہوش پر

یہ جتنے ذرے جہان فانی کے اتنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں
خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بے خبر ہیں

تدبیر کی کوئی حد نہ رہی اور بالآخر کہنا ہی پڑا — اللہ کی مرضی سب کچھ ہے بندے کی تمنا کچھ بھی نہیں

انگریزی کا ایک مقولہ ہے MAN PROPOSES; GOD DISPOSES

انسان تمنائیں کرتا ہے مگر ہوتا ہے وہی جو خدا چاہتا ہے۔

میں جس کے خامہ قدرت کا نقش حیرت افزا ہوں
وہی جانے کہ وہ کیا ہے وہی جانے کہ میں کیا ہوں

کیا نور تھا نگاہ جناب خلیلؑ میں — شمس و قمر بھی کچھ نہیں انجم بھی کچھ نہیں

خدا پرست کو کافی ہے مثل ابراہیمؑ — زوال شمس و قمر صبح و شام عالم میں

خدا سے غافل اور اس پر یہ نعمت دینا — اسی کی شان ہے احسان ناسپاس کے ساتھ

اسی کے انتظام و حکم سے موسم بدلتے ہیں — وہی ہے وقت پر جس نے ہواؤں کو اُبھارا ہے

زمیں پر سبزہ و گل کی نمودیں[له] کیسی پیاری ہیں — فلک پر چاند سورج کا بھی کیا دلکش نظارا ہے

کوئی ذرہ نہیں عالم میں اس کے علم سے باہر — جو مرضی اس کی ہے دخل اسمیں دے یہ کس کو یارا[عه] ہے

وہی دنیا میں ہے اس زندگی و موت کا خالق — ہر اک کو اپنی مرضی سے جلایا اور مارا ہے

ان اللہ علیٰ کل شیءٍ قدیر کی منظوم تفسیر ہے۔

صفحہ ہستی پہ آخر کس قلم کی ہے کشش — نقش مٹتے ہی رہے لیکن ابھرتے ہی رہے

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے — خدا کیا ہے؟ خدا ہے اور کیا ہے

له دکھاوٹیں عه طاقت۔

بڑھاتے کیوں ہو تم لفظوں کو آگے
بساطِ ذہن پر یہ جور کیا ہے
اس باغ میں یہ نگاہ اکبر
دل کو بے حد ابھارتی ہے
ہے کس کے فراق میں پپیہا
کوئل کس کو پکارتی ہے

پپیہا۔ پی کہاں پکارتا ہے کون "پی ؟" کوئل "کو" کی کوک مارتی ہے کون "کو ؟"

شاہد بزم ازل کے فیض کا کیا پوچھنا
خاک نے اتنی ترقی کی کہ آدم ہو گئی
خدا کہاں ہے ؟ جواب اس کا ہر مقام میں ہے
نہ سمجھے کوئی تو کہہ دو خود اپنے نام میں ہے

"خود اپنے" کے شروع کے چار حرف مل کر "خود آ ہوئے"۔

آنکھ محروم سہی لب پہ ترا نام تو ہے
تیری ہستی کا یقین قاطع اوہام تو ہے
شگفتہ کس قدر بیلا ہے کتنی مست جوہی ہے
ترا ہی رنگ ہے گلشن میں خوشبوؤں میں تو ہی ہے

کیا جلوے ہیں اس کے پیش نظر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ ارض و سما یہ شمس و قمر سبحان اللہ سبحان اللہ
ہر آن کا ہے اک رنگ نیا ہر رنگ کی ہے اک شان جدا
وحدت کا شجر کثرت کے ثمر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ ابر رواں یہ برق تپاں یہ پرتو انجم نور فشاں
یہ پردۂ شب یہ حسن سحر سبحان اللہ سبحان اللہ
یہ زمزمہ ہائے مرغ چمن یہ نشو نمائے سرو و سمن
یہ سبزہ و گل یہ سنبل تر سبحان اللہ سبحان اللہ
اس درجہ ترقی خاک کو دی وہ ہوش میں آ کر شوق بنی
اس شوق کا خود منظور نظر سبحان اللہ سبحان اللہ
بس جائے گی اس میں سانس تری ہو جائے گا تو پاکیزہ نفس
دن رات کہا کر اے اکبر سبحان اللہ سبحان اللہ

خدا کا نام روشن ہے خدا کا نام پیارا ہے
دلوں کو اس سے قوت ہے زبانوں کو سہارا ہے
خدا ہی ہے زمین و آسماں کا خالق و مالک
اسی کی قدرت و صنعت نے عالم کو سنوارا ہے

تماشا اس کی قدرت کا ہے بر و بحر میں ہر دم
ادھر موجیں ہوا کی ہیں ادھر پانی کا دھارا ہے
اسی کے حکم سے ہے رات دن کی یہ کمی بیشی
اسی کے حکم کا تابع فلک پر ہر ستارا ہے
اسی کے حکم سے پھل اور غلّہ کی ہے افزائش
زمیں پر بدلیوں سے اُس نے پانی کو اُتارا ہے

وہی ہنسائے وہی رُلائے وہی جگائے وہی سُلائے
وہی بگاڑے وہی سنوارے وہی نکالے وہی بُلائے

محض تقسیم الفاظ سے ہر ٹکڑا ایک مضمون بن گیا ہے۔

اسی سے خوش رہ اسی کا غم کر اُسی کو دیکھ اور اُسی میں گُم ہو
دعا اسی سے ثنا اسی کی جو گر تو چپ ہو سنبھل جو قُم ہو

قُم = اٹھ کھڑا ہوا۔

جہان فانی کے کل کوائف اسی کی قدرت کے ہیں لطائف
اسی کی رحمت پہ کوئی غافل اسی کی عظمت سے کوئی خائف
دلوں کا مالک نظر کا حاکم سمجھ کا صانع خرد کا بانی
جمال اسی کا جلال اسی کا اسی کو زیبا ہے لن ترانی

حضرت موسیٰؑ سے خدائے برتر نے تمنائے زیارت کے جواب میں کہا تھا۔

سمجھی ہوئی باتوں نے پریشان کیا ہے
مشتاق ہوں اس کا جو سمجھ میں نہیں آتا
قائل ہمہ اوست کا ہے اکبرؔ
محسوس مگر ہمہ نہیں ہے

حق گوئی

بس اصل کار دیں تو صرف تسبیح وقناعت ہے — عوام الناس باہم جنگ کرتے ہیں زوائد پر

اہل مذہب میں زیادہ تر ہے بس لفظی نزاع — ایک ہی مالک جہاں کا ہے تو پھر کیسی نزاع

علم اگر ہوتا زیادہ اور ہوتی حرص کم — صلح ہوتی بیشتر لوگوں میں کم ہوتی نزاع

منطق بھی تو اک چیز ہے اے قبلہ و کعبہ — دے سکتی ہے کام آپ کی واللہ کہاں تک

ضرورت یہ ہے کہ تبلیغ میں علم کلام اور منطق اور فلسفہ سے بھی مدد لی جائے محض اقسام اور حدیث پر دلیلیں مبنی نہ ہوں۔

خوب تر ہم سے ہیں ان کے دل میں اخلاقی اصول — گو نہیں ہے دین ابراہیم ان کے ہاتھ میں

ہم کو سایہ پر جنوں وہ دھوپ میں مصروف کار — مس پہ ہے اپنی نظر اور سیم ان کے ہاتھ میں

مس اور سیم کو سایہ اور دھوپ سے بلحاظ رنگ تشبیہ دی گئی ہے۔ مشرق اور مغرب کی سستی اور چابکی دکھائی گئی ہے۔ اخلاقی جدوجہد کی تصویر بھی کھینچی گئی ہے۔

شیخ صاحب کا تعصب ہے جو فرماتے ہیں — اونٹ موجود ہے پھر ریل پہ کیوں چڑھتے ہو

یہ سوال اُن کا ہے البتہ بہت با معنی — کہ سمجھ بوجھ کے قرآں بھی کبھی پڑھتے ہو

سیّد سے علیگڈھ میں یہ جاکر کوئی کہدے — ہے مجھ کو طلب قوم کی قسمت سے زیادہ

دین کو سیکھ کے دنیا کے کرشمے دیکھو — مذہبی درس الف بے ہو علیگڈھ تے ہو

یعنی پہلے مذہبی تعلیم ہونی چاہئے۔

سر میں سودا آخرت کا ہو یہی مقصود ہے — مغربی ٹوپی پہن یا مشرقی دستار باندھ

"کلاہ تتری" والا شعر اس کے ساتھ پڑھیے۔

بری تعلیم سے پیدا ہوں گو رائیں غلط لیکن — طبیعت فطرتاً ہے نیک تو بد ہو نہیں سکتی

خواہش زر میں نئی تہذیب کے پیرو بنے — وہ نہ ہاتھ آیا مگر گنج معائب ہو گئے

مسلمانوں کی خوشحالی کی بیشک دھن ہے سید کو — مگر یہ کام نکلے گا نہ لکچر سے نہ چندوں سے

وہ عشق کیا جو نہ ہو ہادی طریق کمال — جو عقل کو نہ بڑھائے وہ شاعری کیا ہے

ہر ایک کو ہے زمانے میں زندگی مقصود — کسے خبر ہے کہ مقصودِ زندگی کیا ہے
جسم تو خاک میں مل جاتے ہوئے دیکھتے ہیں — رُوح کیا جانے کدھر جاتی ہے کیا ہوتی ہے
وجد میں لاتے ہیں مجھ کو بلبلوں کے زمزمے — آپ کے نزدیک بامعنی صدا ہو یا نہ ہو
اُمیدِ شفا خدا سے رکھو — کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ

اس لئے کہ تقدیر کے لئے بھی اسباب تدبیر ضروری ہے۔

دل کشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں — باطن افروز کوئی پیرِ خرابات تو ہو
طبع پر عبرت کی بدلی ایک دن چھا جائے گی — شوخیِ برقِ فنا اُن کو بھی تڑپا جائے گی
دل نئے ہیں اور تمنائیں ابھی کم عمر ہیں — رفتہ رفتہ نوجوانوں کو سمجھ آجائے گی

ہزار سائنس رنگ لائے ہزار قانون ہم بنائیں
خدا کی قدرت یہی رہے گی ہماری حیرت یہی رہے گی

کیا کر رہی ہے کبر شکن قدرتِ خدا — ہے پُوچھنے کی بات مگر کچھ نہ پوچھئے
ذرہ ہائے خاک کس ترکیب سے جکڑے گئے — جینے مرنے کے تماشے کے لئے پکڑے گئے
چل گئی موسیٰؑ کی لاٹھی رہ گیا جادو کا کھیل — ساحروں کے سانپ کو مارا خدا کی مار نے

ملاحظہ ہو " التاریخ الکلنیہ "، حضرت موسیٰؑ کا عصا اژدھا بن کر تمام ساحروں کے اژدھوں کو نگل گیا

وہی قانونِ فطرت ہے جسے تقدیر کہتے ہیں — جسے قسمت سمجھتے ہیں وہ تدبیروں کا حاصل ہے
منزلِ گور تک پہنچتا ہے — خواہ چھکڑا ہو خواہ موٹر ہو

حکومت اس کی اسی کی مرضی اسی کے سب کام اور دھندے
کہاں کے انگلش کہاں کے نیٹو خدا کی دُنیا خدا کے بندے

انگریز = ENGLISH

خدا کے واسطے دنیائے دوں سے منہ جو موڑے ہیں
وہی ہیں مستند انسان مگر افسوس تھوڑے ہیں

فلک دیتا ہمیں کچھ اوج رخ کرتے جو پستی کا — خیالوں کی بلندی نے بٹھا رکھا ہے پستی میں
نام یوں پستی میں بالاتر ہمارا ہو گیا — جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا (ذوق)

نہیں آزاد جو اپنے سے تعلق کرے قطع — ہے وہ آزاد جو غیروں کا گرفتار نہ ہو

چیست دنیا از خدا غافل بدن — نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

ہو اگر ہمت عالی دل آگاہ کے ساتھ — غیر ممکن ہے محبت نہ ہو اللہ کے ساتھ

شیخ ہوں شہر میں اور کیمپ میں سید ہوں یہ کیا — جس میں مل جل کے رہیں سب وہی بستی اچھی

کہاں کا شرقی کہاں کا غربی تمام دُکھ سُکھ ہے یہ مساوی
یہاں بھی اک بامراد خوش ہے وہاں بھی اک غم سے جل رہا ہے
خُدا سے تم دل ملاؤ اپنا زبان کو پھر ملاؤ دل سے
تو دیکھ لینا کہ پُر اثر ہے زبان سے جو نکل رہا ہے
جنھوں نے طاعت میں جان دی ہے انھیں کے حصہ میں زندگی ہے
مقدموں کی ہوں لاکھ شکلیں یہی نتیجہ نکل رہا ہے

مقدمے PREMISES

یورپ میں جو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی — لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی

ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ — دیکھو مگر ہے پیرس کا ہے سوپ ہر جگہ

ان کی تجارت ہمہ گیر ہے اور ان کی ترقی کا بہت بڑا راز ہے کاش ہندوستانی بھائی اب بھی چونکیں۔

PEAR'S SOAP ایک صابن کا نام ہے۔

ملک پر تاثیر چشم ووٹ طاری ہوگئی — مفت شیخ و برہمن میں فوجداری ہوگئی

ممبری پر جنگ ہو اسر ہیں گئو کا کیا قصور — ملک میں بدنام ناحق یہ بچاری ہوگئی

دَور گردوں نے اُبھارا دیر کو سچ ہے مگر — یہ نہ کہئے حضرت سیّد نے پھر کیا کرلیا

اُن نگاہوں سے کہ جو تھیں خوگر طوف حرم — آفریں کہئے کہ بُت خانے کو اپنا کرلیا

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق — نیچر تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق

لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات — مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

EAST IS EAST AND WEST IS WEST AND
NEVER THE TWAIN SHALL MEET.

بیٹھا رہا میں صبح سے اس در پہ شام تک
افسوس ہے ہوا نہ میسر سلام تک

بہ چشم غور دیکھو بلبل و پروانہ کی حالت
وہ اسپیچیں دیا کرتی ہے اور وہ جان دیتا ہے

وہ پھنستی ہے قفس میں اور اس کا نام روشن ہے
ہوا پر خیمۂ معنی کو اکبر تان دیتا ہے

جب اپنے ہاتھ میں لی غیر نے عنان سمند
تو پھر سوار سے اکبر پیادہ پا اچھا

نادر شاہ نے جب دہلی فتح کی لوگوں نے ہاتھی سواری کے لئے پیش کیا۔ ہاتھی پر بیٹھنے کے بعد اُس نے کہا "عنانش مرا دہ" لوگوں نے حقیقت بتائی فوراً ہاتھی سے کود گیا۔

واہ اے سیّدِ پاکیزہ گہر کیا کہنا
یہ دماغ اور یہ حکیمانہ نظر کیا کہنا

قوم کے عشق میں یہ سوزِ جگر کیا کہنا
ایک ہی دُھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

قوم کا اوج ہو منظور خدا خواہ نہ ہو
غیر ممکن ہے کہ دُنیا میں تری واہ نہ ہو

السعی منی والاتمام من اللہ۔ میرا فرض محض کوشش کرنا ہے کاموں کا انجام خدا کے ہاتھ میں ہے

ہر قدم اُس کا شہید لغزش مستانہ تھا
سر میں تھا سیّد کے قرآں زیر پا میخانہ تھا

سر سیّد کو فلک نے تنے نہ دیا
تہذیب کو پھر دوبارہ جننے نہ دیا

ملت کے شکست میں مدد دی کامل
بننے لگی جب قوم تو بننے نہ دیا

پانیر کے صفحہ اوّل میں جس کا ذکر ہو
میں ولی سمجھوں جو اس کو عاقبت کی فکر ہو

کہاں ایسی آزادیاں تھیں میسر
انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ[1]

[1] ہم خدا ہیں۔

بحرِ عرفاں کے لئے ہے کشتی دل لازمی
سود منداس راہ میں الفاظ کا پل ہو چکا[1]

[1] کبھی نہیں ہو سکتا۔

خدا کی یاد میں محویت دل بادشاہی ہے
مگر آساں نہیں ہے ساری دُنیا کا بھلا دینا

آفتاب اوجِ سعادت کا ہے وہ روشن نفس
نورِ طاعت جس سے ظاہر ہو دم آثار صبح

جوش اس کو کہتے ہیں کہ جو پیری میں بھی رہے
تقوےٰ وہ ہے کہ جس کا اثر ہے جوان پر

جس کو خدا کی شرم ہے وہ ہے بزرگ دیں
دنیا کی جس کو شرم ہے مرد شریف ہے

جس کو کسی کی شرم نہیں اُس کو کیا کہوں
فطرت میں وہ رذیل ہے دل کا کثیف ہے

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

کوئی کہتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بدخصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے خود مجبور اب اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز طریق
ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو اُن سے تاش

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشہ و تقویٰ کو کردو پاش پاش

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر ارتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش و جادو نظر
یاں جوانی کی اُمنگ اور اُن کو عاشق کی تلاش

وس کی چتون سحر آگیں اس کی باتیں دل رُبا
چال اس کی فتنہ خیز اس کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغ آتش رُخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں تھی برف کی یہ کوئی قاش

بار بار آتا ہے میرے دل میں اکبر یہ خیال
حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش

در میان قعر دریا تختہ بندم کردئی
بازمی گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش
(حافظ)

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا
نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر
خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

وفات سرسید مرحوم

ہجوم بلبل ہوا چمن میں کیا جو گل نے جمال پیدا
کمی نہیں قدرداں کی اکبر کرے تو کوئی کمال پیدا

صوم ہے ایمان سے رخصت صوم گم
قوم ہے قرآن سے رخصت قوم گم

فلک پر شان و عظمت سے ستارے جگمگاتے ہیں خدا کے سلطنت کی جوبلی ہر شب مناتے ہیں
یہی نظارہ ہم کو محو رکھتا ہے صدا اکبر فرشتے بے ٹکٹ یہ منظر اعظم دکھاتے ہیں

جشن صد سالہ

اس بات میں ہے ایک رمز نہاں اس قافیہ میں چالاکی ہے
جب آہ و بکا کا ذکر نہ ہو تو وہ مجلس بیباکی ہے

بے باکی - یہ بغیر رونے والے کے جوشیوں کے نقطۂ نظر سے بے کار ہے۔

بیباکی - ایسی مجلس گریہ گستاخی اور بیباکی مترادف ہے۔

خدا کے باب میں منطق کو پھر یہ کیوں تگاپو ہے جہاں عشوے میں فطرت کے فقط اک عالم ہو ہے
اطبا کو تو اپنی فیس لینا اور دوا دینا خدا کا کام ہے لطف و کرم کرنا شفا دینا

ایک حدیث میں ہے کہ ہر دوا مریض کے گلے سے اُترتے وقت پوچھتی ہے کہ کیا اثر کروں۔

صاحب الفاظ کو دفتر سے بھی سیری نہیں صاحب معنی کو صرف اک لفظ کافی ہوگیا

عاقلاں را اشارۂ کافیست۔

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا غور جب ہم نے کیا سانس کو دنیا پایا
راز ہستی کا کوئی آج تلک پا نہ سکا پا گیا کچھ تو کسی غیر کو سمجھا نہ سکا
بشر کو زندگی میں غفلت امید فردا ہے مگر دم بھر بھی اپنے قصد سے وہ جی نہیں سکتا

جب مرنا جینا کسی کے اختیار کے بات نہیں تو پھر کل کے جھمیلوں کی فکر کیوں ہو۔

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد لیکن اڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں
خوب مصرعہ ہے مگر کس کی زباں سے ہو ادا یار موں اعزاز سے دنیا میں یا میں کیوں رہوں

ذلت کی زندگی سے موت ہزار درجہ بہتر ہے۔

ایک ہی موج قضا میں غفلتیں بہ جائیں گی سرکشوں کی گردنیں اپنی جگہ رہ جائیں گی
ساقی بزم فنا کا لب پہ کپ آنے تو دو کبر کی اڑ جائے گی قلعی وہ تپ آنے تو دو
بدن کو کچھ سمجھ سکتے ہو نشتر اور شعاعوں سے مگر آساں نہیں تشریح استعداد روحانی

BISECTING, DISECTING AND X' RAYS

حالات حاضرہ

جب نکیرین آئے مری قبر میں بہر سوال
میں نے یہ چاہا کہ لکھوا دوں انھیں سب اپنا حال

ہاتھ پاکٹ میں جو ڈالا مجھ کو حسرت ہو گئی
یعنی جو تھی نوٹ بک وہ اس سفر میں کھو گئی

کہہ دیا میں نے کہ میں اب ہر طرح معذور ہوں
رہ گئی دنیا میں میری نوٹ بک مجبور ہوں

ہیں حضرت ساحر آج اک حسن کمال
ہے مخزن حکمت وخرد اُن کا خیال

مرعلی محمد صاحب راجہ محمود آباد۔

اشعار اکبر کے کیوں نہ ہوں یاد اُن کو
راجہ کے گھر میں موتیوں کا کیا کال

محاورہ ہے۔

تھا دل حسرت[1] بھرا ارمان میں
ہم نے لکھ بھیجا انھیں موہان میں

بھائی صاحب رکھ دو تم اپنا قلم
ہاتھ میں لو اب تجارت کا علم

ہو چکی غیروں سے خویشی کی بہار
بس دکھاؤ اب سودیشی کی بہار

کام کو اٹھو چڑھاؤ آستین
لا یضیع اللہ اجر[2] المحسنین

[1] سید فضل الحسن حسرت موہانی [2] اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

پسنجر کی آمد رہی در کنار
ہوا ڈاک گاڑی میں بھی انتشار

جو لی ریل والوں نے راہ فرار
ٹریفک کا ہے بند سب کار بار

کئی دن سے سوتی ہے ای آئی آر
یہ سچ کہہ گیا شاعر نامدار

بیک گردش چشم نیلوفری
نہ انجن بماند نہ انجینری

پہلی اسٹرائک سنہ ۱۹۱۶ء میں

ہو گیا ہے الہلال آماجگاہ تیر غرب
اس نئے دور فلک کی چاند ماری دیکھئے

ابو الکلام آزاد کا مشہور رسالہ الہلال حکومت نے کچھ دنوں کے لئے بند کر دیا تھا

ضبطی پرچہ توحید ہوئی فیر یہ ہے
قل ہو اللہ احد ضبط نہیں خیر یہ ہے

نہ پوچھو مجھ سے اکبر حالت سائنس و مذہب کو　　　وہاں ابجد پہ ہنگامہ ہے یاں ضغط پہ بیہوشی

جہاں سائنس کی انتہا ہوتی ہے مذہب کی ابتدا وہیں سے ہوتی ہے پھر بھی سائنس میں ذراسی بات پر مباحثے ہیں اور مذہب کی آخری منزل پر بھی بے خبری ہے۔

جمال صورت و معنی میں بحث رد و کد کیسی
گل و بلبل کے حق میں کیا شہادت اور سند کیسی

نہ دعوے کی ضرورت ہے نہ کوئی روک سکتا ہے　　　کسی میں فطرتی جوہر جو ہو وہ خود چمکتا ہے
برگڈ کے مولوی کو کیا پوچھتے ہو کیا ہے　　　مغرب کی پالسی کا عربی میں ترجمہ ہے
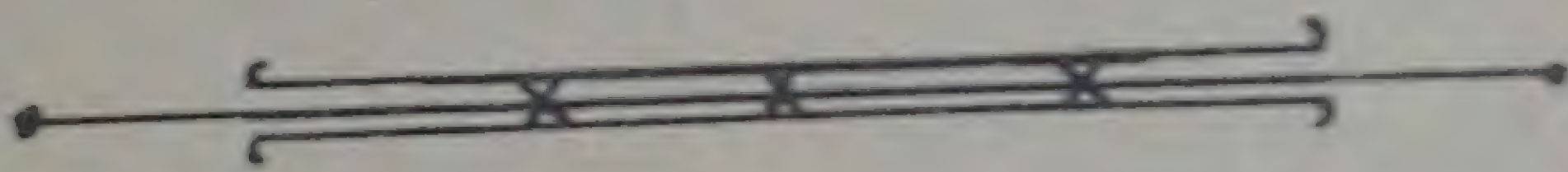
نورِ ایماں کی ضرورت نہیں سمجھا سائنس — وجہ خاموشی شمع حرم و دیر یہ ہے
مغربی پارک میں چکر کے سوا کچھ بھی نہیں — دل رنگیں کی ہوا کھاؤ بڑی سیر یہ ہے
آں فکر مصر و کابل و جاپان و چین کجا — آں خوض و التفات پئے کار دیں کجا
آں پاسی و آں نگہ دور بین کجا — آں خاتم حمید کجا ان نگیں کجا

در دل گداز ہیم بجائے امید شد
گوئی خلا بماند و خلافت شہید شد

بہت لوگ یہ کہتے ہیں

مجھ پہ ہے تقلید واجب ہند کے دربار کی — رائے میری ہے وہی جو رائے ہے سرکار کی

کوئی انقلاب زمانہ کی یوں شکایت کرتا ہے:

شاہ و سلطان سے رعایا کی مروت نہ رہی — پاس ملت نہ رہا دین کی عزت نہ رہی
وہ عقیدے نہ رہے اور وہ حکومت نہ رہی — دل کا مرکز نہ رہا ہاتھ کی طاقت نہ رہی

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

اور میں یوں کہتا ہوں

کیا بحث ہے ایران سے اور ترک و عرب سے — اس وقت تجھے قطع نظر چاہئے سب سے
یا تخت پہ بیٹھے کوئی یا تخت سے اُترے — رکھ کام تو دن رات فقط طاعت رب سے
تاریخ نے دیکھے ہیں بہت رنگ فلک کے — خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے
نکلا آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے[1] — اللہ اس کو گولڈ[2] بھی دے اور پرل[3] بھی
خواہش ہے اب یہ بعض محبان قوم کی — نکلے کسی طرف سے یونہی اولڈ گرل[4] بھی

[1] OLD BOY - طلبائے قدیم = بوڑھا لڑکا۔ ایک رسالہ کا نام۔ [2] GOLD = سونا۔
[3] PEARL = موتی۔ [4] OLD GIRL = بوڑھی لڑکی۔

قدم انگریز کلکتہ سے دہلی میں جو دھرتے ہیں
تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں

کشت دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے　　دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

رونے سے دل کا بوجھ اتر جاتا ہے۔ ٹیکس کی بھرمار ہو رہی ہے۔ دونوں باتیں کس مزے سے بیان کر دی ہیں۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

اجازت نامہ۔ یہ شعر گورنر صاحب (بٹلر) کو سنایا گیا تھا انھوں نے بہت پسند کیا۔

جنگ ٹرکی اور اٹلی کے متعلق رائیں

کوئی کہتا ہے

دکھائے گی نیا اب رنگ ٹرکی　　نہ ہوگی مبتلائے جنگ ٹرکی
وہاں بھی آگئیں مغرب کی لہریں　　ہوئی اب ہمکنار گنگ ٹرکی
بہت خودرائے تھے سلطان سابق　　رہا کرتی تھی ان سے تنگ ٹرکی
ہوئے رخصت وہاں سے اولڈ فیشن　　ترقی اب کرے گی ینگ ٹرکی

سلطان عبدالمجید کی معزولی پر یہ نظم کہی گئی تھی۔

بعض یہ کہتے ہیں

بدلی وہ ہوا وہ سنبل و گل رخصت　　ساقی رخصت وہ ساغر و مُل رخصت
اب دل میں ہیں دوستان ٹرکی شاداں　　لو ہو گئے پانیر کے عبدل رخصت

لیکن بعض یہ فرماتے ہیں

یلدیز سد راہ مخالف کنوں نماند　　اندیشہ حریف بحال زبوں نماند
آں تیغ عقل داں نگہ پر فسوں نماند　　سودا بجوش آمد واں رنگ خوں نماند
چوں رخت خود بہ لبست و بروں از مقام شد
عبدالحمید گفت کہ ترکی تمام شد

کوئی یورش نہیں ہے ہر طرح سے خیر سلا ہے　　نہ سرگرمی پولس کی ہے نہ جاری مارشلا ہے

یہ کلکتہ کی شوخی اور یہ ڈھاکہ کی ادا سنجی — وہ اک فرشی کبڈی ہے یہ لفظی گیند بلّا ہے
یہ دیسی ورزشیں ہیں مغربی جمناسٹک ہے وہ — نئے سن کی تمنائیں ہیں کرسمس کا پچھلا ہے

موکل[3] چھٹے ان کے پنجے سے سب — تو بس قوم مرحوم کے سر ہوئے
پپیہے پکارا کئے پی کہاں — مگر وہ پلیڈر[3] سے لیڈر[4] ہوئے

[1] کانگریس [2] کانفرنس [3] پلیڈر = وکیل۔ [4] لیڈر = رہنما۔ "پی" نکال دیجئے لیڈر رہ جائے۔

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک در بستہ ہے — چونچ طوطارام نے کھولی مگر پر بستہ ہے
شیخ جی گھر سے نہ نکلے اور مجھ سے کہہ دیا — آپ بی۔اے پاس ہیں اور بندہ بی بی پاس ہے

مزا ہے اسپیچ میں ڈنر میں خبر بھی چھپتی ہے پانیر میں
فلک کی گردش کے ساتھ ہی ساتھ کام یاروں کا چل رہا ہے

کہاں کا نام مجھے ہے نشاں سے بھی گریز — مبارک آپ ہی کو خواہش خطاب رہے
عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر — کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیمبر نمبر
جو بنگالی ہیں وہ ثابت ہوئے ہیں اس قدر اثقل — بحمداللہ کہ غزلی پیٹ میں میں خوب پچتا ہوں
رات افسوس سے کہتے تھے یہ بنسی بھائی — ہم سے ناحق ہیں الگ کانفرنسی بھائی
ساحل نظر آتا ہے نہ مچھلی ہے نہ بنسی — کیا لہریں لیا کرتے ہیں یہ کانفرنسی

تھا امن کسی قدر سو وہ دن بھی چلے — ظاہر کی سمت اہل باطن بھی چلے
مجلس یہ ہوا اضافہ کانفرنس — مسلم تو جا چکے تھے مومن بھی چلے

آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی ابتدا پر یہ شعر کہے گئے تھے، اپنے اختلاف کو کس پہلو سے ادا کیا ہے۔ "چلے" کا ہر جگہ نیا لطف ہے۔

شیعہ و سنی میں جنگ اک دھوم دھامی ہو گئی — چار یار اور پنجتن کی نیک نامی ہو گئی
کیا شرف بخشیں گی ہم کو عرش پر یہ کاوشیں — جب زمیں پر تم کو غیروں کی غلامی ہو گئی
ایک قرآن ایک قبلہ ایک اللہ اک رسول — بد نصیبی ہے کہ تفریق دوامی ہو گئی
مومنان امن کو جو دیر کی سوجھے گی اب — جب حرم کے صحن میں بد انتظامی ہو گئی
اشتعال آتش افسردہ اس طوفان میں — پختہ طبعوں سے الٰہی کیوں یہ خامی ہو گئی

جس نے کھولی بہر صلح واشتی اپنی زباں | پیش حق مقبول اس کی خوش کلامی ہوگئی

صلح واشتی کا بالواسطہ پیغام نہایت لطیف ہے کبھی تو شرم دلائی ہے کبھی حقیقت جتائی ہے کبھی نتیجہ بد کا اظہار ہے کبھی تعجب کے ساتھ اظہار ہمدردی کیا ہے۔

اکبر کو جس عالم میں ہوں خوش ہونا چاہئے کہ پیش مخلوق بھی اُن کی خوش کلامی مقبول ہوگئی۔

ممدوح خاص و عام ہیں لالہ ہنال چند | در اُن کے فیض کا کبھی رہتا نہیں ہے بند

حکام کے حضور میں کرتے ہیں التماس | قانون سے جو ہوتا ہے کچھ شبہ و گزند

تقریر رنٹ بل[1] کی جو کی ملک بول اٹھا | ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۱۹۰۱ء

[1] قانون لگان

تھا باعث الم مرض جانگزائے قوم | مدت سے سن رہے تھے علیگڈھ میں ہائے قوم

آخر او دھ نے کالج طبی بنا کیا | شکر خدا کہ ہوگئی پیدا دوائے قوم

طبیہ کالج دہلی۔ حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم نے جس کی بنیاد ڈالی۔

دیکھ کاریگری حضرت سیّد اے شیخ | دیگئی لوچ وہ مذہب میں کمانی کی طرح

(صفی) اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے | اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دبادیں گے

ملکی ترقیوں میں دوا لے نکالئے | پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے

کافی ہے بہر شغل کلیسائے فکر رزق | اب دل سے مسجد اور شوالے نکالئے

زاہد کی طبع دیکھ کے اس بُت کو کچ گئی | وہ کیا تمام ملک میں اک دھوم مچ گئی

اکبر ہی تھا کہ دین میں دل کو چھپا لیا | وہ بھی کہاں بچا یہ کہو جان بچ گئی

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال | بیج مغرب نے جو بویا وہ اُوگا اور پھل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضمون لکھا | ملک میں مضمون نہ پھیلا اور جوتہ چل گیا

لڑائی ہوگئی۔ خوب بکا۔

ساتھ ان کے مرا شیخ تو چل ہی نہیں سکتا | بندر کی طرح اونٹ اوچھل ہی نہیں سکتا

کچھ بھی نہیں وہ جانتے چندے کے سوا | اس باغ میں کیا دھرا ہے پھندے کے سوا

گلچیں ہیں بہت نہیں ہے بلبل کوئی | اس نکتہ کو کون سمجھے بندے کے سوا

محتاج در وکیل و مختار ہیں آپ — سارے عملوں کے ناز بردار ہیں آپ

آوارہ ہیں منتشر ہیں مانند غبار — معلوم ہوا مجھے زمیندار ہیں آپ

آہ و فریاد سے قابو میں نہ آئے گا وہ یار — طپش قلب کو بنگال ایجیٹیشن[1] سمجھو

[1] جوش۔

لے لے کے قلم کے لوگ بھالے نکلے — ہر سمت سے بیسیوں رسالے نکلے

افسوس کہ مفلسی نے چھاپہ مارا — آخر احباب کے دِوالے نکلے

لو نکلنا پڑا اٹرک کے ساتھ — آج تو میرا گھر بھی نپتا ہے

کمیٹی میں چندہ دیا کیجئے — ترقی کے ہجے کیا کیجئے

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی — عربی میں نظم ملت بی اے میں صرف روٹی

لیکن جناب لیڈر سُن کر یہ بات بولے — بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی

اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے — کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

کچھ غرض اور ہے احباب نہ اس ٹنک میں رہیں

بس یہ ہے شوق کہ پبلک کی جھکا جھک میں رہیں

نغمۂ مُرغ سحر سے نہیں انجن کو غرض

پیٹ انگاروں سے بھر دیجئے بھک بھک میں رہیں

یہ لیڈر خود ہی مضطر ہیں مگر عشوے دکھاتے ہیں

جو شخصی زندگی ہے اس کو یہ قومی بتاتے ہیں

بجز الفاظ کے حاوی نہیں کلی یہ کام ان کے

یہ خود جزئی ہیں لیکن گیت کلی کا سُناتے ہیں

کونسلوں میں سوال کرنے لگے — قومی طاقت نے جب جواب دیا

تنگ دنیا سے دل اس دور فلک میں آگیا — جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آگیا

ممبری سے آپ پر تو وارنش ہو جائے گی — قوم کی حالت میں کچھ اس سے جلا ہو یا نہ ہو

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہوں — میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

کیا زور طبع ہو کہ نہیں کوئی ہمزباں
کیا نکتہ سنجیاں ہوں کوئی نکتہ داں نہیں

قحط الرجال کی تصویر کھینچی گئی ہے

سختی ایام کا دیکھو اثر
گلبدن کی جا پہ سنگی ہو گئی

کھل گیا مجھ پر بہت ہیں آپ میرے خیر خواہ
خیر چندہ لیجیے طومار رہنے دیجیے

روندتے پھرتے ہیں وہ مجمع اغیار کے ساتھ
خوب توقیر مزار شہدا ر ہوتی ہے

جو زمیں کوچہ قاتل میں نکلتی ہے نئی
وقف وہ بہر مزار شہدا ہوتی ہے

چھوڑ دہلی لکھنؤ سے بھی نہ کچھ اُمید کر
نظم میں بھی وعظ آزادی کی اب تائید کر

صاف ہے روشن ہے اور ہے صاحب سوز و گداز
شاعری میں بس زبان شمع کی تقلید کر

انوار اس دَور کے دل افروز ہیں کم
گویا کہ شبیں بہت ہیں اور روز ہیں کم

ہر چرب زباں نہیں ہے شمع اخلاص
جلنے والے بہت ہیں دل سوز ہیں کم

چخلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں
ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ
ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

سیّد سے آج حضرت واعظ نے یہ کہا
چرچا ہے جابجا ترے حال تباہ کا

تجھ سے ہے ترک صوم و صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج
کچھ ڈر نہیں جناب رسالت پناہ کا

اس نے دیا جواب کہ مذہب ہو یا رواج
راحت میں جو مخل ہو وہ کانٹا ہے راہ کا

یورپ کا پیش آئے اگر آپ کو سفر
گذرے نظر سے حال رعایا و شاہ کا

دعوت کسی امیر کے گھر میں ہو آپ کی
کمسن مسوں سے ذکر ہو الفت کا چاہ کا

نوخیز دل فریب گل اندام نازنیں
عارض پہ جن کے بار ہو دامن نگاہ کا

رُک گئے اگر تو ہنس کے کہے اک بت حسیں
"وِل مولوی یہ بات نہیں ہے گناہ کا"

اِس وقت قبلہ آپ کو جھک کر کروں سلام
پھر نام بھی حضور جو لیں خانقاہ کا

پتلون و کوٹ بنگلہ و بسکٹ کی دھن بندھے
سودا جناب کو بھی ہو ٹر کی کلاہ کا

ممبر پہ یوں تو بیٹھ کے گوشے میں اے جناب
سب جانتے ہیں وعظ ثواب وگناہ کا

اس نظم کا پورا لطف جب ہے کہ سودا کی مسلسل غزل اسی کے ساتھ ساتھ پڑھئے جس کا مطلع یہ ہے "دکھلا کے سبز باغ عذاب و ثواب کا"

بابو ہمیں نگل گئے اس عہد میں تو خیر
رہنا پڑا ہے نبیوں کو مچھلی کے پیٹ میں

بطن ماہی میں ہوئے یونسؑ جو بند
خار خار غم سے تھا دل دردمند (انیس)

یہ پرچہ جس میں چند اشعار ہیں ارسال خدمت ہے
ہمارے لخت دل ہیں آپ کا مال تجارت ہے

ایک ایڈیٹر صاحب کو لکھا گیا تھا کنایۃً اس کا ذکر بھی ہے کہ مصنف کی دل سوزی کی تلافی کسی طور پر نہیں کی جاتی۔
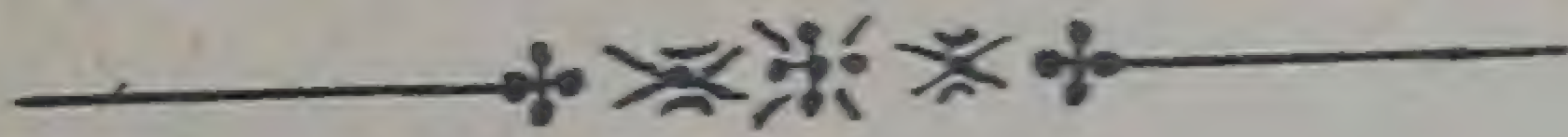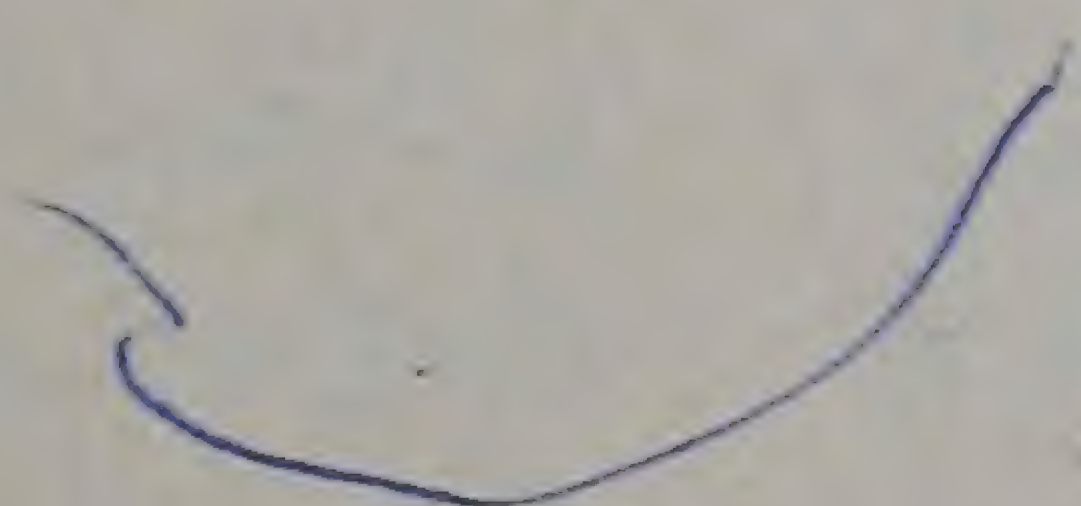
سادگی

یہ ادائیں یہ لگاوٹ یہ بلا کی چتون　　میں تو کیا ضبط فرشتوں سے بھی واللہ نہو

قرآن ہے شاہد کہ خدا حسن سے خوش ہے　　کس حسن سے یہ بھی تو سنو حسن عمل سے

اگرچہ مغرب سے ساز دل ہے مرید آہنگ مشرقی ہوں

اگر پیانو ہے انجمن میں محل خلوت میں بین بھی ہے

ہمارا خنجر بھی بدنما ہے اور ان کی سوئی بھی ہے وہ آفت

کہ صاف بھی ہے چمک بھی رکھتی ہے گول بھی ہے مہین بھی ہے

برق کا جلوہ نظر آیا ہے مجھ کو خواب میں　　قرب ان سے ہوگا الٹی ہے اگر تعبیر خواب

زاہد خشک حسن بیان سے ہیں بے نصیب　　آنکھیں خدا نے دی ہیں مگر دیکھتے نہیں

سو جان سے محو رخ جاناں ہیں تو ہم ہیں　　اس آئینہ خانہ میں جو حیران ہیں تو ہم ہیں

اے برق تڑپنے میں ہمیں ہیں ترے ساتھی　　اے ابر ترے ساتھ جو گریاں ہیں تو ہم ہیں

پھر کسی کام کا باقی نہیں رہتا انسان　　سچ تو یہ ہے کہ محبت بھی بلا ہوتی ہے

عشق نے غالب نکما کر دیا　　ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے　　(غالب)

یہاں بھی آرام پا یئے گا کہاں اب اس وقت جایئے گا

اندھیرا چھایا ہے ابر طاری ہے مینہ برستا ہے وقت شب ہے

کسی کی قسمت میں زہر غم ہے کسی کو حاصل مئے طرب ہے

وہی بگاڑے وہی بنائے اسی کی قدرت کا کھیل سب ہے

تعز من تشاء و تذل من تشاء

نامہ کوئی نہ یار کا پیغام بھیجئے　　اس فصل میں جو بھیجئے بس آم بھیجئے

بنام منشی نثار حسین مہتمم "گلدستہ پیام یار" لکھنؤ

ایسے ضرور ہوں کہ جنھیں رکھ کے کھا سکوں　　پختہ اگر ہوں بیس تو دس خام بھیجئے

حسن طلب۔

سیاست

جو خردمند ہیں وہ خوب سمجھتے ہیں یہ بات
خیر خواہی وہ نہیں ہے جو ہو ڈر سے پیدا

رہنا کسی سے دب کر ہے امن کو ضروری
پھر کوئی فرقہ ہیبت انگیز ہے تو پھر کیا

کیسی ہی سلطنت ہو سب خوش نہ رہ سکیں گے
گر ترک ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر
واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

پہنچنا داد کو مظلوم کا مشکل ہی ہوتا ہے
کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

جج بنا کر اچھے اچھوں کا لبھا لیتے ہیں دل
ہیں نہایت خوشنما دو جیم اُن کے ہاتھ میں

پریشاں ہوش کو کرتے ہیں ٹکڑے دل کے کرتے ہیں
مگر عاقل بھی ہیں کرتے ہیں جو کچھ مل کے کرتے ہیں

آبرو چاہو اگر انگریز سے ڈرتے رہو
ناک رکھتے ہو تو تیغ تیز سے ڈرتے رہو

رعایا کو مناسب ہے کہ باہم دوستی رکھیں
حماقت حاکموں سے ہے توقع گرمجوشی کی

اکبر کچھ آ رہے ہو نظر بند بند سے
آخر ضرر ہوا تمھیں ناصح کی پند سے

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے
آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے

ظالمانہ مشوروں میں میں نہیں ہوں گا شریک
غیر ہی کو محرم اسرار رہنے دیجئے

مل کے باہم کیجئے اغیار سے بحث و جدال
بے نتیجہ باہمی تکرار رہنے دیجئے

ٹیمز میں ممکن نہیں نظارۂ موج فرات
ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجئے

ہے قوم جسم سلطنت اس میں ہے مثل روح
جب یہ نہیں تو قوم نہیں بلکہ لاش ہے

سعی شغال و گرگ سے جنبش ہوئی اگر
نا فہم سمجھے قوم میں خود انتعاش ہے

البتہ زندگانی شخصی کا ہے وجود
قانون میں ہر اک کے لئے زندہ معاش ہے

پیمانہ ہائے ساختہ شاہ وقت پر
محدود طالبین کی فکر معاش ہے

بے علم مذہبی کے ہیں اخلاق نادرست
اس کی خرابیوں سے تو دل پاش پاش ہے

کچھ خاک میں ملیں گے تو کچھ ہونگے جزو غیر
یہ مسئلہ صحیح ہے گو دل خراش ہے

معلوم ہی ہے آپ کو بندے کا ایڈرس
سیدھے الہ آباد مرے نام بھیجئے

معلوم ہوتا ہے کہ بات چیت کر رہے ہیں۔

ایسا نہ ہو کہ آپ یہ لکھیں جواب میں
تعمیل ہوگی پہلے مگر دام بھیجئے

مناسب ہے یہی دل پر جو کچھ گزرے اسے سہنا
نہ کچھ قصہ نہ کچھ جھگڑا نہ کچھ سننا نہ کچھ کہنا

پکالیں پیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا
ہماری کیا کبھی صاحب نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

فضل مولا اللہ کا ہوں جمع سارے سالیاں
وہ اچھالیں بال یہ چمکائیں اپنی بالیاں

بمقام جونپور بنگلہ سید عشرت حسین سلمہٗ۔

لمپ کی ہو جگمگاہٹ اور بجے فونوگراف
عشرتی جھوما کریں بچے بجائیں تالیاں

گھر رہے آباد سمدھی اور سمدھن خوش رہیں
ڈومنی انعام پائے، گائے پیاری گالیاں

پیاری مراشن۔ پیاری اچھی۔

ڈھیر ہو پھولوں کا گلدستے بنائیں باغباں
پیڑ پھل دیتے رہیں مالی لگائیں ڈالیاں

سونے چاندی کی بہیں ہو جیں دلھن کے ہاتھ سے
لیں بلائیں اور دعائیں دیں انھیں گھر والیاں

غل مچائیں کھیل میں بچے رہے بنگلہ میں دھوم
مہمانوں کے لئے پکوان کی ہوں تھالیاں

جھانک کر دیکھیں تو جج صاحب کا دل بھی ہو نہال
کمرے کی دیوار میں دو اک بنی ہوں جالیاں

خود مصنّف

میں تری مست نظر کا ہوں دعا گو ساقی
صدقہ آنکھوں کا کوئی جام ملے گا کہ نہیں

طالبعلموں کو تو لے جاؤ کمیٹی میں نہ تم
کہیں ایسا نہ ہو یہ قوم پہ عاشق ہو جائیں

تقاضا اضطراب شوق کا بڑھتا ہی جاتا ہے
یہ پارۂ شیشۂ دل میں مرے چڑھتا ہی جاتا ہے

حسرت سے دیکھتا ہوں ہر صاحب خرد کو
اس کی زبان کدھر ہے اور اس کا دل کدھر ہے

نا ملائم کیوں کہو اور کیوں سنو
بات یہ ہے چپ کر دیا چپ رہو
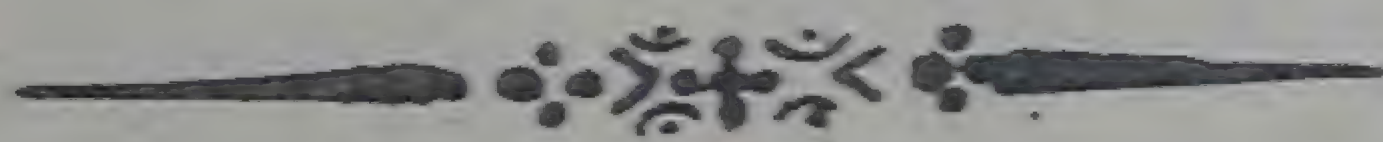
کرتے ہیں بتدریج وہ ظلموں میں اضافہ | مجھ پر اگر ان کا ہے کچھ احسان یہی ہے
مغوی کو بدنہ کہئے ترغیب ہے یہ | کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ
شیطان کو رجیم کہدیا تھا اک دن | اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیال ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی نانک
غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک[1]

[1] مقوی غذا = TONIC

اگرچہ پالٹیکل بحث میں ہوئے ہیں شریک | جناب پنڈت جے چند و بابو آشوتوش
مگر ہمیں تو ہے بالکل سکوت اس مد میں | بتا گئے ہیں یہ مضمون سید ذی ہوش
رموز مملکت خویش خسرواں دانند | گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
طبع سمجھی کہ بلندی میں بڑھی جاتی ہے | زلف[2] خوش ہے کہ یہ پھانسی پہ چڑھی جاتی ہے
وہ ہے نافہم یہ عیار محل ہے نازک | اہل بینش میں یہ اک نظم پڑھی جاتی ہے

[1] قوم [2] چرخ

کانفرنس احباب سے پر ہے | جو صف ہے وہ سلک دُر ہے
سب کو یاد اُستاد کا گُر ہے | دلکش ہر اسپیچ کا سُر ہے
قومی ترقی کی رادھا پیاری | بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
نومن تیل کی فکر ہے طاری | چندے کی تحصیل ہے جاری
لائی ہیں سکھیاں بھر کر جھولی | خوب کھلی ہے برج میں ہولی
رنگ میں ڈوبی ہے سب کی چولی | سب کے زبان اس گیت پہ کھولی
شیخ کو اُلفت ہوگئی رس کی | خوب پیئے اب شوق سے ڈھسکی
اگلی دنیا دہر سے کھسکی | بیٹھا کون ہے شرم ہے کس کی
جمع ہیں ممبر بھولے بھالے | جاڑوں کا موسم پھولے پھالے

آنکھیں پھاڑے دانت نکالے
چندہ دے کر پھنسنے والے

دیکھ کے اک باضابطہ پھبکی
دنیا آپ کی جانب لپکی

آپ نے سب کی دولت ہپ کی
بزم جمالی خالی گپ کی

دیکھتا ہے اک عمر سے بندا
بس یہی باتیں اور یہی پھندا

ہوتا ہے کچھ کام نہ دھندا
لاؤ چندا لاؤ چندا

سید کا جو عہد و مشن تھا
اس "سکے" کا ٹھیک چلن تھا

حسب ضرورت طرز سخن تھا
وقت وہ اور تھا اور ہی سن تھا

گرمیوں میں بچوں کا تھکانا
شہروں شہروں بھیک منگانا

اور اس پر یہ بات بنانا
مفلس لڑکوں کا ہو گا ٹھکانا

آپ کہیں معیوب نہیں ہے
ہم کو تو مرغوب نہیں ہے

عمدہ یہ اسلوب نہیں ہے
ہاں یہ طریقہ خوب نہیں ہے

تڑپو گے جتنا جال کے اندر
جال گھسے گا کھال کے اندر

کیا ہوا تیس ہی سال کے اندر
غور کرو اس حال کے اندر

کام بہت ہیں لوکل و ذاتی
ان کی فکر تو کی نہیں جاتی

مفت میں بچوں کو کر کے براتی
قوم کی گاتے ہیں بھائی وفاتی

جس کا کھائیں اس کا گائیں۔

یہ بے معنی مجلس کیسی
ناحق کی گھس گھس کیسی

یہ بے حکم کی آفس کیسی
بات یہ "سٹرم پڑیش" کیسی

کونسل ہیں شریک ہو گا کل ملک
اب تھیٹکس کا باندھ دیگا پل ملک

اونچا سنتی ہے کیا گورنمنٹ
کیوں کرتا ہے اتنا شور و غل ملک

گائیں ناحق تھرک رہی ہیں
ویران نہ کریں گے جان بل ملک

ہوتی ہے روش جو سلطنت کی
جاتا ہے اسی طرف کو ڈھل ملک

زندہ جس سے ہے بزم قومی
وہ کون ہے حرف محسن الملک

غنچے کی طرح سمٹ کے اُبھرو | اس وقت کھلے گا شل گل ملک
چرچے اس نہ مذہب کے نہ وہ قصۂ دل ہے | پرچے ہیں اب اخبار کے اور آرٹیکل[1] ہے
اس عہد میں مائل سوئے الحاد جو دل ہے | اس کی تو گورنمنٹ ہی رِسپانسیبل[2] ہے

[1] مضمون ، [2] ذمہ دار

اونٹ نے گایوں کے عندیہ شیر کو ساجھی کیا | پھر تو میڈک سے بھی بدتر سب نے پایا اونٹ کو
جس پہ رکھا چاہتے ہو باتی اپنی دسترس | منہ میں ہاتھی کے کبھی اے بھائی وہ گنّا نہ دو
صاحب سے اذن لیکے کروں گا میں عشق چشم | لیسنس ہے ضرور ہرن کے شکار کو
ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے | کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی
لہی رات ایشیا غفلت میں سوتی | نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

یہ بھی جغرافیائی مسئلہ ہے کہ جب ایشیا میں رات رہتی ہے تو یورپ میں دن رہتا ہے۔

فلک چلے ظالمانہ چالیں مچائے اندھیر جتنا چاہے
زمانہ لے ہی گا کوئی کروٹ نصیب بیکس کا سو چکے گا

ہے یگا پو اس قدر مرکز مگر کوئی نہیں | فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور گھر کوئی نہیں
کہتی ہیں آہیں کریں گے تیری دل کا ہم ریفارم | سب مگر شہرت طلب ہیں بااثر کوئی نہیں

اصلاح

سوچ تجھ کو ہے اگر آئندہ پالٹیکس کی | لے نتائج سے مدد اور ہسٹری میں فال دیکھ
ان کا تیر پالسی اور شیخ د بابو کا گریز | خوب ہی لطف شکار روبہ و خرگوش ہے

انھیں کی مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی
انھیں کی محفل سنوارتا ہوں چراغ میرا ہے رات اُن کی
سنے جو اُس کو اسے تحیر جو اس کو برتے اسے تردد
ہماری نیکی اور ان کی برکت عمل ہمارا نجات اُن کی

قوم سے اس کی گاڑھی کمائی | آپ نے فقرہ دے کے اڑائی
اور وہ یوں بے سود گنوائی | شاہ لندن تیری دُہائی

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے — قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صناعی کے چلاؤ تیشے — تاکٹیں افلاس کے بیشے
مذہب کی تعلیم زبانی — طوطا مینا کی ہے کہانی
ملا خود جو نہ ہو حقانی — پھر تو مکتب ہے شیطانی

الفاظ رٹ لینے سے کچھ کام نہیں چلتا۔

نہ نرے اونٹ ہو نہ ہو بلڈاگ — نہ تو مٹی ہی ہو نہ ہو تم آگ
چال ہے اعتدال کی اچھی — ساز حکمت کا جوڑ ہے یہ راگ
متضاد گئے جو دو طرف سے دو تار — کیا جانئے کس کو اس نے اچھا سمجھا
لیکن اس بات کا سمجھنا تو ہے سہل — سرکار نے کس کو ان میں سچا سمجھا

ایک دوسرے کے خلاف (ٹرکی کے متعلق)

مصحف مسلم نے کھولنا چھوڑ دیا — بنئے نے ٹھیک تولنا چھوڑ دیا
حاکم نے کہا نہ بولو ان سے ہرگز — ہم نے بھی سب سے بولنا چھوڑ دیا
مرے نزدیک یہ پنجاب کا بلوا بھی بُرا — ساتھ ہے اس کے علیگڈھ کا یہ جلوا بھی بُرا
آپ اظہار وفا کیجئے پر تمکین کے ساتھ — لیٹ جانا بھی بُرا ناز کا جلوا بھی بُرا

ڈیلی گیٹوں نے بہت شملے میں جو کی ہے صلاح
بعد عمدہ کھانے کے ایسی ڈکاریں ہیں مباح

گفتم ایران را سر جنگ نماند — آن مردی و آن ہوا و آن رنگ نماند
آغا خندید و گفت رنجے دگر است — کام روز برائے ساغر و بنگ نماند
مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے — صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی
لڑیں کیوں ہندوؤں سے ہم یہیں کے اُن سے پینے ہیں — ہماری بھی دعا یہ ہے کہ گنگا جی کی بڑھتی ہو
مگر ہاں شیخ جی کی پالسی سے ہم نہیں واقف — اسی پر ختم کرتے ہیں کہ جو صاحب کی مرضی ہو

اَن = اناج۔ غلہ

وہ نیو قوم کی ہے دہ پشتہ نہ بھیت ہے — بگڑے جو بن رہے ہیں یہ دنیا کی ریت ہے

ہنگامہ طرب نہیں یہ شورش رفارم | رنج و محن کا ساز ہے جِکی کا گیت ہے
موجودہ ترقی سے خوشی کیوں نہ ہو پیدا | امید کے انجن کا بھپارا ابھی بہت ہے
خوش ہیں قلمی وعدوں پہ جو ڈوب رہے ہیں | ان کے لئے تنکے کا سہارا ابھی بہت ہے

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ابھی بہت ہوتا ہے۔ رفارم کی پہلی قسط پر خوش ہونے والوں کی تصویر کھینچی گئی ہے

ہمیں گھیرے ہوئے ہیں ہر طرف اصلاح کی موجیں
مگر یہ حس نہیں ہے ڈوبتے ہیں یا اُبھرتے ہیں
مرا یہ شعر اکبرؔ ایک دفتر ہے معانی کا
کوئی سمجھے نہ سمجھے ہم تو سب کچھ کر گزرتے ہیں

دلکش بہت ہے واقعی گیسوئے اختلاف | کونسل سے کیوں کہوں کہ تیری بل میں کچھ نہیں
بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشین برٹش راج | کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو | کہ تیل بیچ میں ہے ڈھیلی اس کی چول بھی ہے
خلل نہ شغل میں بدھو کے ہے نہ حسّو کے | کہ شیخ سدو بھی ہیں اور قدم رسول بھی ہے
محل صلِّ علےٰ ڈاک و تار کی ہے روش | اگرچہ دل میں نہاں عظمت رسول بھی ہے
اندھیری رات میں جنگل میں ہے رواں انجن | کہ جس کو دیکھ کے حیران چشم غول بھی ہے
شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہروؤں کے لئے | نظر نواز ہے پتّی، حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبرؔ
تو حرج کیا ہے اگر ساتھ ڈیم فول بھی ہے

نالائق۔ بیوقوف۔

رزولیوشن[1] کی یورش ہے مگر اس کا اثر غائب | پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا
کام اس ملک میں ہو سلف گورنمنٹ سے کیا | زہر کو ہضم کرے کوئی پیرمنٹ سے کیا
ادھر خیال نہیں مصلحان نیشن[2] کا | کہ فرط ضعف نہیں وقت آپریشن[3] کا

---
[1] تجویز [2] قوم NATION = [3] نشتر OPERATION =

اس سے تو اس صدی میں نہیں ہم کو کچھ غرض / سقراط بولے کیا اور ارسطو نے کیا کہا
بہر خدا جناب یہ دیں ہم کو اطلاع / صاحب کا کیا جواب تھا بابو نے کیا کہا

معترض بھی کوئی حق گو کبھی ہو جاتا ہے / مگر اس بزم میں یہ سپیچ ہے کہ جی ہاں ہے بہت
شیخ آنر کے لئے آئے ہیں میدان کے بیچ / ووٹ ہاتھوں میں ہے اسپیچ قلمدان کے بیچ
وہی قسمت وہی قانون اور اس پر یہ بھیڑ / اے خدا عقل ہے حیران تری شان کے بیچ

تو وضع پہ اپنی قائم رہ فطرت کی مگر تحقیر نہ کر / دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر
گو تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے / رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ در تاثیر نہ کر
باطن میں ابھر کر ضبط فغاں لے اپنی نظر سے کار زباں / دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر
تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

گو رہتے ہیں ممبری فانی پر شاد / لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر شاد
کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی / عاقل ہیں مکرمی بھوانی پرشاد

آپس میں عداوت کچھ بھی نہیں لیکن اک اکھاڑا قائم ہے
جب اس سے فلک کا دل بہلے ہم لوگ تماشا کیوں نہ کریں

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے منو یا نہ منو / ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہموطنو
اہل مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد / آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ / کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ
زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ / ہاتھ بھی دے خدا زبان کے ساتھ

پولیس خفیہ پئے انسداد جرم ہے ٹھیک / نہ چاہیئے کہ وہ ہو انسداد گپ کے لئے
عزت کی تو شناخت نہیں ہے مگر مجھے / لذت ضرور ملتی ہے کونسل کی سیٹ سے

رہ اصلاح میں گو تیز گامی خوب ہے لیکن / قدم کو لغزشیں جب ہوں ٹھہر جانا ہی بہتر ہے
قصیدے سے یہ چلتا ہے نہ یہ دوہے سے چلتا ہے / سمجھ لو خوب کار سلطنت لوہے سے چلتا ہے

۱ے رائے = VOTE ۲ے ۳ے تقریر = SPEECH

تیزیاں کرتے ہیں قانون بدلنے والے
زحمتیں سہتے ہیں قانون پہ چلنے والے

خوشامد ہے بے جا وناٹت[1] ہے چغلی
دل و دین کی بیشک تباہی یہی ہے

فسادات کے تم نہ حامی ہو ہرگز
گورنمنٹ کی خیر خواہی یہی ہے

ہاون تو ہے ہوس کا دستہ ہے پالسی[2] کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں

لکھے گا کلکِ حسرت دنیا کی ہسٹری[3] میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

وصل کا اس بت خود بیں سے کوئی ہنٹ کہاں
صرف بوسے میں بھلا سلف گورمنٹ کہاں

شاہی و حکومت کی یہی اصل ہے بیوٹی[4]
ہر طور سے انسان سمجھ لے اسے ڈیوٹی[5]

حاکم میں اگر ناز ہے اور عیش پرستی
حاکم میں اگر بادہ نخوت کی ہے مستی

کتنا ہی زبردست و بلند اس کا ہو پایا
ہرگز نہ کہیں گے اسے اللہ کا سایہ

حاکم کو ضروری ہے مذاہب کی اعانت
اللہ کی ہو جس سے پرستش نہ فراغت

یہ ملک نہ فطرت کا ہے شیدا نہ خدا کا
دادا کا کہیں بت ہے کہیں رسم کا خاکا

جو شرک میں ڈوبا ہے نہ بھولے نہ پھلے گا
غیروں ہی کی امداد سے کام اس کا چلے گا

انھیں کی بھینس ہے بھائی کہ جن کی لاٹھی ہے
انھیں کا گاؤں ہے اکبر جو بن سکیں ٹھاکر

جو جس کے مناسب تھا گردوں نے کیا پیدا
یاروں کے لئے عہدے چڑیوں کیلئے چندے

سنوارے خود آپ ہی نے پتلے اور ان میں گنجی لگائی غربی
لگے وہ جب ناچنے اچھلنے کسی کو پھینکا کسی کو ٹپکا

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت
ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال
دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال

پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں حباب
بعد اس کے رفارم[6] کا کریں دل میں خیال

پابند اگرچہ اپنی خواہش کے رہو
لائل سبجکٹ[7] تم برٹش کے رہو

---

۱ کپٹ رکھنا ۲ مصلحت = POLICY ۳ تاریخ = HISTORY ۴ حُسن = BEAUTY
۵ فرض = DUTY ۶ اصلاح = REFORM ۷ وفادار رعیت = LOYAL SUBJECT

قانون سے فائدہ اٹھانا ہے اگر — حامی نہ کسی خراب سازش کے رہو
ہنگامہ یہ ووٹ کا فقط ہے — مطلوب ہر اک سے دستخط ہے
منشی کہ کلرک[1] یا زمیندار — لازم ہے کلکٹری کا دیدار
ہر سمت مچی ہوئی ہے ہل چل — ہر در پہ یہ شور ہے کہ چل چل
ٹم ٹم ہو کہ گاڑیاں کہ موٹر — جس پر دیکھو لدے ہیں ووٹر
شاہی وہ ہے یا پیمبری ہے — آخر کیا شے یہ ممبری ہے
نیٹو ہے غیر ہی کا محتاج — کونسل تو ہے انکی جن کا ہے راج

کہتے جاتے ہیں یا الٰہی — سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں — اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل یہ دین ہے نہ دنیا — پنجرے میں پھدک رہے ہے منیا
اسکیم[2] کا جھولنا وہ جھولیں — لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں
بھائی صاحب تو یہاں فکر مساوات میں ہیں — شیخ صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں

بعضوں کا خیال ہے کہ اس شعر میں نظیر احمد صاحب مدیر گستاخ و مدیر سابق مساوات اور ظہور احمد صاحب بیرسٹر کی طرف اشارہ ہے مگر حقیقتاً کوئی خاص ہستی مقصود نہیں ہے۔

قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں — صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف — اک ہمیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں
ہوش میں رہ کے کرو دور نقائص اپنے — مغربی لوگ تو مست اپنے کمالات میں ہیں

---

[1] محرر = CLERK [2] تجویز لائحہ = SCHEME
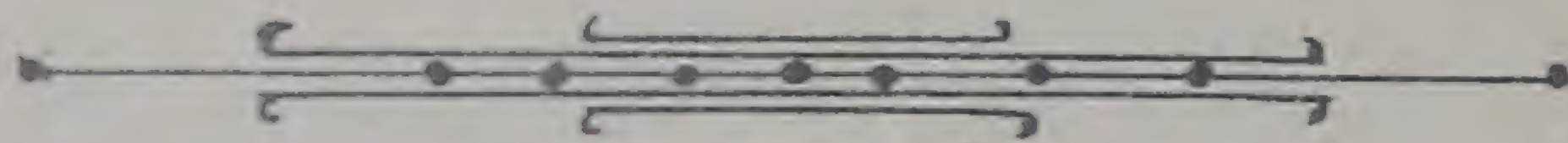
شوخی

کبھی لرزتا ہوں کفر سے میں کبھی ہوں قربان بھولے پن پر
خدا کے دیتا ہوں واسطے جب تو پوچھتا ہے وہ بُت خدا کیا؟

دل بھی کانپا ہونٹھ بھی تھرائے شرمایا بھی خوب
شیخ کو لیکن تری محفل میں پینا ہی پڑا

کیسی نماز ہال میں ناچو جناب شیخ
تم کو خبر نہیں کہ زمانہ بدل گیا

مری تقریر کا اس بُت پہ کچھ قابو نہیں چلتا
جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

خود اپنی ریش میں الجھے ہوئے ہیں حضرت واعظ
بھلا ان کو بتوں کے گیسوئے پُرخم سے کیا مطلب

مری تمھاری نہیں نبھے گی سدھارتا ہوں میں اب یہاں سے
سلام صاحب سلام صاحب سلام صاحب سلام صاحب

نہیں ہوتی بندے سے طاعت زیادہ
بس اب خانہ آباد و دولت زیادہ (داغ)

مری زردی رُخ کا ذکر ہے لبہائے جاناں پر
مزہ دیکھو کر حلوے میں پڑا ہوں زعفراں ہو کر

مری نسبت یہ فرماتے ہیں واعظ بدگماں ہو کر
قیامت ڈھائیگا جنت میں یہ بوڑھا جواں ہو کر

کس قدر حار تھے سید کے وہ اجزائے رفارم
علما دے رہے ہیں قوم کو تبرید ہنوز

افلاک تو ثابت ہوئے اس عہد میں معدوم
اب کیا کہوں جاتی ہے مری آہ کہاں تک

پائی ہے تم نے چاند سی صورت
آسمانی رہے نقاب کا رنگ

تمھیں جو دیکھ لے پھر کیا وہ محو حور جنت ہو
قیامت گو کہ برحق ہے مگر تم بھی قیامت ہو

ڈاڑھی پہ بھی واعظ کے ہے تلوُوں پہ بھی ان کے
چالاک مرے ہاتھوں کی صورت ہے حنا بھی

تمھارے وعظ میں تاثیر تو ہے حضرت واعظ
اثر لیکن نگاہ ناز کا بھی کم نہیں ہوتا

جب کہتا ہوں ان سے کہ مرے دل میں ہے حسرت
کس ناز سے کہتے ہیں کہ حسرت میں بھی کچھ ہے

پوچھتا ہے جب کوئی ان سے کسے ہے تم سے عشق
دیکھتے ہیں پیار سے شرما کے اکبر کی طرف (عمر ۲۲ سال)

سمجھے جو کوئی بُرا یہ مضمون نہیں　کوئی پہلو خلاف قانون نہیں
ہر چند کہ یہ مرے چکھاتا ہے بہت　شیطان کا کوئی شخص ممنون نہیں
مجھ پہ کرتا ہے اعتراض حریف　دل میں آیا مرے یہ شعر لطیف
دفتر اعتراض سوختہ بہ　دہن او بہ چندہ دوختہ بہ

دہن سگ بہ لقمہ دوختہ بہ

عمدہ مچھلی مسلم و خام ملی　تحفہ پایا مراد خدام ملی
ممنون کریم کیوں نہوں اے اکبرؔ　وہ دام میں لائے مجھکو بے دام ملی

محمد کریم صاحب تحصیلدار میجا ۳ر دسمبر ۱۹۰۵ء۔

اک دوست ہمارے ہیں تپ ان کو شدید آئی　جھیلا کئے بیماری مدت میں شفا پائی
لاہور کے جلسے میں شرکت کو ہیں اب جاتے　حالانکہ ابھی قوت پاؤں میں نہیں پاتے
میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت　وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ
یہ میری غلط بندش وہ ان کی غلط فہمی　میں حد سے بڑھا شاعر وہ حد سے سوا وہمی
جو دل میں آتی ہے اے واعظو نہیں رُکتی　سکوت خوب ہے لیکن تمھیں نے کیوں نہ کیا
میں نے کہا جو اس سے ٹھکرا کے چل نہ ظالم　حیرت میں آکے بولا کیا آپ جی رہے ہیں
حُسن کے باب میں اکبرؔ کی سند ٹھیک نہیں　یہ تو ہر اک بُت کمسن کو پری کہتے ہیں
جب کہتا ہوں مرتا ہوں مری جان میں تم پر　فرماتے ہیں مرتے تو ہو مر کیوں نہیں جاتے

یعنی مرگ کا بہانہ ہے مر جاؤ تو بہتر ہے۔

وہ نیند میں ہیں شہر میں پھرنے لگے پہرے　پوچھے کوئی اکبرؔ سے کہ گھر کیوں نہیں جاتے
ہنگامہ ہے کیوں برپا تھوڑی سی جو پی لی ہے　ڈاکا تو نہیں مارا چوری تو نہیں کی ہے
ناتجربہ کاری سے واعظ کی ہیں یہ باتیں　اس رنگ کو کیا جانے پوچھو تو کبھی پی ہے
اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ　مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے
اے شوق وہی مے پی اے ہوش ذرا سو جا　مہمان نظر اس دم اک برق تجلی ہے
کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر　تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

مغربی ڈھول کا سر میں نہ پہنچتا تھا اثر
اس قدر بات بہت خوب تھی عمامے میں

پھیر سکتی نہیں تقوے سے مجھے کوئی صدا
شرط یہ ہے کہ وہ پازیب کی جھنکار نہ ہو

نون تنہا کو میں ہے کیوں میم سے لکھتے ہیں لوگ
مدتوں تک میں نہیں سمجھا تھا اس مضمون کو

آج لٹریری لطیفہ یہ سنا اک دوست سے
میم نے ماہی کے نگلا حضرت ذوالنون کو

لیا صبح شب وصل اس کا بوسہ میں نے یہ سچ ہے
اسی پر بول اٹھی وہ شوخ مس یہ فائنل ٹچ ہے

FINAL = آخری
TOUCH = چھونا
تصویر کی تکمیل میں جب خد وخال درست کئے جاتے ہیں تو آخری رنگ آمیزیوں کی ہلکی جنبش اور موقلم کے نشانات کو FINA TOUCH کہتے ہیں۔

تو حشر کا منکر ہے جو اے فتنۂ دوراں
کہتا ہے کہ نیچر میں پتہ اس کا کہاں ہے فطرت

انگریزی لفظ محض مخاطب کی مادہ پرستی ظاہر کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

نیچر ہی سے ابھرا ہے ترا قامت رعنا
نیچر ہی میں واللہ قیامت بھی نہاں ہے

یہ تو زینت ہے کہ پہنے ہیں جڑاؤ بالے
یہ قیامت ہے کہ اللہ مرے کان کی خیر

مٹی کو آگیا ہے روحوں کا پھانس لینا
سب کے گلے پڑا ہے دن رات سانس لینا

ہوش وخرد کا نزلہ تکلیف دے رہا ہے
جائز سمجھ لیا ہے یاروں نے پھانس لینا

بت مشرق نہیں محتاج سامان
کمر ہی جب نہیں کیسا کمر بند

آپ کی ہر گز نہیں کے آگے کیا بس ہے مرا
لیکن اتنا تو ذرا سن لوں کہ آخر کیوں نہیں

پڑجائیں ابھی آبلے اکبرؔ کے بدن میں
پڑھ کر جو کوئی پھونک دے اپریل مئی جون

تمھاری احتیاطیں مطمئن کرتی نہیں مجھ کو
سمجھتا ہوں قدم رکھتا ہے چور آہستہ آہستہ

جو کہا میں نے کہ پیار آتا ہے مجھ کو تم پر
ہنس کے کہنے لگے اور آپ کو کیا آتا ہے

نیچر ہی کا مطبخ ہے بہت معتبر اکبرؔ
تم دیکھتے ہو جس میں کوئی چھوت نہیں ہے

نیچر میں جوانی کو تو موجود ہی پایا
سائنس سے سنتے تھے کہیں بھوت نہیں ہے

آئے تو خنجر بکف میں ڈر کے مارے مرگیا
ان کی ورزش رہ گئی مری شہادت رہ گئی

نجد کے نغمہ کہاں ان ٹھمریوں کے سامنے　　دیس کو جس نے بھلایا وہ یہی کھماج ہے

دیس = وطن ، دیس ایک راگ ہے۔

مجھ کو رنج شکست شیشۂ دل　　ان کو غصہ کہ چور کر نہ سکے

امتحانوں سے ہوئے طے بحث جبر و اختیار
فیل جب ہو جائے مختاری میں تب مجبور ہے

فیل = ناکامیاب۔

نیٹوئیت پر کیا ہم نے جو اظہار ملال　　سن کے صاحب نے کہا سچ ہے مگر ہم کیا کریں
چاہتا ہوں صرف ایک بوسہ دہان تنگ کا　　خواہشیں اس سے زیادہ اب کوئی کیا کم کرے

ہم ڈنر خواہی و ہم آروغ صاف　　ایں خیال است و محال است و گزاف

آروغ = ڈکار ۔ گزاف = بڑا بول

اس بت کے لب و رخ کا لیا بوسہ پس از عقد　　مجھ شاعر مشرق کا ہنی مون یہی ہے

شہد = HONEY
چاند = MOON

ہنی مون وہ زمانہ ہے جو ولایتی دولھا دلھن شادی کے بعد سیاحی میں صرف کرتے ہیں اور اس کی میعاد دو ماہ سے دس ماہ تک حسب حیثیت مختلف ہوا کرتی ہے۔

اسے اقرار اغوا رہے یہ اغوا کو چھپاتے ہیں　　علیہ اللعن ہے شیطان لیکن ان سے اچھا ہے
بہت مبہم تمھارا مصرعہ ثانی ہے اے اکبر　　اشارہ ہے کدھر شیطان آخر کن سے اچھا ہے

ڈگول مول　　ہے۔ آخر آپ ہی بتایئے

سایہ مدت ہوئی غبارہ بنا　　پائچوں میں بھی اب بھرا ہے ہوا
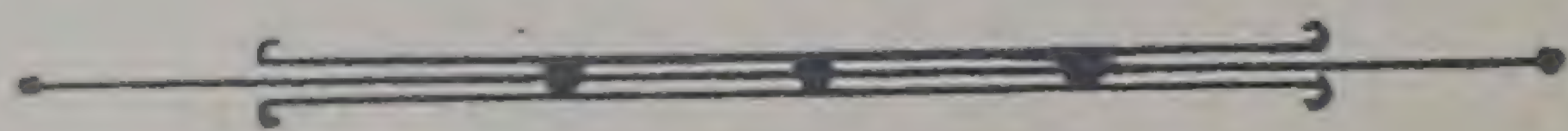
طاعون وتپ وکھٹمل مچھر سب کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے
بمبے کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف

آج وہ ہنستے ہیں میرے جبہ و شلوار پر — ایک دن ان کو فلک بندھوائے دھوتی تو سہی
اپنی اسکولی بہن پر ناز ہے ان کو بہت — کمپ میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی
اپنی دھن میں آبرو کی کچھ نہیں پروا انھیں — نذر معجون ترقی ہو یہ موتی تو سہی

نزاکت پر ستم ان کا یہ جوڑا اس قدر بھاری — ڈوپٹہ ہے مصیبت پائچہ مشکل سے اٹھتا ہے

حرم میں مسلموں کے رات انگلش لیڈیاں آئیں — پئے تکریم مہماں بن سنور کے بی بیاں آئیں
طریق مغربی سے ٹیبل آیا کرسیاں آئیں — دلوں میں ولولے اٹھے ہوس میں گرمیاں آئیں
اُمنگیں طبع میں ہیں شوق آرائش کا بلوہ ہے
کھلیں گے گل تو دیکھو گے ابھی کلیوں کا جلوہ ہے

کرتے کیا ان سے بھینٹ خالی — کر آئے ہم اپنی ٹینٹ خالی

عیش کا بھی ذوق بیداری کی شہرت کا بھی شوق — آپ میوزک ہال میں قرآن گایا کیجیے

تمہارے کھیت سے لے جاتے ہیں بندر چنے کیونکر
یہ بحث اچھی ہے اس سے حضرت آدم بنے کیونکر

کسی کو بھی کسی سے کچھ نہیں اس بات میں جھگڑا
کرو تم دھیان پرمیشر کا دل کو اس کا درشن ہو
مگر مشکل تو یہ ہے نام سب لیتے ہیں مذہب کا
غرض لیکن یہ ہوتی ہے جتھا ہو اور بھوجن ہو

یوسف کو یہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

واعظ الحاد کہو واہ نہیں ہے نہ سہی — تم سلامت رہو اللہ نہیں ہے نہ سہی
شب غفلت میں نہ ہو روز ازل کا پرتو — لمپ بجلی کا تو ہے ماہ نہیں ہے نہ سہی
ہے گدام آپ کا مسجد کی ضرورت کیا ہے — پیٹ تو ہے دل آگاہ نہیں ہے نہ سہی
ہے پرس پائے قلم کے لئے موجود اے دوست — سر کو سجدے سے اگر راہ نہیں ہے نہ سہی

طعن وطنز

کیا ہوا شمع حرم نے تو بجھائی اے دوست   دیر کے شعلہ زبانوں نے تجھے داد تو دی

ڈنر کا مجھ کو نہیں ہے چسکا وگرنہ ہے کارڈ میں تو لکھا
شراب ہوگی کباب ہوں گے حضور عالیجناب ہوں گے

سیّد کی روشنی کو اللہ رکھے قائم   بتی بہت ہے موٹی روغن بہت ہی کم ہے
کیا خوب پڑھ رہے تھے مصرعہ مہنت صاحب   بھنڈار تو ہے خالی بھاری مگر بھرم ہے
ایمان بیچنے پہ ہیں اب سب تلے ہوئے   لیکن خرید ہو جو علیگڈھ کے بھاؤ سے
میں نے اکبر سا بھی وہمی نہیں دیکھا کوئی   کہتا ہے ان کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے
تقدیس ماسٹر کی نہ لیڈر کا فاتحہ   یعنی نہ نور دل ہے نہ شمع مزار ہے
وہ مخبر رقیب ہے میں ہوں شہید عشق   یہ اپنی اپنی غیرت و ہمت کی بات ہے
جاپان و روس سے نہیں کچھ واسطہ ہمیں   چرخے کی یاں تو بحث ہے تبت کی بات ہے
مغربی تہذیب میں کس کو میں سمجھوں مستند   اس تماشا گاہ میں جو ہے وہ صاحبزادہ ہے

لوگ اپنے لڑکے کو صاحبزادہ کہتے ہیں۔ صاحب زادہ کے لغوی معنی صاحب یعنی "انگریز کا لڑکا" ہوئے

سخن سازی کی چالوں میں تو خامہ ان کا شاطر ہے
مگر جو حالت اصلی ہے وہ پبلک پہ ظاہر ہے

صوت ہزار طائر بد لحن نے سنی   کہنے لگا کہ بھاڑ میں بلبل کی چونچ جائے
اس نے کہا مقابلہ کا کب تھا یاں خیال   یہ تو وہی مثل ہوئی "کانا ہو کھو بچ" جائے
زر قوم سے لے کے ایسا سامان کرو   جس سے کہ تمہاری بزم بن جائے بہشت
حلوے مانڈے سے کام رکھو بھائی   مُردہ دوزخ میں جائے یا پائے بہشت

مثل ہے "اپنے حلوے مانڈے سے کام ہے مردہ چاہے دوزخ میں جائے چاہے بہشت میں"

دعوے بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو
طول شب فراق کو بھی ناپ دیجئے

سروس میں میں داخل نہیں ہوں قوم کا خادم — چندوں کی فقط آس ہے تنخواہ کہاں ہے

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم — یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی او دے

سر محمد اقبال کی ایک مثنوی کا ترجمہ انگریزی میں ہوا اور عرصہ انگلستان میں ان کی نظم بہت مقبول ہوئی۔

اک ڈنر میں کھا گیا اتنا کہ نکلی تن سے جان — خدمت قومی میں بارے جاں نثاری ہو گئی

ایک لیڈر صاحب دعوت سے واپس ہوئے تو ہیضہ ہوا اور مر گئے۔

نہ سہی لطف لحم گھی ہی سہی — شیخ صاحب مہنت جی ہی سہی

زندگی کو ضرور ہے اک شغل — خیر بالفعل لیڈری[3] ہی سہی

لیڈروں[1] کی دھوم ہے اور فالور[2] کوئی نہیں — سب تو جنرل[3] ہیں یہاں آخر سپاہی کون ہے

[1] رہبر = LEADER۔ [2] چیلے = FOLLOWER [3] فوجی افسر = GENERAL

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز — جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال — خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے — ایک ہیں خفیہ پولس میں ایک پھانسی پا گئے

وہ خرافات پر ہیں داد طلب — واہ وا پر عجب مصیبت ہے
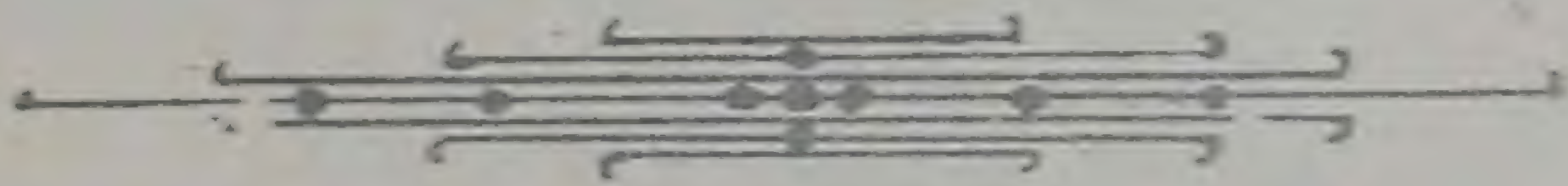
ظرافت

سرافرازی ہو اونٹوں کی تو گردن کاٹئے ان کی
اگر بندر کی بن آئے تو فیض ارتقا کہئے

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے
شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے

شکم کی پیٹھ ٹھونکی نفس امارہ نے خوش ہو کر
صدائے باطنی اٹھی کہ یہ کمبخت کافر ہے

لسان تیغ کبھی سرخرو یہ ہو نہ سکی
عجب نہیں کہ اسی سے تفنگ[1] پر تف ہے

[1] تفنگ توپ۔ تفنگ سے "نگ" نکال دیجیے تف باقی رہتا ہے جس کے معنی تھوکنے یا تھڑی تھڑی کے ہیں۔

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہو گئی
لیلیٰ و مجنوں میں آخر فوجداری ہو گئی

شکم سے حضرت انسان نجات پا نہ سکے
اب اپنے پیٹ میں ہیں پہلے ماں کے پیٹ میں تھے

اپنے پیٹ کی فکر میں ہیں۔

محو اضافہ وہ بت کھیوٹ پرست ہے
کہتا ہے آخرت کا یہی بندوبست ہے

اپنے عیوب پر تو ذرا بھی نہیں نظر
اوروں پہ اعتراض میں ہر وقت مست ہے

کیوں اپنے سر پہ زحمت بے سود لیجئے
کونسل کے بدلے گھر ہیں اچھل کود لیجئے

کھاپی کے گھر میں بیٹھئے اور گائیے بھجن
کاشی سے چل پراگ سے امرود لیجئے

ہو وضع اپنے دیس کی مال اپنے دیس کا
بہتر ہے راہ منزل بہبود لیجئے

اک ادا سے کہا مسوں نے کم آن
تیر کی مجھ میں اب روانی ہے

ادھر آ = COME ON - کمان = غلیل

ہر طرح راحت تھی مجھ کو دانت سے
قافیہ ان کا ملا تھا آنت سے

قسمت اب بگڑی تو ان میں درد ہے
اس طرف دیکھو تو معدہ سرد ہے

خواب راحت کس کو کھانا کون کھائے
رات بھر کرتا رہا ہوں ہائے ہائے

درد کے آگے رہا منجن بھی گرد
مصطگی بھی رہ گئی با روئے زرد

حضرت اکبر الہ آبادی نے جو خاص نام اور مرتبہ دنیائے صحافت و سخن میں حاصل کیا

ہے وہ محتاج تعارف نہیں۔ موصوف کا دلکش کلام ہند کے گوشہ گوشہ میں عزت و محبت کے ساتھ پہنچ چکا ہے۔ طرز بیان اس قدر سلیس اور عام فہم ہوتا ہے کہ عورتیں اور بچے بھی بقدر ذوق واوراک محظوظ ہو سکتے ہیں، ظرافت کے متعلق قرون وسطیٰ کے ایک زبردست فلسفی کا قول ہے "زندگی کے جتنے منٹ تفریح میں گذر جاتے ہیں وہ حیات میں شمار نہیں کئے جاتے" دوسرے لفظوں میں اصل مفہوم یوں سمجھ لیجئے کہ جو وقت تفریح میں گذر جائے انسانی زندگی اسی قدر بڑھ جاتی ہے۔ طبّی اعتبار سے بھی تفریح صحت کا جزو اعلیٰ ہے، یہی وجہ ہے کہ مہذب ملکوں میں جسم و دماغ کی تسکین و تفریح کے لئے تھیٹر۔ سینما۔ ہال روم۔ کتب خانہ۔ کلب گھر۔ تاش۔ شطرنج۔ گیند۔ بلا ٹینس۔ ہاکی۔ گھوڑ دوڑ وغیرہ ہزاروں قسم کے کھیل رائج ہیں۔ حضرت اکبرؔ کی عام قبولیت اس امر پر شاہد ہے کہ ظرافت کے پیرایہ میں خشک سے خشک مضامین نہایت دلچسپ و موثر بنائے جا سکتے ہیں۔ موصوف کے کلام کا خیر مقدم ہندوستان جیسے ملک میں بھی ہر جگہ اور ہر طبقہ میں کمال گرمجوشی سے کیا جاتا ہے جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس بہتے ہوئے دریا میں ہر مذاق اور ہر طبیعت کے موافق انمول موتیوں کا ڈھیر ہے۔ ظرافت کا لفظ بہ نفسہ نہایت جامع اور وسیع ہے۔ ظرافت کی بہترین تعریف جو زمانہ موجودہ و گذشتہ کے زبردست فلسفیوں نے متفقہ طور پر تسلیم کر لیا ہے یہ ہے "ظرافت ایک لطیف اثر ہے جس سے انسانی دماغ کو فرحت حاصل ہوتی ہے"

ظرافت کے لئے (جیسا عام طور پر سمجھا جاتا ہے) ہنسی یا مسکراہٹ ضروری نہیں ہے، یہ لطیف اثر اکثر الفاظ یا حرکات میں مضمر ہوتا ہے۔

ظرافت کی قسمیں جن سے اکبرؔ کا کلام مالا مال ہے کم از کم میرے احاطۂ شمار سے باہر ہیں بہر طور چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

رشوت ہے گلوئے نیکنامی کا چھرا | عیاشی بھی ہے بدی کے پہئے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بُری | گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

یہ اخلاقی ظرافت ہے۔

چار مصرعوں میں ہندوستان کے چار طبقوں (راشی۔ عیاش۔ خوشامدی اور گستاخ) کی مکمل تصویریں موجود ہیں۔ چھُرا اور دُھرا صرف قافیہ کی غرض سے نہیں لائے گئے بلکہ خاص مفہوم کے حامل ہیں۔ اہل نظر و تجربہ خوب جانتے ہیں کہ راشی آدمی خواہ کیسے ہی مغز عہدہ پر ممتاز ہو اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصہ میں حضرت معلم الملکوت کی طرح مشہور و نیکنام ضرور ہو جاتا ہے۔ فارسی کے اکثر شعرائے رشوت کو ”خنجر طلائی“ سے تشبیہہ دیا ہے دوسرے مصرعہ میں دائرہ ابدی کے اندر عیاشی کا وہی مرتبہ دکھلایا گیا ہے جو اہمیت پہیے میں دھرے کی ہے، کیا اس امر سے کوئی عقل والا انکار کر سکتا ہے کہ عیاشی اور صدہا بُرائیوں کا ساتھ چولی دامن کا ہے سب سے پہلی بدی جو عیاشی کا ضمیمہ ہے قرض کی عادت ہے نفس امارہ کی ”بالک ہٹ“ پوری کرنے کے لئے قرض دام کی لت ہو جاتی ہے جن کا آخر نتیجہ یہی ہے کہ اینٹ سے اینٹ بج جائے۔ دوسری بدی شراب اور کسی منشی شے کا استعمال ہے۔ تیسری بدی خرابی صحت ہے جس کی بدولت عیاش کا کیسۂ زر ہمیشہ حکماء اور اطبا کے لئے کھلا رہتا ہے مگر کب تک ؟ بعض وقت مقدمہ بازی مار پیٹ اور قتل و غارت کا اصلی سبب یہی عیاشی ہے بے محل خوشامد بُری ضرور ہے لیکن گستاخی سے کہیں اچھی ہے۔ گستاخی سے کوئی ضرورت رفع نہیں ہوتی مگر خوشامد سے پچاس فیصدی، کام چل جاتا ہے۔ اگر ان چاروں مصرعوں کو وسعت دی جائے اور اثرات و نتائج سے واقعات کے ساتھ بحث کی جائے تو چار مستقل کتابیں لکھی جا سکتی ہیں مگر علم و فضل کا بہترین مصرف یہی ہے کہ دریا کو کوزہ کے اندر بند کر دیا جائے۔ وہ تمام نصیحتیں جو ان چند لفظوں میں سامع کے حواس پر اثر ڈالتی ہیں اگر دنیا کی بیش بہا جواہر کے ساتھ تولی جائیں تو بھی انھیں کا پلہ بھاری رہے گا۔

چُھلیاں اک دوسرے کی وقت پر جڑتے بھی ہیں — ناگہاں غصہ جو آجاتا ہے لڑ پڑتے بھی ہیں
ہندو و مسلم ہیں پھر بھی ایک اور کہتے ہیں سچ — ہیں نظر آپس کی ہم ملتے بھی ہیں لڑتے بھی ہیں

یہ سیاسی ظرافت ہے۔

مگر معاشرتی پہلو لئے ہوئے۔ چوتھے مصرعہ میں شستگی بیان۔ لطف زبان بندش

محاورہ، نشاط تشبیہ اور بلاغت کے علاوہ حسیات و جذبات کا ایک دریا لہریں لے رہا ہے۔ لڑنے اور ملنے کے مختلف مگر برابر کی لطیف کیفیتوں کا لطف انھیں کے دل سے پوچھئے جو صاحب نظر ہیں۔ پہلے مصرعہ کی چغلی جڑنا، چغلی کھانے سے زیادہ عمدہ ہے۔ محاورات میں تصرف بھی نہیں۔ پہلے اور دوسرے میں بعض وطن پرست حضرات کی دو خاص کمزوریوں کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے مصرعہ میں ہندو و مسلم کے اتحاد کی ضرورت اور اہمیت آزادی کے ساتھ دکھائی گئی ہے کہ ہندو و مسلم ایک جسم کی دو آنکھیں، ایک آنکھ کی دو نگاہیں اور ایک نگاہ کی دو کیفیتیں ہیں۔ کیا کیفیت نگاہ سے، نگاہ آنکھ سے اور آنکھ جسم سے دُور ہو سکتی ہے؟ کاش ہندو اور مسلمانوں میں تعصب کے بعض متوالے اس حقیقت کو سمجھ لیں اور غریب ہندوستان کو کلکتہ۔ سرحد۔ کانپور اور بمبئی کے ناگوار شر و فساد سے فرصت نصیب ہو جائے۔

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی
"من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو"
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے بہتر تو ہے وہ
"من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو"

یہ ادبی ظرافت ہے۔

اس رُباعی کا صحیح اطلاق زیادہ تر رسائل و اخبار کی موجودہ دُنیا پر ہے جہاں کچھ ہستیاں ایسی نظر آئیں گی جو ادبی تنقید اور علمی تبصرہ سے قطع نظر کرتے ہوئے ذاتیات پر حملہ کرنے کے لئے ہر وقت قلم بکف رہتی ہیں اور اپنی بے حجاب تحریر میں اخلاق و تہذیب کے تمام پہلو فراموش کر دیتی ہیں۔ بعض لوگ اپنی معیشت کا ذریعہ صرف یہی سمجھتے ہیں کہ معاصرین کو گالیاں دی جائیں۔ مرحوم کی رباعی ایسے حضرات کے لئے تازیانہ عبرت ہے۔ اخبار کے ناظرین سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ چوتھے مصرعہ والا مرض لیڈروں میں بھی سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اللہ رحم کرے۔

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ
تا دمِ مرگ رہے یادِ خدا جان کے ساتھ
میں نے مانا کہ تمھاری نہیں سنتا کوئی
سر ملانا تمھیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

یہ مذہبی ظرافت ہے۔

ان مصرعوں میں استقلال وصداقت کے سبق دیئے گئے ہیں۔ بعض لوگ محض ان مجبوریوں سے کہ زمانہ کا رنگ بدل گیا ہے۔ غیروں کی روٹیوں پر پلتے ہیں اور صدق و صفا کے راستہ سے بھٹک کر بروں کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔

کمیٹیوں سے نہ ہوگا کچھ بھی غرض اگر مشترک نہ ہوگی
خیال ملت نہ ہوگا جب تک مفید ہرگز یہ بک نہ ہوگی
بہت بجا نوٹ لکھ گئے ہیں یہ اپنی پوتھی میں بھائی مانک
غذا نہ ہوگی تو کیا جیوں گا دیا کرو تم ہزار ٹانک

ایسے مریض جن کی غذا صرف اطباء کی مقوی ادویہ تک محدود ہو کئے دن چل سکتے ہیں دوائیں معاون و محرک ہیں جو فطرت کی زنگ خوردہ مشین کو صاف کر دیتی ہیں کبھی کوئی دوا کوئی نئی قوت نہیں پیدا کر سکتی۔ یہی حال اصول کے درستگی کی ہے۔ اگر بنیاد ٹھیک نہیں تو لکچروں کے قلعے اور ستیہ گرہ کے محل سب بیکار ہیں۔

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی
شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

یہ اقتصادی ظرافت ہے۔

ہندوستان کے تجارت پیشہ طبقہ کو خاص طور پر نصیحت کی گئی ہے کہ مشترک سرمایہ و شفقت سے کارخانے جاری کر کے تمام منافع اور سہولتیں قابو میں کر لی جائیں جو امریکہ اور جاپان۔ جرمن و انگلستان کو حاصل ہیں۔ انفرادی حیثیت سے تمام ترقیاں محدود ہو جاتی ہیں ہندوستان نعم فطری سے مالا مال ہے جس قدر لوازم تجارت و صنعت (RAW MATERIAL) ہندوستان میں موجود ہے دنیا کے کسی حصہ میں نہیں۔ اگر اصل المال اور محنت مشترک کر لی جائے تو قالین بافی تجارت آنبہ وغیرہ سے کروڑوں روپے ایک دن میں حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

پاکیزگی نفس کی دشمن مے ہے
انسان کو خراب کرنے والی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیویٹ سکریٹری
مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

یہ اسلامی ظرافت ہے۔

"ہے" "ہے" کی لفظی تکرار میں صد ہا لطافتیں ملفوف ہیں۔ نشہ کی حالت خمار کی کیفیت عبرت کا سوز و گداز۔ منہ کا بگڑنا۔ تھو تھو کرنا سب ان دو لفظوں میں ہے۔ ترک مے کیلئے کیا اچھی دلیل لائی گئی ہے کہ بیگم صاحبہ شراب مسٹر شیطان کے کابینۂ وزرار کی خاص الخاص سکریٹری ہیں۔

مسلمانوں میں اب تعلیم انگلش رُک نہیں سکتی — کسی سے مغرب و مشرق کی بسازش رُک نہیں سکتی

تعلیمی ظرافت

وہ نزلہ رک نہیں سکتا یہ پیچش رک نہیں سکتی — بڑے بوڑھوں کی لیکن یہ بھی خواہش رک نہیں سکتی

مذاق قوم بیگانہ نہ ہو اللہ اکبر سے

یہ نقش جانفزا مٹنے نہ پائے دل کے دفتر سے

تہمد پہ ہے شبہ و حقارت کی نظر — پتلون پہ غصہ و شرارت کی نظر

بہتر ہے یہی برہنہ پھریئے اکبر — شاید پڑ جائے ان کی رغبت کی نظر

اس قطعہ میں جو ابتذال ہے وہ ظاہر ہے مگر شاعر کی نظر سے مستقبل کے پردے اُٹھ جاتے ہیں وہ بہت دور تک دیکھتا ہے۔ آج جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان وغیرہ میں نہ صرف برہنہ ناچ ہوتے ہیں بلکہ مادر زاد برہنہ مرد عورت لڑکے لڑکیاں سب کے ناچ گھر، باغ، حوض، کلب، تفریح گاہیں بھی بنتی جا رہی ہیں۔

پائے در پتلون دل در شعر آز — چند روزے باہمیں حالت بساز

سنتا ہوں محال ہے خدائی سے گریز — لیکن کہتا تھا مجھ سے کل اک انگریز

تم مانگ لو اپنے شاعروں سے گھوڑا — فطرت کے حدود سے زیادہ ہے وہ تیز

حقیقت میں میں بلبل ہوں مگر چارے کی خواہش میں — بنا ہوں ممبر کونسل یہاں مٹھو میاں ہو کر

بی شیخانی بھی ہیں بڑی پُر جوش — کہتی ہیں شیخ سے بجوش و خروش

خواہ لنگی ہو خواہ ہو تہمد — در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز — بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز

"بھینس کے آگے بین بجے اور بھینس کھڑی پگھرائے۔"

پشے نے کہا سبک نشینی میری ہے قابل داد اگر کریں آپ معاف
میں نے یہ کہا بجا ہے لیکن یہ نیش ہے بارگران و تلخ تقصیر معاف
آگئی زلف مساں زلف بتاں پر غالب پیچ ہوتے تھے ہم افعی ورآسو کی طرح

سانپ اور نیولا۔

اکبر اس عہد میں لے صبر و تحمل سے جو کام اس سے اچھا ہے کہ غصہ کرو باؤ کی طرح
مچھروں نے بہت ستایا رات میں نے کوسا کہ تم کو ہو طاعون
بولے اس کا ہمارا منبع ایک کیوں وہ کرنے لگا ہمارا خون
سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے
ہرچند کہ مجھ کو اعتقاد اب تک ہے تاہم بلحاظ وقت دل میں شک ہے
بیٹھے تو بہت ہی سر جھکا کر ہیں حضور کیا جانے مراقبہ ہے یا پینک ہے
میں تو انجن کی گلے بازی کا قائل ہو گیا رہ گئے نغمے حدی خوانوں کے ایسی تان لی

جھکا ہے سر اپنا پائے بُت پر زباں پر ہے گِلا جفا کا
میرے عمل میں ہے طرز سید غزل میں انداز لاجپت ہے
کہاں کے ہندو کہاں کے مسلم بُھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ نہ گیارھویں ہے نہ اسٹمی ہے

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت کبوتر اُڑ گئے انجن کی پین سے
شائق تحقیق کے یہ مضمون سن لیں انسان کی شکل جیسے میمون بنا
پاجامہ بھی یونہی ارتقار سے بدلا سمٹا اُبھرا غرض کہ پتلون بنا
بوزنے کو ارتقار نے کر دیا انسان تو کیا انقلاب حرف نے مولی کو ولیم کر دیا

مولی کے حرفوں کو الٹئے ولیم ہو جائے گا۔ مولی کا لفظ مولے بھی پڑھا جا سکتا ہے۔

ہوا پر دی جگہ اللہ نے غربی مشینوں کو زمیں سے غمزہ انجینیری اب اُٹھ نہیں سکتا
موج نصیحت اک طرف دل کی روانی اک طرف کل شیخپورہ اک طرف میری جوانی اک طرف

جوانی کی مجبوریاں دکھائی گئی ہیں۔ شیخپورہ۔ بستی شیخپورہ ایسی بستی جہاں صرف شیخ ہی شیخ آباد ہوں

دربار سلطنت میں ہے کبر و خود پسندی ــــ مذہب میں دیکھتا ہوں جنگ اور گروہ بندی
رندی و عاشقی کا ہے شغل سب سے بہتر ــــ لمینڈ ہے اور وھسکی بندہ ہے اور بندی

شربتِ لیمو } یعنی کسی سے کچھ مطلب نہیں۔ اپنے رنگ میں مست ہیں۔ اپنے کام سے کام ہے۔
شراب } بندہ ہے اور بندی۔ میاں ہیں اور بیوی یا ہم ہیں یا معشوق

غلطی مجھ سے ضرور یہ ایک ہوئی ــــ پیدا وجہ نصیحت نیک ہوئی
لینا تھا لغت سے اور ہی لفظ کوئی ــــ اس کو جو لیا یہ مجھ سے مسٹیک ہوئی

MISTAKE = غلطی، MISS = (مس) دوشیزہ، TAKE = لینا۔ دونوں معنی جدت کی جان ہیں۔

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ــــ اے نیچر و سائنس بھلا کچھ تو ادھر بھی
گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی ؎ اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی۔ تبدیلِ الفاظ سے نئے معنی پیدا کئے ہیں اور نیچر و سائنس کے معاملات میں ہندوستان کی غربت دکھائی ہے۔

مجھ خستہ کی ہستی نہیں کچھ آپ کے آگے ــــ بھرتے کی ہے کیا اصل مٹن چاپ کے آگے
ایک انگریزی کھانا ہے جس میں گوشت کو بھون کر نہایت سخت کر دیتے ہیں۔ بھرتہ آلو کا بنتا ہے اور بہت خستہ ہوتا ہے۔

مکہ تک ریل کا سامان ہوا چاہتا ہے ــــ اب تو انجن بھی مسلمان ہوا چاہتا ہے
مشہور ہے کہ جو مکہ کی سرحد میں پہنچ جاتا ہے وہ بہت جلد سیدھے راستہ پر آجاتا ہے۔

اکبر بھی قومی کام کو اٹھے بشوق مغفرت ــــ ہز ہائینس کے ہم عنان ہز ہولینس بھی ہو گئے
(شاہی خطاب) عالیجاہا HIS HIGHNESS (جدت طبع) HIS HOLINESS جناب بکہ وتنہا صاحب۔

کی ہے معدے نے کمیٹی پیٹ میں ــــ بائی لا ہر اک کے اندر ٹھیک ہے
حضرت نزلہ ہیں صدر انجمن ــــ دم بدم ان کی بھی اک تحریک ہے
قانون

جب کہا گیسو کا بوسہ دیجئے دل لیجئے ــــ ہنس کے بولے آپ کو سودا ہے مسہل لیجئے

اس کی بیٹی نے اٹھا رکھی ہے دنیا سر پہ
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

بنت عنب۔ دخت رز کی طرف اشارہ ہے۔

پارک میں ان کے دیا کرتا ہے اسپیچ دفا
زاغ ہوجائے گا اک دن آنریری عندلیب

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا
جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

مرے خط بے اثر ہیں اس نگاہ ناز کے آگے
وہاں ہے تار بجلی کا یہاں کاغذ کے گھوڑے ہیں

کچھ مزہ گیہوں کا کچھ حوّا کے کہنے کا خیال
آپ ہی کہئے کہ اس موقع پہ آدم کیا کریں

بعد سید کے میں کالج کا کروں کیا درشن
اب محبت نہ رہی اس بت بے پیر کے ساتھ

غرب کی مدح بھی ہے شرق کی تحسین کے ساتھ
ہم پیانو بھی بجانے لگے اب بین کے ساتھ

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا
انس اس وجہ سے کم رکھتے ہیں یاسین کے ساتھ

یاسین نام۔ یاسین سورۂ یٰسین نزع کے وقت مرنے والے کو سنائی جاتی ہے۔

شوق طول و پیچ اس ظلمتکدہ میں ہے اگر
بات سن بنگال کی بنگالیوں کے بال دیکھ

بنگالیوں کی بات الجھی ہوئی ہوتی ہے ان کے بال پانوں تک لہراتے ہیں۔ دو خصوصیات کی تصویریں کھینچی گئی ہیں۔

شیخ دمساز پیانو ہو کے بھولے اپنی لے
گو سُریلے ہوگئے لیکن بری گت ہوگئی

کیوں نہ لوں نام خدا اُس بُت کی صورت دیکھ کر
لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہئے

دوپہر کو مرے گھر آئی مس رشک قمر
کہہ دیا میں نے کہ یہ نون کا مون اچھا ہے

دوپہر کا چاند۔

جب ضرورت ہوگی تقوی کی تو دیکھا جائیگا
اب تو بزم مغربی ہے اور نوشا نوش ہے

غرب کہتے تھے تم جس کو وہ کمسریٹ کا خچر تھا
جسے شائستگی سمجھے تھے آخر کر کری نکلی

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی
شب گناہ نماز سحر یہ خوب کہی

مدتوں قائم رہیں گی اب دلوں میں گرمیاں
میں نے فوٹو لیا اُس نے نظر پہچان لی

باہم شب وصال غلط فہمیاں ہوئیں
مجھ کو پری کا شبہ ہوا اُن کو بھوت کا

عارض نہ ان کا گل ہے نہ دل میرا آئینہ — رنگین جھوٹھ وہ ہے اگر یہ ہے سادہ جھوٹھ

اپنی جبیں سے چینؔ کے مالک ہو تم اگر — میں بھی ہوں شاہ روس کہ دل میرا زارؔ ہے

چینؔ = CHINA - چین شکن - زارؔ = نحیف ، زارؔ شاہ روس کا لقب۔

تہذیب مغربی میں بوسہ تلک ہے معاف — اس سے اگر بڑھو تو شرارت کی بات ہے

مجنوں کے پیاس کو بجھاتی — لیلیٰ کچھ باولی نہیں تھی

باؤلیؔ = ناداں - پاگل ، باؤلیؔ = بڑا کنواں۔

شاخ میں پھل کا لگا رہنا ہے خامی کی دلیل — عقل پختہ ہو کے میرے سر سے زائل ہو گئی

بڑھا پاتا ہوں بنگالی کا درجہ ہر طرف صاحب — زمانے میں نیا یہ دور ہے ماہیؔ مراتب کا

ماہیؔ مراتب = عزت عظمت (بنگالی کثرت سے مچھلی بھات کھاتے ہیں)

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم — اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

گولیؔ = بندوق کی گولی - گولی چورن کی۔

سکۂ زر با بوے در دھوتی زر دار داشت — با وجوش نالہائے زار درا خبار داشت

گفتمش در عین وصل ایں نالہ و فریاد چیست — گفت مارا خوف فیس و ٹکس درایں کار داشت

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس — بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ

آیندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر — فوراً داغوں گا اک ڈفیمیشن سوٹ

ہتک عزت کا دعویٰ۔

شیطان کا سنا جو شیخ صاحب نے یہ قول — بولے کہ فضول تجھ کو آتا ہے یہ ہول

میں خود ہوں بدل گیا زمانے کے ساتھ — پڑھتی ہے مجھی پہ اب تو دنیا لاحول

حضرت اکبر سے سن کر یہ لطیفہ بزم میں
سب ہنسے کچھ رہ گئے خون جگر کے پی کے گھونٹ
شیخ جی رفرف بنے پھرتے تھے پہلے چرخ پر
چشم بد دور اب بنے ہیں آپ کمسریٹ کے اونٹ

اکبر اگرچہ موسم باراں خوش است و خوب — لیکن چو گوش و چشم دریں فصل وا کنید

مچھر دود کہ گوشش بہ فریاد بندہ نیز
بھنگار سد کہ گوشہ چشمے بما کنید

کچھ الہ آباد میں سامان نہیں بہبود کے
یاں دھرا کیا ہے بجز اکبرؔ کے اور امرود کے

جناب صفیؔ نے ۱۹۱۷ء کی آل انڈیا شیعہ کانفرنس میں لخت جگر کے سلسلۂ ضمیمہ میں الہ آباد کی عموماً اور خسرو باغ کی خصوصاً مدح سرائی کی ہے جس میں مبالغہ بھی ہے اس کے ساتھ اکبرؔ کا یہ شعر پڑھنا چاہیے

شیخ بھی ہیں دہر کے قائل بس اتنا فرق ہے
مجھ کو بوسہ چاہیے اُن کو سموسہ چاہیے

(بوسہ = دلی جذبہ۔ سموسہ = پیٹ کی خواہش)۔ ایک لطیفہ مشہور ہے۔ زیب النسا۔ (در پس پردہ "چیزے می خواہی"۔ مہمان "سنبوسہ بیین بیار"۔ یعنی بیین کا سموسہ لاؤ۔ یا سنبوسہ میں سے سن نکال دیجیے تو بوسہ رہ جاتا ہے۔ بیین کا سنبوسہ یعنی بوسہ لاؤ۔ زیب النسا۔ (خفا ہو کر) از مطبخ مادر طلب (۱) میرے باورچی خانہ سے منگا لیجیے (۱) ماں کے باورچی خانہ سے منگایئے۔

رشتہ در گردنم افگندہ پیٹ
می برد ہر جا کہ میز است و پلیٹ

"رشتہ در گردنم افگندہ دوست ÷ می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست" بعض زبردستی کے لیوزر مصاحبین اور حاشیہ نویسوں کا مضحکہ ہے۔

در کار چندہ سیم و زر از جیب دور رفت
مال حضور بود بجائے حضور رفت

"مال حرام بود بجائے حرام رفت"

ہے دل روشن مثال دیو بند
اور ندوہ ہے زبان ہوشمند

ہاں علیگڈھ کی بھی تم تشبیہ لو
اک معزز پیٹ بس اس کو کہو

پیٹ ہے سب پر مقدم اے عزیز
گو کہ فکر آخرت ہے اصل چیز

نہ ہر کہ ووٹ بدید و خت ممبری داند
نہ ہر کہ بحث بیاموخت لیڈری داند

نہ ہر کہ ہیٹ بپوشید و کوٹ در بر کرد
ادائے مغرب و آئین مسٹری داند

دربار دہلی اک طرف لوکل مجالس اک طرف
سنہ ۱۹۱۱ء

مرزا کا چم خم اک طرف بدھو کی گھس گھس اک طرف

راجہ میں ہندی فربہی موٹر کی طینت آتشی

مرطوب و بارد اک طرف اور حار و یابس اک طرف

دیکھ آئے ہم بھی دو دن رہ کے دہلی کی بہار / حکم حاکم سے ہوا تھا اجتماع انتشار
آدمی اور جانور اور گھر مزین اور مشین / پھول اور سبزہ چمک اور روشنی ریل اور تار
کیروسین اور برق اور پٹرولیم اور تارپین / موٹر اور ایروپلین اور جمگھٹے اور اقتدار
مشرقی پتلون میں تھی خدمتگذاری کی امنگ / مغربی شکلوں سے شان خود پسندی آشکار
شوکت و اقبال کے مرکز حضور امپرر / زینت و دولت کی دیوی امپرس عالی تبار
بحر ہستی لے رہا تھا بیدریغ انگڑائیاں / ٹیمز کی امواج جمنا سے ہوئی تھیں ہمکنار
انقلاب دہر کے رنگین نقشے پیش تھے / تھی پئے اہل بصیرت باغ عبرت میں بہار
ذرے ویرانوں سے اٹھتے تھے تماشا دیکھنے / چشم حیرت بن گئی تھی گردش لیل و نہار
مصلحت آمیز ہر طرز و طریق انتظام / حکمت آگیں ہر ادائے حاکمان نامدار
جامے سے باہر نگاہ ناز فتحان ہند / حد قانونی کے اندر آنر بلوں کی قطار
خرچ کا ٹوٹل دلوں میں چٹکیاں لیتا ہوا / فکر ذاتی میں خیال قوم غائب فی المزار
نفس کے تابع ہوئے ایمان رخصت ہو گیا / وہ زنانے میں گھسے مہمان رخصت ہو گیا

امتیاز خصوصیت مصطلحات، قوافی، تبدیلی پن، اشارات ۔

پھرتی ہے ارض آفتاب کے گرد / بندہ چکر میں ہے جناب کے گرد
شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی / بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں
ہنگامہ محشر کا تو مقصود ہے معلوم / دہلی میں یہ دربار ہے معلوم نہیں کیوں
ہیں کلکٹر نزع میں عملے گھڑے ہیں دم بخود / جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں
سب پہ حاوی ہیں لعبتان فرنگ / چپ ہیں بیگم بھی بت ہیں رانی بھی
بوڑھے ہنسی کو اپنی ثابت کریں تو کیوں کر / جب دانت ہی نہیں ہیں پھر کون چیز نکلے

ایک لعبت چین کو لندن سے جو بیاہ کے لائے مفاعیلن
احباب نے تیر مطاعن سے ان کے دل کو مجروح کیا
باپ ان کے یہ بولے کشتی مری واللہ ڈبو دی ہائے غضب
اس لڑکے نے صحبت بد پا کر یہ کار ابن نوح کیا

تعلیم کو بھیجا تھا میں نے ترویج کی اُس نے ٹھہرائی
ممدوح تو بننا بھول گیا بس اپنے تئیں منکوح کیا
لڑکے نے جواب میں عرض کیا اے قبلہ و کعبہ سنئے تو
یہ کون برائی میں نے کی جو فاتح کو مفتوح کیا

نوح کے بچوں نے (سوا ایک کے) سرکشی کی تھی۔ تفصیل کے لئے کلام پاک ملاحظہ کیجئے۔ "اگرچہ خود اپنے کو" بھی کہہ سکتے تھے مگر متروک کا استعمال کر کے ایک خاص کیفیت پیدا کی ہے۔

میں نے کہا بہت سی زبانیں ہوں جانتا
مدت تک امتحان دیئے امتحان پر
جرمن فرنچ لیٹن وانگلش پہ ہے عبور
ثابت مرا کمال ہے سارے جہان پر
اک شوخ طبع مس نے دکھائی مجھے زباں
بجلی تھی ابر میں کہ قمر آسمان پر
بولی رہو گے زیست کی لذت سے بیخبر
قدرت نہ پائی تم نے اگر اس زبان پر
پھرے اک مولوی صاحب جو کل دربار دہلی سے
یہ پوچھا میں نے کچھ لائے بھی تم سرکار دہلی سے
وہ بولے سُن کے اے اکبر کہوں کیا تجھ سے حال اپنا
اسی مطلع سے بس کرتا ہوں اظہار خیال اپنا
ادھر سرخی مئے گلگوں کی تھی انڈے کی زردی تھی
ادھر ریش سپید اپنی تھی اور شدت کی سردی تھی

یہ نظم ایک لمبی تمہید و تحسین کے ساتھ ۶ رمئی ۱۹۱۲ء کے انسٹیٹیوٹ گزٹ میں چھاپی گئی اگرچہ مرحوم نے پرائیویٹ خط لکھا تھا۔

آپ کا برتاؤ موسم کے موافق تھا ضرور
واقعی اس کے اثر سے دل بخوبی پک گیا
دعوتیں انعام اسپیچیں قواعد فوج کمپ
عزتیں خوشیاں امیدیں احتیاطیں اعتبار
پیش رو شاہی ہے پھر ہز ہائنس پھر اہل جاہ
بعد اس کے شیخ صاحب ان کے پیچھے خاکسار
مال گاڑی پر بھروسہ ہے جنھیں اے اکبر
ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا
آسماں کو تو غلط ثابت کیا سائنس نے
عرش باقی تھا سو وہ بھی مدشک میں آگیا
امید چشم مروت کہاں رہی باقی
ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا

بات کرنے کا آلہ۔

نگاہ گرم کرسمس میں بھی رہی ہم پر
ہمارے حق میں دسمبر بھی ماہ جون ہوا

دسمبر میں کرسمس ہوتا ہے اور سردی ہوتی ہے۔ ماہ جون میں سخت گرمی ہوتی ہے۔

چشم تر دیکھ کر وہ مس بولی
محکمہ ہے یہ آب پاشی کا

باقی نہیں وہ رنگ گلستان ہند میں
محنت کا اب ہے کام قلستان ہند میں

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گو بخشدے
گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

اگرچہ لوگوں نے لکھا ہے حال بعد وفات
مگر کوئی بھی نہیں کہہ سکا یقینی بات

جو بات ٹھیک ہے وہ ہم کو ہو گئی معلوم
ہمارے شعر کی دنیا میں مچ گئی ہے دھوم

بتائیں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

میں نے سحری کھانے پر ٹوکا تو وہ جھنجلائے تھے
اور جناب واعظ نے چورن سے فقط افطار کیا

کیوں؟ اس لئے کہ سحری زیادہ کھانے سے پیٹ گڑبڑ ہو گیا تھا۔

الفاظ ثقیلہ کو مغرب نے کیا خارج
اب دم کی جگہ ملت ندے کی جگہ کالج

"دم میں ندا" ایک محاورہ ہے۔

کرتا ہوں ہر اینٹ پر نوحے رکا رہتا ہے کام
تنگ ہے وہ شوخ مجھ تاریخ داں مزدور سے

میم نے شیخ کو ڈانٹا تو پکارے وہ غریب
دیکھئے توپ نے لاٹھی کو دبا رکھا ہے

ڈائری میں ہو گیا تھا اختلاف اندراج
لڑ گئے خفیہ پولیس سے کل کراماً کاتبین

روزنامچہ = DIARY
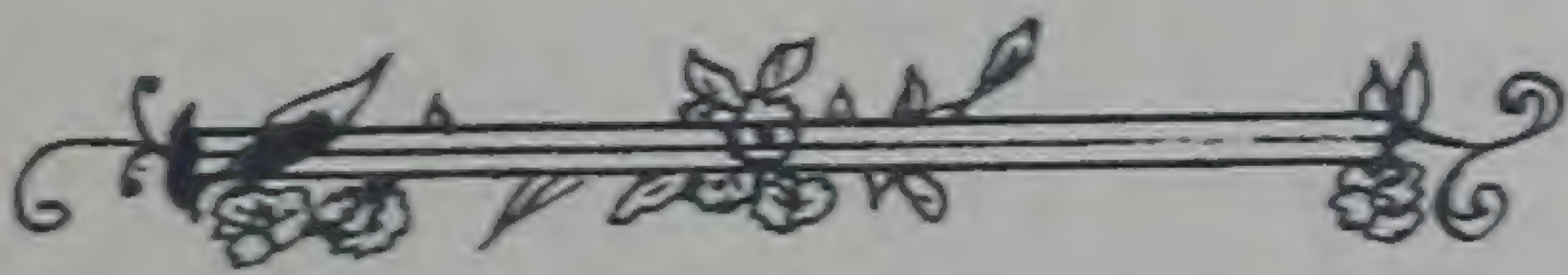
علوئے نفس

کہو کرے گا حفاظت میری خدا میرا
رہوں جو حق پہ مخالف کریں گے کیا میرا

میری حقیقت ہستی یہ مشت خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا

بے غرض ہو کر مرنے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

عطا ہوئی ہے اگر بصیرت تو ہے یہ حال مقام عبرت
خدا سے اتنا بعید ہونا خودی سے اتنا قریب ہونا

حضرت اقبال کی مثنوی اسرار خودی اور اکبر کے خطوط عزیز حسن نظامی کے نام ملاحظہ فرمائیے۔

اے برہمن ہمارا تیرا ہے ایک عالم
ہم خواب دیکھتے ہیں تو دیکھتا ہے سپنا

خانۂ تن کی خرابی کا میں کرتا رنج کیا
گوہر جان پر فقط اک گرد کا انبار تھا

کفر و اسلام کی تفریق نہیں فطرت میں
یہ وہ نکتہ ہے جسے میں بھی بمشکل سمجھا

جہاں صورت کا ذرہ ذرہ جمال معنی کا آئینہ ہے
مگر انھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

سر جھکا فکر میں بیٹھ اپنی حقیقت کھل جائے
حق نما کون ہے آئینۂ زانو کی طرح

خموشی میں جمال شاہد معنی نظر آیا
عبث الجھے رہے لفظوں میں ہم محو بیاں ہو کر

واہ کیا جلوہ ہے پیش چشم ادراک بشر
شبہ بھی ہاں بھی نہیں بھی وہم بھی اللہ بھی

خدا کا گھر بنانا ہے تو نقشہ لے کسی دل کا
یہ دیواروں کی کیا تجویز ہے زاہد یہ چھت کیسی

کل کی تھی بیخودی میں دم بھر کی سیر دل کو
کس لطف کی ہوا ہے کیا باغ خوش فضا ہے

اپنی ہستی جو حجاب رخ جاناں نہ رہے
واں رہیں ہم کہ جہاں پھر کوئی ارماں نہ رہے

چشم معنی سے جو کی سیر طلسمات جہاں
پتا پتا مجھے اک گلشن شاداب ہوا

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورق دفتریست معرفت کردگار (سعدی)

قطرے قطرے میں ہوئی وسعت دریا پیدا
ذرہ ذرہ صفت مہر جہاں تاب ہوا

جو اپنی زندگانی کو حباب آسا سمجھتے ہیں
نفس کی موج کو موج لب دریا سمجھتے ہیں

یہ مصرعہ چاہیے لکھنا بیاض چشم وحدت میں
خدا کا عشق ہے عشق مجازی بھی حقیقت میں

اپنی زبان میں شمع یہ کہتی ہے رازِ دل
روشن نفس نہیں نہ ہو جس میں گدازِ دل

"جب اُس کے جلے تو کس نہ بسے" بھنے ہوئے چنے کی سوندھی خوشبو سنکر امیر خسرو نے اپنے ساتھی سے کہا تھا "جب اس طرح جلے تو اس کی خوشبو تمام کیسے نہ پھیلے۔

مرے عشق کے سوز میں ہو نہ کمی اجل اے تو ایسی جفا نہ کرے
مری جان کو جسم سے کر دے الگ مرے درد کو دل سے جدا نہ کرے

اگر دیکھو تو ہر گل ایک دفتر ہے معانی کا
اگر سمجھو تو ہر پتی بیان راز کرتی ہے

ترا جلوہ زیب خیال ہے وہی وجد ہے وہی حال ہے
تیری انجمن سے ہوں دور اگر مرا دل تو مجھ سے قریب ہے

اسے انجموں کا خیال کیا جو ہو محو تاروں کی چال کا
وہ نظر زمین پہ کیوں جھکے کہ جو آسماں سے قریب ہے

کیا ہے مذہب ایک ملکی اور سوشل انتظام
یہ نہیں پہچان ہرگز کافر و دیندار کی

صورت والفاظ کا اکثر نہیں ہے اعتبار
ہیں فقط یہ عادتیں رفتار کی گفتار کی

ہیں ہر اک مذہب میں کچھ کافر بھی کچھ دیندار بھی
یاد رکھ تو بات یہ اک محرم اسرار کی

آہ جو دل سے نکالی جائے گی
کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

من نگویم کہ دریں باغ پئے جنگ درآ
آخرت پیش نظر دار دبہر رنگ درآ

پیدا ہوا دماغ میں جوش نشاط کیا
ننھا سا پھول دیکھئے اس کی بساط کیا

صوفی کا مذہب مختصر سب سے کھرا سب سے جدا
ہم تم کے جھگڑے لغو ہیں یا کچھ نہیں یا سب خدا

میں بھی ہوں بدل موئد آزادی کا
لیکن ایک نکتہ سن لے اے پاک ضمیر

آزاد ہو اس لئے کہ اغیار ہوں قید
مطلب یہ نہیں کہ خود ہو غیروں کے اسیر

عقدے بھی کھلے تجھ سے منظر بھی نظر آئے
آنکھیں بھی کہیں کھولیں دل کو بھی کبھی دیکھا

دل ترا ہو کہ نہ ہو ہوش رُبا راز کے ساتھ
صوت سرمد تو ازل سے ہے اس ساز کے ساتھ

اے آفتاب خضر رہ معرفت ہے تو
اتنے ستارے اور تری محفل میں کچھ نہیں

آفتاب کا نور ستاروں پر چھا جاتا ہے اس لئے وہ دن کو بھی موجود رہتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔

مٹادے اپنی ہستی اشتیاق حسن باقی میں
جو اے اکبرؔ تجھے ذوق حیات جاودانی ہے

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

بھائے جو نگاہ کو وہی رنگ اچھا
لائے جو راہ پر وہی ڈھنگ اچھا

قرآن و نماز سے اگر دل نہ ہو گرم
ہنگامہ رقص و مطرب و چنگ اچھا

ضمیر کی عظمت۔

نہ گئی دل سے مرے حسن پرستی نہ گئی
بجھ گیا خون مگر رُوح کی مستی نہ گئی

عکس دنیا کے مرقع کا پڑا آنکھوں میں
دل میں اُتری نہ کوئی شے تری صورت کے سوا

نہ یہ رنگ طبع ہوتا نہ یہ دل میں جوش ہوتا
یہ جنون اگر نہ ہوتا تو کہاں یہ ہوش ہوتا

دل شکستہ میں رہتا ہے بادہ عرفان
سنا ہے میں نے کہ یہ شیشہ چور ہی اچھا

نہ مہر و مہ پر مری نظر ہے نہ لالہ و گل کی کچھ خبر ہے
فروغ دل کے لئے ہے کافی تصور اس روئے آتشیں کا

ترقی مستقل وہ ہے جو روحانی ہوا اے اکبرؔ
اڑا جو ذرہ عنصر وہ پھر زیر زمین آیا

سمجھ میں بصیرت ہے مزا ہے جو مستی ہو
خدا پر بھروسہ کر عبث ہے غم فردا

زشور عالم ایجاد بے خبر ہستم
کہ حیرت است نگاہ من است در روئے ہست

از ہستی ایں عالم چیزے نہ خبر دارم
قلب من ویاد تو چشم من در روئے تو

نعمت سمجھ بلا کو بے لذت تماشا
آخر یہ مخزن اشک اے چشم نم کہاں تک

ہے روز لیوشن بس اک تفسیر رب العالمین
کاش اس نکتہ سے واقف ہوں مسلمان ان دنوں

من علیہا فان ہی پر ختم ہے قول فنسٹ
کیوں عبث برپا ہے اتنا شور طفلان ان دنوں

یارب ایسا کوئی بتخانہ عطا کر جس میں
ایسی گزرے کہ تصور بھی گنہگار نہ ہو

ذوق عرفان جو نہ ہو بادہ پرستی اچھی
ہوش اگر دین سے غافل ہو تو مستی اچھی

دنیا میں یہی مست اثر نغمہ کن ہے
پردیس میں ہے روح مگر دیس کی دھن ہے

عدو فلک بھی رہا گردش زمیں بھی رہی
مگر وہ در بھی رہا اور مری جبیں بھی رہی

نظر میں آیتہ ایاک نستعین بھی رہی
صنم کے پاؤں پہ لیکن مری جبیں بھی رہی

اسی کو ہم تو سمجھتے ہیں مستند اکبر — جسے مشاغل دنیا میں فکر دیں بھی رہی
جہاں درشن تمھارے ہوں وہیں دھونی رماؤں گا — الہ آباد کا قیدی نہ پابند بنارس ہوں
ہے موت میں ضرور کوئی راز دل نشیں — سب کچھ کے بعد کچھ بھی نہیں یہ تو کچھ نہیں
جب تمھارا خیال آتا ہے — ساری دنیا کو بھول جاتے ہیں
مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں — فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں
دل وہ ہے جو فریب نظر کو سمجھ سکے — آنکھیں وہ ہیں جو ژرف نگاہی کے ساتھ ہیں
بندگی میں تو ہے وہ لطف جو شاہی میں نہیں — دل سے کوئی مگر اللہ کا بندہ ابھی تو ہو
غم کے داغوں سے رہی ایذا اگر یہ بھی ہوا — مجھ کو پیہم لذت یاد خدا ملتی رہی
بے ساز بے مغنی یاں وجد آرہا ہے — ہر وقت بج رہا ہے ہر ذرہ گا رہا ہے
مجھے یہ انقلاب دہر کب خطرے کا باعث ہے — میری طبع رواں اک ماہی بحر حوادث ہے

سمندر کو آگ سے اور مچھلی کو پانی سے کیا خطرہ ہو سکتا ہے؟

سینے میں دل آگاہ جو ہو کچھ غم نہ کرو ناشاد سہی
بیدار تو ہے مشغول تو ہے نغمہ نہ سہی فریاد سہی
ہر چند بگولا مضطر ہے اک جوشش تو اس کے اندر ہے
اک وجد تو ہے اک رقص تو ہے بے تاب سہی برباد سہی
وہ خوش کہ کروں گا ذبح اسے یا قید قفس میں رکھوں گا
میں خوش کہ یہ طالب تو ہے مرا صیاد سہی جلاد سہی

(سوال) عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
(جواب) حُسن بے حد ہے خودی محدود ہے

بے تعلق منزل ہستی سے گزرا دل مرا — اس کی نظروں میں سزاوار تمنا کچھ نہ تھا

نظر کو ہو ذوق معرفت کا کرے تو شوق اضطراب پیدا
سوال پیدا جو ہوں گے دل میں انھیں سے ہوں گے جواب پیدا

تجسس کی نظر سے سیر فطرت کی جو اے اکبر — کوئی ذرہ نہ تھا جس میں کہ اک عالم نہیں نکلا

رہ عرفاں میں حس حظ والم کا نامناسب ہے
پسند طبع اکبرؔ ہے نہ خوش رہنا نہ غم کرنا

امتیاز حسرت و رنج والم جاتا رہا
غم ہوا اتنا کہ اب احساس غم جاتا رہا

رنج سے خوگر ہوا تو انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہوگئیں (غالبؔ)

جیسی دل میں ترنگ آجائے
عشق و مستی کا قاعدہ کیا

رکھ اپنی نظر سوئے ہو اللہ
تو تو میں میں سے فائدہ کیا

غم و تکلیف سے خالی فقط اک حس ہو مستی کا
نہ چشم غیر میں ہو اور نہ سودا خود پرستی کا

یہی حالت ہے جس کی آرزو ہے اہل باطن کو
یہی لذت ہے جس کا حس فلک ہے اوج مستی کا

فروغ دل جو ہو منظور بزم ہستی میں
اشارہ شعلے کا دیکھ اور ہوا کی سن دھیمر

ہوا کی دھیمی دھیمی صدا جو سرگوشی کی طرح ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناظر فطرت کے مطالعہ سے قوائے ذہنی کی تہذیب کرنی چاہئے

بے بصر وہ ہیں جو بحثوں میں یہاں خورسند ہیں
جن کی آنکھیں کھل گئیں اُن کی زبانیں بند ہیں

۱۹۰۹ء میں لسان العصر کی آنکھ کا آپریشن ہوا تھا اور ہدایت تھی کہ بات نہ کریں۔

پیدا کئے فلک نے نادیدنی مناظر
نیچی ہیں ان کی نظریں جو صاحب نظر ہیں

داغ دل پر نظر یاس نہ کرائے اکبرؔ
کوئی ذرہ چمن دہر میں بیکار نہیں

تجھ پہ گلزار کھلائے گا یہی داغ کبھی
آج گو طبع مری محرم اسرار نہیں

ہر شگوفہ پر تڑپ جاتی ہے طبع حسن دوست
پتی پتی پر نگاہیں ڈالتا ہوں پیار کی

ناچتا ہوں صحن گلشن میں ہوا کے ساتھ ساتھ
ہم نوائی چاہتا ہوں بلبل گلزار کی

مجھ کو دیوانہ بنا دیتا ہے فطرت کا جمال
عارض گل سے خبر ملتی ہے روئے یار کی

۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو موتیا بند کا آپریشن کلکتہ میں ہوا تھا اس کے بعد یہ خیال پیدا ہوا۔

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس
کار دُنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اُداس

جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر
آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر

فلسفہ نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا ٹکٹ
میری چشم طبع کو عارض ہے غربی کٹر کیٹ

میرے حق میں کوئی فکر سالوشن کیجئے ہو سکے تو نذہبی اک آپریشن کیجیئے
کی توجہ حضرت مرشد نے میرے حال پر اک نظر ڈالی مرے اقوال اور اعمال پر
چشم باطن میں دیا نشتر نگاہ تیز کا کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا
پھر درِ دل پر مرے تقوے کی ٹٹی باندھ دی آنکھ پر شوق لقائے حق کی پٹی باندھ دی

خدا کی پاکی پکارتا ہوں ہوا کرے ناخوشی بتوں کو
میری غرض کچھ نہیں کسی سے تو پھر مرا کوئی کیا کرے گا

مرے نزدیک تو بے اصل یہ اشکال ظاہر ہیں جو اچھے ہیں وہ مومن ہیں برے جو ہیں وہ کافر ہیں
وہی ہیں پاک طینت لو لگی ہے جن کی خالق سے نہیں ہے شرک کی جن میں نجاست بس وہ طاہر ہیں

۱ مذاہب رسوم ۲ عملاً اچھے ہیں ۳ طبیعت۔ فطرت ۴ انما المشرکون نجس۔

پاس وانفاس ہو اگر ملحوظ ہر نفس راہ کامرانی ہے
سانس لینے کا ورنہ کیا حاصل صرف اک شغل زندگانی ہے

AS THOUGH TO HREATHE WERE LIFE.

آزادی کا شور مبارک یہ تقلیدی زور مبارک
مرا تو ہے اور ہی منظر میں تو یہ کہتا ہوں اکبر

عارف کو بیہوشی زیبا
عاقل کو خاموشی زیبا

عالم وحدت میں کثرت رنگ دکھلانے لگی ہوش کے ٹکڑوں سے میں میں کی صدا آنے لگی

جہان فانی کے اتنی وقعت تمھارے ہی فلسفہ میں ہوگی
مرا عقیدہ تو یہ نہیں ہے کہ جو خدائی میں ہے یہیں ہے

ہمارے ذہن کو اس مصرعہ اکبر پہ مستی ہے خوش اخلاقی عبادت ہے خوشامد بت پرستی ہے
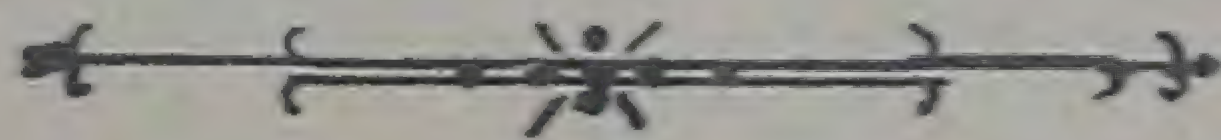
غیر زبان

نہ بھول اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً اے اکبؔر
خدا سکون بھی دے گا اس اضطراب کے بعد

قلقل شیشہ کو سنئے تو ذرا حضرت شیخ
دیکھئے تو کہیں اس قُل میں ہُوَ اللہ نہ ہو

آنکھیں دکھا رہی ہیں کہ ہے دل میں بٹیریؔ
عارض اگرچہ گل کی طرح ہیں کھلے ہوئے

بجلی کا آلہ

کرم حق پہ رکھ نظر اپنی
جو عقیدہ ترا نہ ہو ڈھیلا

آسرا سب کا چھوڑ دے اکبؔر
و تبتل الیہ تبتیلا

خدا سے بیگانہ تھی طبیعت دلی ارادوں پہ تھا بھروسہ
کچھ اپنا سوچا نہ کام آیا وہی ہوا جو خدا نے چاہا
عجب ہے تسلیم و صبر کی خو اگر نہ پیدا ہوا اب بھی دل میں
عزیمتیں فسخ ہو گئیں جب عرفت ربی عرفت ربی

حسب فرمائش خان بہادر شیخ احمد حسین صاحب تعلقدار پریاوان ضلع پرتاب گڈھ۔

عرفت ربی بفسخ العزائم۔ (حضرت علیؓ)

فلسفہ حریف کا دیں کا ہے عدو بنا
اس طرف ہے قید سخت اور تیرا ہے بچپنا

صبح و شام صدق سے کر دعا کہ ربّنا
لاتزغ قلوبنا بعد اذ ہدیتنا

معانی قرآن کا لو کچھ مزا
پڑھو لَمْ یَضُرُّوکُمْ اِلَّا اذیٰ

خواہش ایواں نہ شد واعظ اسلام را
حاجت مشاطہ نیست روے دلارام را (سعدی)

لطف سخن تو ہے یہی ٹرس[1] بھی ہو وِٹ[2] بھی ہو
ذہن کا وصف ہے یہی اور یہ جنٹلیٹی[3] بھی ہو

[1] لطیف۔ [2] ظرف۔ [3] جدّت۔ ورنہ بیکار ہے۔

کار دنیا سے فراغت ہی عزیزوں کو نہیں
پھر کہیں ان سے اِلیٰ ربک فارغب کب تک

دنیا پرستوں کی سچی تصویر ہے۔

اس مس کی زباں رات جولی میں نے دہن میں — بولی کہ تری راہ ترقی میں یہ ہیج[1] ہے
میں نے کہا اسکالر[2] مشرق ہوں میں اے مس — چپ رہ کہ یہی مری سکنڈ لنگوایج[3] ہے

[1] HADGE = جھاڑی [2] SCHOLAR = دیوانہ علم۔ شعر میں کوئی خوبی نہیں صرف یہ ہے کہ ایسے ثقیل الفاظ کو اس سلاست سے نظم کر دیا ہے کہ اجنبیت جاتی رہی ہے۔
[3] SECOND LANGUAGE = دیگر زبان۔ جیسے اُردو دانوں کے لئے مدرسوں میں ہندی اور انگریزوں کے لئے اُردو ہے۔

بگڑ جائے گی میری اس بُت کی اک دن — اسے اَصلہٖ یرجع کُلّ شئےٍ
"کل شئےٍ یرجع الی اصلہٖ" یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف لوٹتی ہے۔

حُسن دیکھو بتان کاشی کا — چہرہ ہے چاند پورنماشی کا

ہو رہا ہے نفاذ حکم فنا — نہ مکیں اس سے بچتے ہیں نہ مکان
تو ہیں خود آکے اب تو میدان میں — کہتی ہیں کل من علیہا فان

ایک قرآنی آیۃ ہے "کلّ من علیہا فان ویبقیٰ وجہ ربک ذوا الجلال والاکرام"
کسی شاعر نے کہا ہے :-

صبح کو طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان (مرزا شوق)

واعظ کا جو ارشاد ہے وہ ریزنیبل[1] ہے — رندوں کی یہ مستی بھی مگر سیزنیبل[2] ہے

[1] معقول = REASONABLE ۔ [2] موافق رسم = SEASONABLE

درِ دیر پر میں نے کی ڈنڈوت[1] — بھری تھی میرے دل میں ٹھاکر کی پیت[2]
کیا شور چیلوں نے یہ ہر طرف — مہاراج کی جے گرو جی کی جیت

[1] سلام نیاز [2] محبت۔

تعلیوں کو طبیعت رجکٹ[1] کرتی ہے — جو دل شکستہ ہیں اُن کو سلکٹ[2] کرتی ہے
ملا ہوں خاک میں خود اس سبب سے میری نظر — گر کے قصر بگولے ارکٹ[3] کرتی ہے

[1] رد کرنا = REJECT ۔ [2] چن لینا = SELECT
[3] تعمیر کرنا = ERECT

یاد آرہی ہے مجھ کو موسیٰ کی گفتگو اب ہو محو استعینوا باللہ واصبروا اب

طاعت باری سے دل کو شاد رکھ ان وعد اللہ حق یاد رکھ

تھیٹر والیاں دنیا میں ہر سو عیش کرتی ہیں
جہاں رقصاں ہوئیں دل لیتی ہیں بل کیش کرتی ہیں

اپنی ہنڈی بھنا لیتی ہیں۔

مٹنے پر ہے نقش باطل لاتستعجل لاتستعجل

جلدی مت کر جلدی مت کر۔
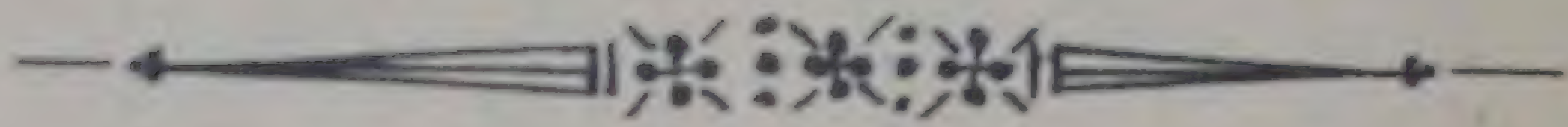
غلامی

عزت ملی ہے شرکت کونسل کی شیخ کو
غازہ لگا گیا ہے رخ فاقہ مست پر

اب اور چاہیئے نیٹو کے واسطے کیا بات
یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام سے ہم

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں
یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

تخت کے قابض وہی دیہیم ان کے ہاتھ میں
ملک ان کا رزق کی تقسیم ان کے ہاتھ میں

برق کی صورت پہنچتا ہے طبائع پر اثر
آگیا تار امید و بیم ان کے ہاتھ میں

مغربی رنگ روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

ہے غلامی ہی جو قسمت میں تو ہو لطف کے ساتھ
کہہ دو ہندی سے کہ آبادِ پرستان میں ہو

پہننے کو تو کپڑے ہی نہ تھے کیا بزم میں جاتے
خوشی گھر بیٹھے کر لی ہم نے جشن تاجپوشی کی

پانوں کانپا ہی کئے خوف سے ان کے در پر
چست پتلون پہننے پہ بھی پنڈلی نہ تنی

وہ کہتے ہیں یہ ٹھیک ہے ہم کہتے ہیں ہاں
بالفعل تو ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہتے

حکم خاموشی ہے اور میری زبان
آپ کی باتیں ہیں میرا کان ہے

موجیں ہیں طبیعت میں مگر اٹھ نہیں سکتیں
دریا ہے مرے دل میں مگر بہ نہیں سکتے

پتوار شکستہ میں نہیں طاقت پرِ جسم
ہے ناؤ میں سوراخ مگر کہہ نہیں سکتے

گرمی محبت میں ہیں وہ آہ کے مانع
پنکھا نفس سرد کا جھلنے نہیں دیتے

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ہوتی ہے نصیب تلخ کامی تم کو
محسوس نہیں ہے اپنی خامی تم کو

اغیار نہیں بنا سکے تم کو غلام
ہے اپنے ہی نفس کی غلامی تم کو

تدبیر کریں تو اس میں ناکامی ہو
تقدیر کا نام لیں تو بدنامی ہو

القصہ عجیب ضیق میں ہیں ہندی
یورپ کا خدا کہاں ہے جو حامی ہو

قفس ہے کم ہمتی کا سمیں پڑے ہیں کچھ دانہ ہائے شیریں
اسی پہ مائل ہے طبع شاہیں نہ بال ہیں اب نہ پر رہے ہیں

دفتر تدبیر تو کھولا گیا ہے ہند میں — فیصلہ قسمت کا اے اکبر مگر لندن میں ہے

کوئی کہتا نہیں سیاح ہوں فطرت کا ماہر ہوں — یہیں تک فخر کی حد ہے میں ڈپٹی ہوں میں ناظر ہوں

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے — جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں

بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری — افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

چہرۂ یورپ کا میں پروانہ ہوں — اس کی ہر اک بات کا دیوانہ ہوں

شب میں پیدائش ہوئی ہے پیش شمع — جلوۂ خورشید سے بیگانہ ہوں

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند

ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

کانٹے بچھ جاتے ہیں ان لوگوں کی راہ رزق میں
خوف آتا ہے چھری چلتی ہے اُن کی میز پر

بلا طاقت نہ افلاک انساں کی نہیں چلتی — وہاں تو ریل چلتی ہے یہاں روٹی نہیں چلتی

ٹھیک سے نہیں ملتی۔

ہے عجیب انقلاب دنیا میں — کیا کہوں بات بھائی صاحب کی

اب وہ تسبیح پر بجائے درود — پڑھ رہی ہیں دُہائی صاحب کی

نہ کچھ انتظار گزٹ کیجیے — جو افسر کہیں بس وہ جھٹ کیجیے

کہاں کا حلال اور کیسا حرام — جو صاحب کھلائیں وہ چٹ کیجیے

متحد احساس سے ہم کو معرا کر دیا — ٹکڑوں کے ریزے گئے ریزوں کو ذرہ کر دیا

خوشی سے شیخ کالج سوئے مسجد اب نہیں چلتا — جہاں روٹی نہیں چلتی وہاں مذہب نہیں چلتا

گو بہت اونچی ہے پرواز حریف — شیخ برگد کم نہیں ہیں جمپ[1] میں

ان کا طوطی بولتا ہے عرش پر — ان کی مرغی بولتی ہے کمپ[2] میں

[1] کودنا = JUMP . [2] فوجی ڈیرا = CAMP

میری نصیحتوں کو وہ شوخ سُن کے بولا — نیٹو کی کیا سند ہے صاحب کہیں تو مانوں

دیسی آدمی = NATIVE

دریا میں تو صاحب سے اگن بوٹ میں ہارے
میدان الکشن[1] میں گئے ووٹ[2] میں ہارے

[1] انتخاب = ELECTION [2] رائے = VOTE

اس کی حرکت ہے کلید مغربی پر منحصر
دل ہے یہ سینے میں یا پاکٹ[1] کے اندر واچ[2] ہے

[1] جیب = POCKET [2] گھڑی = WATCH

کہا صیاد نے بلبل سے کیا تو نے نہیں دیکھا
کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے

کہا اس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر میری
نشاط طبع کی مہلک مگر بیکاری پر ہے

جب آنکھ کو کھلنے سے ہو جھپک جب منھ میں زباں جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر افسوس ہے ایسی حالت پر
یا جھوٹ کہے یا کچھ نہ کہے یا کفر بکے یا کچھ نہ کرے

قاتل کو بھروسہ قوت کا اور ہم کو خدا کی رحمت کا
ہونا تھا جو کچھ ہو ہی لیا وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ ڈرے

راہ تو مجھ کو بتا دی خضر نے
اونٹ کا لیکن کرایہ کون دے

ان کی سب سنتے ہیں اپنی نہیں کہہ سکتے کچھ
کیا قیامت ہے زباں کٹ گئی اور کان رہے

بس ہوائے باغ کا ہے اب پروں کو ناگوار
اتنا خوگر ہو گیا ہوں پنجرۂ صیاد کا

ہے جو زباں پہ دل کو نہیں اس سے فائدہ
جو دل میں ہے وہ لا نہیں سکتے زبان پر

مفتوح ہو کے بھول گئے شیخ اپنی بحث
منطق شہید ہو گئی میدان جنگ میں

خلق نکو کو سب نے خوشامد سمجھ لیا
کیا کیا مصیبتیں ہیں غریب آدمی کے ساتھ

زوال قوم کی بس ابتدا وہی تھی کہ جب
تجارت آپ نے کی ترک نوکری کر لی

جو کہا اس نے کیا منظور کیا حرف نفی
ہم سراپا اب تو اس محفل میں "جی ہاں" ہو گئے

مصارف مے لندن نہ ہو سکے برداشت
غرضکہ یاروں میں افیون ہی گھلی آخر

بنے بندر سے ہم انسان ترقی اس کو کہتے ہیں — ترقی پر بھی نیٹو بد نصیبی اس کو کہتے ہیں
نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور — کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
تہ دل سے ہم کوستے ہیں مگر — کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں
مشرق غربی جھپیٹ میں ہے — دل سینے میں تھا سو پیٹ میں ہے
کیسہ خالی ہے بکس بھی ہے خالی — جو کچھ ہے یہاں پلیٹ میں ہے

قلی اک اس طبیعت کا ملا جو کل یہ کہتا تھا
میرے دل میں خیالات بلند آنے نہیں پاتے
سڑک پر کام میں تکلیف ہے بنگلے پہ بے لطفی
یہاں سایہ نہیں ہے اور وہاں گانے نہیں پاتے

اقتضائے فطرت ہے کہ طبیعت انسانی ماحول سے اثر پذیر ہوتی ہے (فلاطون) غلامی ہمیشہ خیالات عالیہ کی حاجب ہوا کرتی ہے۔

مرنے سے تم کو کم فرصت یہاں فاقے سے کم خالی — چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی
ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے با صد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ — وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سنکر بہت طبع غمگین ہوئی — مگر اس تصوّر سے تسکین ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے — تو بیشک جہنّم بھی ہے کوئی شے

پوچھتے کیا ہو کہ تو ہیرو ہے یا ہر بنس ہے
بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لیسنس ہے

نیٹو کی گذر ہے دال ہی پر — دیسی کالا آدمی۔
کالا اس طرح دال میں ہے — معاملہ گڑبڑ ہے

کیوں نہ اپنے دل کو ہو ان سے ملاپ — لارڈ صاحب ہیں ہمارے مائی باپ
ان کے حق میں بھی دعا کرتے ہیں ہم — مندروں میں جب کبھی کرتے ہیں جاپ
ان کی بڑھتی سب مناتے ہیں یہاں — خواہ وہ ہوں خواہ ہم ہوں خواہ آپ

ہر طرف سامان ہیں آرام کے　　کھل گئی ہے ہر طرف ہر شے کی شاپ[لہ]

ہو گئے روشن حدود آسماں　　علم چمکا ہو گئی تاروں کی ناپ

ساری دھرتی دب گئی سائنس سے　　لگ گئے پائپ گیا دنیا سے پاپ

حضرت واعظ ہیں راضی رقص پر　　دیر کیا ہے اب پڑے طبلے پہ تھاپ

ایک صاحب نے فرمائش کی تھی مگر بعد ملاحظہ خاموش رہے۔

لہ دکان =

کہتے تھے سابق میں سب اوپر خدا نیچے حضور　　اس مقولے کو مگر بدلیں گے اب اہل شعور

زیر پا ہے ریلوے اور سر پہ ہے انجن کی بھاپ

اب یہ کہنا چاہیئے نیچے بھی آپ اوپر بھی آپ
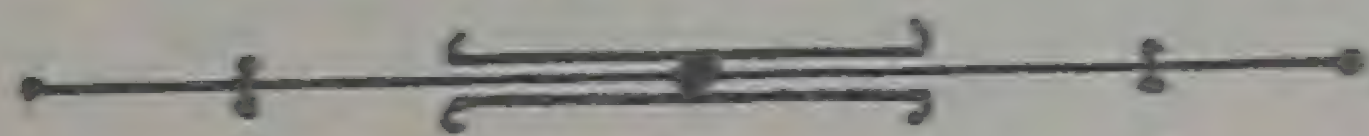
فلسفہ

یقین قوّت تدبیر بُت پرستی ہے — غرور رفعت دنیا نظر کی پستی ہے

آپ اندھیرے میں ہیں تجلی سے مدد لیتے ہیں — چاند سورج ہیں ہمیں راہ دکھانے والے

حدادراک میں داخل نہ ہوا سرِّ ازل — کچھ سمجھ ہی نہ سکے ہوش میں آنے والے

کون ہمدرد کسی کا ہے جہاں میں اکبر — ایک اُبھرتا ہے یہاں ایک کے مٹ جانے سے

ع۔ ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہوگئیں (غالب)

فنا کا خوف کچھ اہل حیات ہی کو نہیں — ہوا سے شمع کا شعلہ بھی کانپ جاتا ہے

روح کو قالب میں آنے سے بڑا انکار تھا — یہ نہ سمجھی تھی کہ آخر دوستی ہو جائے گی

کسی نے بزم میں سمجھا نہ باعث گریہ — تمام رات رہی شمع اشکبار افسوس

بارہا جوش جنوں میں مجھے آیا ہے خیال — کہ تماشا ہے یہ ہنگامۂ نیکی و بدی

نظر عشق میں ہے زندگی و موت اکبر — اضطراب نفس چند و سکون ابدی

برق و بخارات کا زور اے حکیم — کب ہے پئے رُوح رہِ مستقیم

تار پہ جاتے نہیں اہل نظر — ریل سے کھنچتا نہیں قلب سلیم

اک فلسفہ ہے تیغ کا اور اک سکوت کا — باقی جو ہے وہ تار ہے بس عنکبوت کا

اسلام کو جو کہتے ہیں پھیلا بزور تیغ — یہ بھی کہیں گے پھیلی خدائی بزور موت

محو حیرت ہی رہی بحر میں ہر چشم حباب — کچھ نہ تھی ہستی امواج گذرنے کے سوا

برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا؟ یہ کہیئے — رُوحِ رواں نے اپنے دامن کو جھاڑ ڈالا

موت آئی اُٹھ کھڑے ہوئے دامن کو جھاڑ کے (انیس)

معنی کی شعاعوں سے جو لکھ جاتا ہے دل پر — سچ ہے کہ وہ لفظوں میں بیاں ہو نہیں سکتا

عالم ہستی کو تھا مد نظر کتمان راز — ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

ناقص مقدموں سے نکلیں گے جو نتیجے — ان پر وثوق صحت اے مہرباں کہاں تک

بڑھ رہا ہے کفر زلف علت و معلول سے — حسن فطرت ہے حجاب روئے یزداں ان دنوں

حادثے اپنے طریقے سے گذرتے ہی رہے
کیوں ہوا ایسا یہ ہم تحقیق کرنے ہی رہے

یہ بھی فانی وہ فانی دونوں ہیں بے اعتبار
انقباض موت ہو یا انبساط زندگی

کوئی عظیم نتیجہ ضرور ہے ملحوظ
نظام جسم بشر میں بڑا تکلف ہے

کیا ثبات عمر بس اک جنبش فطرت کی دیر
زندگی کیا ہے فقط اک عکس آئینہ میں ہے

صبح کو کہتا ہوں دیکھو کس طرح کٹتا ہے دن
شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ
عرصہ ہستی بجز امروز فردا کچھ نہ تھا

بڑی عمریں ہیں جن کی ان سے سنئے حال دنیا کا
نگاہوں میں زمانے ہیں زبانوں پر فسانے ہیں

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ طلسم ہستی
اس کی قدرت کے کرشمے بھی عجب ہوتے ہیں

جان جب خاک میں پڑتی ہے تو ہوتی ہے خوشی
خاک جب خاک میں ملتی ہے تو سب روتے ہیں

اگر موج نفس میں آئیں موجیں جوش معنی کی
حباب زندگی ہی سے ہو بحر بیکراں پیدا

تھا کیا ہی سماں تھی کیا ہی وہ شب سینے ہی میں تھے اسباب طرب
ہر حرکت دل اک نغمہ تھی ہر تار نفس سازندہ تھا

اس سے بڑھ کر کون ہے راہ فنا میں بیقرار
حصر کی حد سے ہے باہر تیزی رفتار وقت

بتلائے بحث کو راز خدا کی کیا خبر
معنی بے لفظ و لفظ بے صدا کی کیا خبر

پایا اک ہنگامہ ہم بھی ہو گئے اسمیں شریک
ابتدا کا علم کیسا انتہا کی کیا خبر

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اس شعر پر سر محمد اقبال نے انگریزی میں ایک آرٹیکل لکھا ہے اور لسان العصر کو اس طرز ادا کے اعتبار سے پروفیسر ہیگل (ایسے زبردست فلسفی) پر ترجیح دی ہے

قابل دریافت راز ہستی پروانہ ہے
کیوں اسے یہ حکم فطرت ہے جلو تڑپو مرو

معنی کا آئینہ ہے اکبر کا یہ لطیفہ
ہنسنا بھی اک مرض ہے رونا بھی اک دوا ہے

میں طاقت ذہن غیر محدود جانتا تھا خبر نہیں تھی
کہ ہوش مجھ کو ملا ہے تل کے نظر بھی مجھ کو ملی ہے نپ کے

فلاسفی کے مکالموں نے کسی نے یہ خوب ہی کہا ہے
جو تندرستی ہو تیری اچھی تو سانس ہی میں بڑا مزا ہے

مقابل ترے ہیچ سب ہیچ ہے — مگر تو ہی خود ہیچ در ہیچ ہے
جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ — کیوں میں پوچھوں وہ دلارام ملیگا کہ نہیں
اسی مٹی کو دیکھ کر اکبر اگر ذوق تعقل ہے — کہیں ٹہنی کہیں پتی کہیں غنچہ کہیں گل ہے
آرام کی تلاش نے رکھا ہے بیقرار — ہر خواہش سکون سبب اضطراب ہے
ایک صوت سرمدی ہے جس کا اتنا جوش ہے — ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے
دم بھر میں جسم و روح کا قصہ تمام ہے — مٹی میں مل گیا یہ، وہ اپنے وطن گئی
ہر قدم پر ہے فزوں لذت سرگرمی سعی — شوق نے خوب مزے دوری منزل کے لئے
مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی — مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا روز زیست — سلایا شب گور نے سو رہے
نقش معنیٰ منظر بے معنی و مفہوم ہے — مصلحت فطرت کی ہے یا دین کا مقسوم ہے
ہم اظہار خودی سے کوئی دم ساکت نہیں ہوتے — مگر جب غور کرتے ہیں تو خود ثابت نہیں ہوتے
یہ دونوں مسئلے ہیں سخت مشکل — نہ پوچھو تم کہ میں کیا اور خدا کیا
عبث ہے نظم بلیغ فطرت جو رخ نہیں حسن مدعا کا — حدیث عقبیٰ اگر غلط ہے تو کیا نتیجہ ہے ارتقا کا
کسی کے مرنے سے یہ نہ سمجھو کہ جان واپس نہیں ملیگی — بعید شان کریم سے ہے کسی کو کچھ دے کے چھین لینا

خلقت کی یہ موجیں ہیں ازلی ممکن نہیں ضبط اس منظر کا
اے ہوش بشر کب تک یہ جنوں ہر ذرے کے "کب" اور "کیونکر" کا
اعراض جو ہیں یہ نفسانی کھو دیتے ہیں نور ایمانی
موقعہ ہی نہیں ملتا دل کو جویاں ہو وہ اپنے جوہر کا

ہے اختیار خود کو مختار تم سمجھ لو — لیکن ہوئے یقیناً بے اختیار پیدا

ہر بات پہ جس نے شک ہی کیا وہ صرف پریشان باطن تھا
پرکار سے نقش اس وقت بنا اک جزو جب اس کا ساکن تھا

فطرتِ انسانی

یہ ملنے ہی سے اکثر رنج بھی ہو جاتے ہیں پیدا
جو سچ پوچھو تو ملنے سے نہ ملنے کا گلا اچھا

جانتی تھی قوت اپنی مدت عمر عروج
بحر میں لیکن حبابوں کو اُبھرنا ہی پڑا

اودھر وہی طبع کی نزاکت ادھر زمانہ کی آنکھ بدلی
بڑی مصیبت شریف کو ہے امیر ہو کر غریب ہونا

وہ شناور ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا
وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا

بچ رہے طاعون سے تو اہل غفلت بول اُٹھے
اب تو مہلت ہے پھر اگلے سال دیکھا جائیگا

ہوتا ہے انبساط غذائے لطیف سے
غنچے کو دیکھئے کہ ہوا کھا کے کھل گیا

دو مرادیں جو ملیں چار تمنائیں کیں
ہم نے خود قلب کو آرام سے رہنے نہ دیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمر عزیز
سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا

بلندی مراتب سے تلون ہو گیا پیدا
بدلتے ہیں ہزاروں رنگ اب وہ آسماں ہو کر

عجب کیا ہے جو دونوں دن ہیں بیہوشی کے دنیا میں
چلے جب ہو کے رخصت آئے جس دن میہماں ہو کر

الگ رکھتی ہے فطرت ہوش کو ایسے مواقع پر
کہ تا افشا نہ کر دے راز ہستی رازداں ہو کر

دل مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں
اُمیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں
سکون قلب کی دولت کہاں دنیائے فانی میں
بس اک غفلت سی ہو جاتی ہے اور وہ بھی جوانی میں

ضروری کام نیچر کا جو ہے کرنا ہی پڑتا ہے
نہیں جی چاہتا مطلق مگر مرنا ہی پڑتا ہے

طلب ہو صبر کی اور دل میں آرزو آئے
غضب ہے دوست کی خواہش ہو اور عدو آئے

خدا پناہ میں رکھے کشاکش غم سے
اسی سے تار نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے

ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوق کامل
ہر بات میں اثر ہے ہر رنگ میں مزا ہے
ہر چیز میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

مقام شکر ہے غافل مصیبت دنیا
اسی بہانہ سے اللہ یاد آتا ہے

گو بہت کچھ رنج یاران وطن سے تھا ہمیں | آنکھ میں آنسو مگر وقت سفر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی | سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

رہتی ہے کار دو عالم میں ہمیں وحشت سی | نہیں معلوم یہاں آئے ہیں کس کام کو ہم
رہ چکے ہیں جو کبھی وصل بہاری میں اسیر | کانپ کانپ اُٹھتے ہیں جب دیکھتے ہیں دام کو ہم

ہوئی جو عمر ان کی مجھ سے سنئے کہ پندرہ میں ہے ایک باقی
عجب ہے نیچر کے اقتضا سے جو رکھے نیت کو نیک باقی

اُٹھانا پڑتا تھا دن رات بار الفت خوباں | جوانی کیا تھی نیچر نے مجھے بیگار پکڑا تھا

اکبر سے نہ کہئے رائے سرجن | اُمید مریض توڑیے کیوں

نادیدنی کی دید سے ہوتا ہے خون دل | بے دست و پا کو دیدۂ بینا نہ چاہیے

بے دشمن دیں راحت دنیا ہے تو کیا ہے | قاتل ہو کوئی آنکھ تو جینے کا مزا ہے

شریک بیکسی بودن ترا با ہمدماں اکبر | ازاں بہتر کہ در بزم حریفاں شادماں باشی

خیال دوڑا نگاہ اٹھی قلم نے لکھا زبان بولی
مگر وہی دل کی اُلجھنیں ہیں کسی نے اس کی گرہ نہ کھولی

خیال شاعر کا ہے نرالا یہ کہہ گیا ایک کہنے والا
شباب کے ساتھ یوں ہے زندگی کہ جیسے پھاگن کے ساتھ ہولی

زخمی نہ ہوا تھا دل ایسا سینے میں کھٹک دن رات نہ تھی
پہلے بھی ہوئے تھے کچھ صدمے روئے تھے مگر یہ بات نہ تھی

جب یاس ہوئی تو آہوں نے سینے سے نکلنا چھوڑ دیا
اب خشک مزاج آنکھیں بھی ہوئیں دل نے بھی مچلنا چھوڑ دیا

زندگانی کا مزا دل کا سہارا نہ رہا | ہم کسی کے نہ رہے کوئی ہمارا نہ رہا
بولنے کی ہے نہ قوت نہ اشارے کی سکت | اتنا بس بھی مرا فطرت کو گوارا نہ رہا
جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا | شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

ہمیشہ زخم دل پر زہر ہی چھڑکا خیالوں نے | کبھی ان ہمدموں کی جیب سے مرہم نہیں نکلا

ایں فتنہ کہ برپا شد و ایں شور کہ برخاست
الزام بگردوں منہ از ماست کہ برماست

شگفتہ پایا طبیعت کو بعد کار ثواب
دلیر دل کو نہ پایا کبھی گناہ کے بعد

جیسی حالت پیش آتی ہے زمانہ میں جسے
ذہن انسانی میں ویسا ہی اُتر آتا ہے عکس

یہ مواقع ہیں کہ ہو جاتے ہیں وجہ اختلاف
آئینہ کا رُخ جہاں بدلا بدل جاتا ہے عکس

ہوائے نفس کے تابع ہیں جن کے جسم اکبرؔ
انھیں کی روح رہتی ہے بدن میں مضمحل ہو کر

دل کو اک غم نے گھیر رکھا ہے
کیا کسی سمت التفات کروں

ہمنشیں مجھ سے کچھ نہ پوچھ اس وقت
جی نہیں چاہتا کہ بات کروں

جانتے ہیں کہ یہ غفلت کے ہیں کام
پھر بھی کرتے ہی چلے جاتے ہیں

دل بیتاب نے کیا کیا دکھائے ہیں مجھے عالم
یہ پرزہ بھی قیامت ہے خدا کے کارخانے میں

ہاں ہاں نہایت غضب کا پرزہ ہے۔

کون پا سکتا ہے مکروہات دنیا سے نجات
زندگی جب تک ہے جھگڑے زندگی کے ساتھ ہیں

غم میں ہو جاتا ہے کچھ امید فردا سے سکون
وائے بر حالش جسے امید فردا بھی نہ ہو

معترض فریاد سے ہوں زیر لب کرتا ہوں آہ
آپ کی مرضی یہ ہے شاید کہ اتنا بھی نہ ہو

رہ گئے وہ پوچھ ہی کر جس کو اس کو ہے گلا
اُس کے دل سے پوچھئے جس کو کہ پوچھا بھی نہ ہو

انسان نے انسان سے کی جنگ ہمیشہ
دنیا کے نظر آئے یہی رنگ ہمیشہ

گرمی موسم شباب اُف اُف
یہ سمجھے کہ جیٹھ تپتا ہے

مایوسی نے محفوظ کیا امیدوں کی بے تابی سے
اب اشک بھی تھمتے جاتے ہیں اور دل بھی ٹھہرتا جاتا ہے

جگر کو زخم سے زخموں کو آہوں سے بچاتا ہوں
مگر ہوتے ہی ہیں زخم اور انھیں چھلنا ہی پڑتا ہے

فنا کے رنگ سے دل خون ہوتا ہے مگر اکبرؔ
زبان کو واہ کرنے کے لئے ہلنا ہی پڑتا ہے

مایوس ہوں باغ عالم میں اُمید سے یاری چھوٹ گئی
جس پیڑ کو سینچا سوکھ گیا جس شاخ کو باندھا ٹوٹ گئی

دل کی بے تابی ہے ثابت آنکھ کے اظہار سے
بجلیاں پیدا ہوئی ہیں آنسوؤں کے تار سے

جب طبیعت خوش نہیں تو کیا کرے اچھا مکان
دل بہل سکتا نہیں اپنا در و دیوار سے

پسند چشم کا ہرگز کچھ اعتبار نہیں
بس اک کرشمہ وہم و خیال ہوتا ہے

یہ سانس نہیں ہے سینے میں اک پھانس بشر کی جان میں ہے
درد اس کا مگر محسوس نہیں غفلت کا خمیر انسان میں ہے

نہ تعلق ہے کسی سے نہ شناسائی ہے
انجمن میں ہوں مگر عالم تنہائی ہے

انسان کی غفلت کم نہ ہوئی قانون فنا کی عبرت سے
ہر گام پہ کٹتے پاؤں بھی ہیں اور سر بھی اُٹھائے جاتا ہے

ابتدائے عالم ہستی میں میں بیہوش تھا
ہوش جب آیا تو دل میں غفلتوں کا جوش تھا

پھر مصائب اور فنا کے تجربے پیہم ہوئے
بعد ازاں جب تک جیا مغموم اور خاموش تھا

فارسی

وقت بہار گل دلم از ہوش دُور بود
یک جلوہ کرد و صورت پروانہ سوختم
ناقصاں را سود بخشد پرتو اہل کمال
ہر سحر لرزاں و ہر شامے بخون می بینمش
ہست رفتار حسیناں باعث صد انقلاب
دلم فسردہ شد و عشق و آرزو باقیست
فدائے صورت زیبا رخے کہ فانی نیست
چیزے کہ بہ عشق او می رقصد و می سوزد
در شمع چو می بیند نورے ز رخ خوبت
ہر شمع بیاد او می گرید و می کاھد

ایک پروانہ لمپ کے گرد ناچ رہا تھا۔
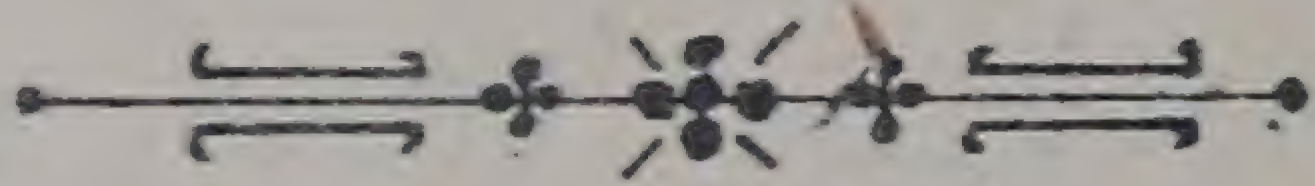
موج نسیم دشمن شمع شعور بود
آرے ہمیں علاج دل ناصبور بود
ماہ نور امی کند در نور کامل آفتاب
شد نگر از غمزہ حسن تو بسمل آفتاب
می کند تغیر فصل از طے منزل آفتاب
نماند در گل پژمردہ رنگ و بو باقیست
نثار حسن حسینے کہ حسن او باقیست
دل نیست کہ در پہلو می رقصد و می سوزد
پروانہ بگردِ اُو می رقصد و می سوزد
ہر شعلہ بشوق او می رقصد و می سوزد

نالہ من چو توانی بہ یاراں برساں
آخر فصل بہار است و دم رخصت گل
حسرتے چند بہ دل دارم و ایں نکتہ بس است
مگو از لعل یمانی و ببیں لخت دلم
بیکسی سنگ تربت او بود بدشت
عزت اکبر نہ مثل برہمن در دیر بود
ایں سخن مقبول اہل دل بود ہر آئینہ
ہماں بہ کز حدیث دی و فردا خبر باشی
بکش داماں شب برخیز و شمع دل فروزاں کن
در ہجر زندگی دلم آہے کشید و رفت

اے صبا قصہ دوری وطن ہیچ مپرس
دیگر از حسرت مرغان چمن ہیچ مپرس
وز کہ آموختہ ام طرز سخن ہیچ مپرس
اشک من بنگر و از در عدن ہیچ مپرس
قصہ اکبر مہجور وطن ہیچ مپرس
قشقہ بودش بر جبیں لیکن ز دست غیر بود
بے خودی در سجدہ جا خواہد خودی در آئینہ
بہ ذوق لم یزل امروز سر تا پا نظر باشی
چرا افتادہ در بند گریبان سحر باشی
برقے بگو ئمش کہ برابرے طپید و رفت

داغ دل است رنگ[1] فنا اندریں چمن　　سبزہ دمید و مرد و گل تر رسید[2] و رفت

[1] ہمرنگ فنا [2] شگفت۔

اے آنکہ فسانہ گوئی از دیر و حرم　　ایں دفتر تست باعث درد سرم
بگزار مرا بحالم[1] از راہ کرم　　چشمے داریم و عالمے در نظرم
دیگر چہ معلم و کتابم باید

جامے ز مئے طہور دارم در دست　　جانم بسرود عاشقی بیخود و مست
نے طالب نغمہ ام نہ من بادہ پرست　　تار نفس است و یادے از عہد الست
دیگر چہ مغنی و شرابم باید

[1] بحال خود

قربان کسے بودہ دُرہا کہ چنیں سفتم　　گفتند بگو گفتم گفتند مگو خفتم

فیشن

شیخ کو وجد میں لائی ہیں پیانو کی گتیں ۔ پیچ دستار فضیلت کے کھلے جاتے ہیں

نئی تہذیب سے ساقی نے ایسی گرمجوشی کی ۔ کہ آخر مسلموں میں روح پھونکی بادہ نوشی کی

شیخ جی اپنی سی بکتے ہی رہے ۔ وہ تھیٹر میں تھرکتے ہی رہے

انگلش ڈریس انور کا جو کل بزم میں دیکھا ۔ اکبر نے کہا یہ تو خرابی کے ہیں آثار

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر ۔ تبدیلیٔ صورت کے رہے گر یہی اطوار

حالی کی عبارت سے حجاب آنے لگے گا ۔ شرماؤ گے کرتے ہوئے اسلام کا اظہار

آخر کو رہو گے نہ اِدھر کے نہ اُدھر کے ۔ انگریز بھی کھنچتے رہیں گے قوم بھی بیزار

انور نے کہا صلِّ علیٰ واہ بہت خوب ۔ شک اس میں نہیں مدح کے قابل ہے یہ گفتار

لیکن جو یہ تعمیم ہے حضرت کے سخن میں ۔ اس کو تو نہ تسلیم کرے گا یہ گنہگار

ہر ملت و مذہب میں ہیں اچھے بھی بُرے بھی ۔ وہ کونسا فرقہ ہے کہ سب جس میں ہوں ابرار

باطن سے ہے اخلاق حمیدہ کا تعلق ۔ فطرت میں جو ہے نیک وہ بد ہوگا نہ زنہار

ہے جس کو ضرورت وہ ضرورت سے ہے مجبور ۔ ہے شوق جسے کیوں نہ کیا جائے وہ مختار

مقصود جو اصلی ہے وہ ہے دل کی درستی ۔ یا ہیٹ اور کوٹ ہو یا جبہ و دستار

حاجت بہ کلاہ برکی داشتنت نیست
درویش صفت باش و کلاہ تتری دار

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا ۔ کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر میں نہ موج کوثر ہے اب نظر میں
ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی ۔ چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں اکبر ۔ پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

حاکم دل بن گئی ہیں یہ تھیٹر والیاں ۔ میں لگاؤں گا گل باغ جگر کی ڈالیاں

ضبط کے جامے کے بخیے ٹوٹتے ہیں دوستو ۔۔۔ دی و فردا کیا کروں یاد جو یہ خوش حالیاں
آسماں سے کیا غرض جب ہے زمیں پر یہ چمک ۔۔۔ ماہ و انجم سے ہیں بڑھ کر اُن کے بُندے بالیاں

فول وہ کہتی ہیں مجھ کو میں انھیں سمجھا ہوں پھول
ہیں گل رنگیں سے بہتر اُن گلوں کی گالیاں

گالی ٹھونگی تو لگی دعاؤں جیسی

بیوقوف = FOOL انگریزی میں کبھی کبھی "ف" کی آواز PH سے بھی نکلتی ہے۔ جیسے PHASE رومن میں پھول PHOOL یوہنی لکھا جائے گا

مجھ کو حیرت ہے کہ ہیں یہ کس گرو کی چیلیاں ۔۔۔ حشر برپا کر رہی ہیں مغربی البیلیاں
لطف آزادی کی اس سے بڑھ گئی ہے چاشنی ۔۔۔ اب تو شیشے میں اُترنے کی نہیں یہ چیلیاں
اپنے ہاتھوں اپنے سانچے کا کریں گی بندوبست ۔۔۔ یہ نہیں وہ گڑ کہ تم اس کی بناؤ بھیلیاں

بضرورت قافیہ۔

خواہ صاحب کو تم سلام کرو ۔۔۔ خواہ مندر میں رام رام کرو
بھائی جی کا فقط یہ مطلب ہے ۔۔۔ جس میں رُوپا ملے وہ کام کرو

روپیہ کا اصلی لغوی تلفظ روپا بمعنی چاندی ہے اسی سے روپیہ چاندی کا سکہ ہوا۔

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی ۔۔۔ اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو
پارک کے زردے کے مالی سے گل بے بولیا ۔۔۔ مال ضائع کرنے کا تم کو ہے مالیخولیا
شیخ کے دامن کو اکبر نے دیا بوسہ جو کل ۔۔۔ ہم نے برکت کے لئے اک مس کا دامن چھو لیا

خبط سنگ۔

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو اُبھارا ۔۔۔ اک میر نے تعلیم سے لڑکی کو سنوارا
پتلون میں وہ تن گیا یہ ساٹے میں پھیلی ۔۔۔ پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اُتارا
فرمائیں مرا قصور حضرت جو معاف ۔۔۔ جو امر ہے واقعی گذارش کروں صاف
انکار نہیں نماز روزے سے مجھے ۔۔۔ لیکن یہ طریق اب ہے فیشن کے خلاف
تکلفات سے للہ اپنا سر نہ پھراؤ ۔۔۔ جو دال روٹی ہو موجود وقت پر وہ کھلاؤ
مجھے بھی چکھو گے کیا رکھ کے خوان نعمت پر ۔۔۔ کباب کرتا ہے اب مجھ کو انتظار پلاؤ

شکل کوے کی ہٹ ممولے کی
واہ کیا دھج ہے میرے بھولے کی

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا
بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں
اخبار میں جو چاہیے، وہ چھاپ دیجئے

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے

عادت جو پڑی ہو ہمیشہ سے وہ دُور بھلا کب ہوتی ہے
رکھی ہے چنوٹی پاکٹ میں پتلون کے نیچے دھوتی ہے

دستار و پیرہن گم اور جیب وکیسہ خالی
تہذیب مغربی نے ہم کو جھاڑ ڈالا

میرے لئے شراب یہاں بھی ہے کیا حرام
اس شہر میں تو کوئی مجھے جانتا نہیں

اکبر ہنوز اُن سے ہے امیدوار لطف
بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں

ناز تھا اُن کو بہت اپنے بدن کی ساخت پر
اگزیبیشن میں مرے اک دوست عُریاں ہو گئے

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیر سر ہے یا جناب مکرمی ہے

چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

لیلےٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا
ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا

حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطف بجز ہستی فیشن کے ساتھ پہنا

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سَر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

(خطاب — SIR اور سَر) (ایک انگریزی ناچ = BALL سر کے بال)

تہمد میں بٹن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اُگا
ہر پیر پر اک پیرا بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اُگا

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر چڑھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

تماشہ گاہ THEATRE

بسے برگڈ میں مغرب کی رفاقت اس کو کہتے ہیں
ہوئے مدفون تکیئے میں اصالت اس کو کہتے ہیں

کیوں سول سرجن کا آنا رُکتا ہے ہمنشیں
اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہو

قاصد ملا جواُن سے وہ کھیلتے تھے پولو
خط رکھ لیا یہ کہہ کر اچھا سلام بولو

گو = چوگان ۔

چھاپے کی تقویت پر لیڈر نہو نہ اکبر
اپنی بساط دیکھو اپنا مقام دیکھو

باتیں بھی مجھ سے کیں مری خاطر بھی کی بہت
لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے

کچھ دیکھتا نہیں میں دل زار کے لیئے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

کافی اگرچہ لیٹنے کو اک پلنگ ہے
انگڑائیوں کو عرصۂ دنیا بھی تنگ ہے

اگرچہ ریش منڈانے سے ہے صفائی رخ
گناہ گار مگر بال بال ہوتا ہے

وہ فقط وضع کے کشتہ ہیں نہیں قید کچھ اور
بھینس کو گون پنھا دیجئے عاشق ہو جائیں

انگریزی جامہ = GOWN

کچھ جوڑ تو ان میں سے ہوئے بال میں رقصاں
باقی جو تھے گھران کا افلاس نے مارا

بہرا وہ بنا کیمپ میں یہ بن گئی آیا
بی بی نہ رہیں جب تو میاں بن بھی سدھارا

محفل رقص ۔ خدمتگار = BEARER - بہرا - جو سُن نہ سکتا ہو - کھلائی = آیا ۔ "آیا" مذکر ہے۔

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق
اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق

شان سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں
بُت بھی اب دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

بھائی بھائی میں یہ ہاتھا پائی
سلف گورنمنٹ آگے آئی

پانوں کا ہوش اب فکر نہ سر کی
ووٹ کی دھن میں ہو گئے پھرکی

سند کیسی جال ان میں اگر ہے ہو گا خود ظاہر
کوئی سرٹیفکٹ سے خوبصورت ہو نہیں سکتا

سند = CERTIFICATE

جو چاہتے ہیں کہ عمر اعتدال کے ساتھ — بٹھا رہے ہیں وہ لبکٹ کا جوڑ دال کے ساتھ

پہلے ہوتا تھا وصال اور اب ہے مرگ نیچری — عرس کا اب اس لئے ہے نام اپنی ورسری

شاپ میں سب جمع ہیں مجھ سے نہ پی پی کیجئے — اب اس بوتل کو میرے گھر پہ وی پی کیجئے

دوکان = SHOP

ڈاڑھی خدا کا نور ہے بیشک مگر جناب — فیشن کے انتظام صفائی کو کیا کروں

بوئے وفا نہیں ہے سوں کے اصول میں — بس رنگ دیکھ لیجئے گملے کے پھول میں

اکثر اسی ہوس میں بنے ہیں کلوخ کمپ — اس کے خوشا نصیب جسے ہو رسوخ کمپ

آخر اگر ملے جو ہے نام و نمود میں — کیا حرج زندگی ہو اگر حال زشت میں

دوزخ کے داخلہ میں نہیں ان کو عذر کچھ — فوٹو کوئی لگا دے جواں کا بہشت میں

ورچوس دیکھتے ہیں وہ نہ سِنر دیکھتے ہیں — فرنیچر دیکھتے ہیں اور ڈنر دیکھتے ہیں

بدکار = SINNER ، نیکوکار = VIRTOUS

مئے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی مسجد میں دو — شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی بیزار نہ ہو

رات بھر — صبح کو توبہ کر لی ۔ رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی ۔

توپ کی طرح چل اس عہد میں گو منہ ہو سیاہ — سرخروئی اب اسی میں ہے کہ تلوار نہ ہو

زمانہ کا انقلاب ہے۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں — بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

ایک انگریزی اخبار ۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ مخواہ کو دیسی چیزوں پر بدیسی چیزوں کو ترجیح دی جاتی ہے ۔

رفتار ترقی یہ کہیں ناچ نہ ہو جائے — یہ قراءت مصری کہیں کھاچ نہ ہو جائے

توحید کی تحریک سے زندہ ہے ترا دل — مغرب کی مگر کوک سے یہ واچ نہ ہو جائے

ایک راگ ہے ۔ جیبی گھڑی ۔ کسی شے میں افراط اچھی نہیں ۔

اذانوں سے سوا بیدار کن انجن کی سیٹی ہے

اسی پر شیخ بےچارے نے چھالی اپنی پیٹی ہے

سوا = زیادہ

کہاں باقی رہے ہم میں وہ اوراد سحر گاہی
وظیفے کی جگہ یا پانیر یا آئی، ڈی، ٹی ہے

I.D.T = ایک انگریزی اخبار کا نام ہے۔ ضروریات کے مقابلہ میں مذہب کوئی چیز نہیں ہے

مطلع انوار مشرق سے ہے خلقت بے خبر
ستند پر تو وہ ہے مغرب سے جو منقول ہے

روحانیات میں بھی مغرب ہی کی تقلید ہے۔ مراقبہ کچھ نہیں مسمریزم سب کچھ ہے۔

راہ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے
واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

"نہ اِدھر کے ہوئے نہ اُدھر کے ہوئے"

نہ مانا شیخ جی نے چکھ گئے دس پانچ یہ کہکر
اگر قابض ہوں یہ بسکٹ تو ہوں اللہ مالک ہے

دیکھیے حرص شکم اتنا غالب آیا کہ حکیم عقل کی اس کے سامنے کچھ نہ چلی۔

شکر ادا کرنا ہے واجب ان کی طبع نیک کا
ہر ڈنر سے بھیجتے ہیں مجھ کو فوٹو[1] کیک[2] کا

ضعف سے رعشہ ہے یا غربی ہوا کا ہے اثر
ہینڈ[3] کو میرے مرض لاحق ہوا ہے شیک[4] کا

[1] عکسی تصویر = PHOTO [2] انگریزی کھانا = CAKE [3] ہاتھ = HAND [4] ہلنا = SHAKE۔

مصافحہ کو TO SHAKE HAND = کہتے ہیں اور شیک کے معنی ہے کے بھی ہیں انھیں دونوں معنوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔

وہ کبھی مجھ کو جواب نامہ لکھتا ہی نہیں
جب گلہ کرتا ہوں کہدیتا ہے پہنچتا ہی نہیں

فرائض

قرآن کو زبان سے دل میں اتاریئے
علمی نمونہ چھوڑ عمل کو سنواریئے

چشم و زبان میں کیجئے پیدا اثر جناب
بعد اس کے بندگانِ خدا کو پکاریئے

باصنیت کہنہ نقشے مستقل است و ہمے
در حالش ار نہ بینی اے وائے بزنگاہست

مشرب مرا قناعت مذہب مرا طریقت
ملئے اگر تو خادم رکئے اگر تو رخصت

نواب کہتا ہے مل جاؤں گا کر ان کی مدد
چھپا ہوا ہوں غریبوں کی بھوک پیاس میں ہیں

متی کا عہدنامہ جدید ملاحظہ ہو۔

ہرگز نہ قضا کرو نمازیں
مرتے مرتے ادا کیے جاؤ

تیری تنخواہ بڑھی شکر ہے لیکن اے دوست
تیری تو کچھ نہ ترقی ہوئی تنخواہ کے ساتھ

کرو اطاعت خدا کی بس وہی معبود برحق ہے
اسی کی شان یکتائی جہاں میں آشکارا ہے

اگر اعمال اچھے ہیں تو پاؤ گے بڑے درجے
سمجھ لو امتحان اس دار فانی میں تمہارا ہے

بزرگوں کا ادب اللہ کا ڈر شرم آنکھوں میں
انھیں اوصاف کی نسبت مذاہب میں اشارا ہے

محنت کا امانت کا قناعت کا شجر ہو
جس رنگ کا پھل آئے وہ عزت کا ثمر ہو

خالق پہ بھروسا ہو تو عزت نہیں گھٹتی
افسوس کہ انسان بہت پست نظر ہے

نفس کی خواہش کے آگے عقل کی سنتا ہے کون
میں کہوں کس سے کہ اس غفلت سے ڈرنا چاہیئے

شامت آئی ہے یہ مسلم ہے
بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی

میری جانب اشارہ غالب ہے
یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی

خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو
کھل ہی جائیگا آئی ہے جس کی

اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے
بڑھ گئی ہے مری بہت وھسکی (شراب)

بزم ہستی میں محبت کے ترانوں کو نہ چھوڑ
یہ وہ شے ہے جسے ہر ساز سے اک سازش ہے

ہے یہی دستور لیکن کس قدر افسوس ناک | زندگی ہی کو سمجھ لینا مآل زندگی
غنچہ کھل جائے تو پھر زینت محفل نہ سہی | خود شگفتہ رہے گلدستہ میں داخل نہ سہی

دل وہ ہے جو باغ ایماں کی ہوا سے پھول جائے
آخرت کی یاد میں دنیا کو بالکل بھول جائے

نیت ہو اگرچہ خیر و ایماں کی طرف | آنکھیں نہ اٹھاؤ بزم عصیاں کی طرف
مانا کہ پڑھو گے واں پہنچ کر لا حول | جانا ہی ضرور کیا ہے شیطاں کی طرف
اکبرؔ سے میں نے پوچھا اے واعظ طریقت | دنیائے دوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو | انگریز کو ہے بنٹو سے جس قدر تعلق
حدیں قوموں کی قسمت کی کیا کرتا ہے یہ قائم | زمانہ دیکھ کر چلئے طریق زندگانی میں
محبت کس طرح اس قوم میں باہم رہے قائم | زبانیں صرف غیبت دل ہیں ڈوبے بدگمانی میں

مطلب یہ ہے کہ پیٹھ پیچھے برائی کرنا خواہ مخواہ لوگوں پر شک کرنا چھوڑ دینا چاہئے۔

زندگی روز قیامت میں ریلیشنؔ سمجھو | اس کو کالج اور اسے کانووکیشنؔ سمجھو

ؔ رشتہ۔ علاقہ۔ؔ جلسہ تقسیم اسناد۔

جس سے جو بن پڑے وہی کام کرے | صاحب بنے کھائے کھیلے آرام کرے
لیکن رہے قومی بھائیوں کا ہمدرد | ہر حال میں ادعائے اسلام کرے
ہنسی خوشی سے ہے بہتر کنارہ کش ہونا | یہ لطف کیا کہ جدا ان سے ہوں ملال کے بعد
جس نے رکھا نہ فضولی سے سروکار اکبرؔ | مرد عاقل ہے وہی دہر کے مہمانوں میں
قلزم کی نہ ٹٹولو یا ایرشپؔ میں جھولو | جب بھی یہی کہوں گا اللہ کو نہ بھولو

ؔ ہوائی جہاز

اپنی جگہ سے تم نہ ہٹو گو ہوں گردشیں | ایسے رہو کہ جیسے انگوٹھی میں نگ رہے
مقلد لیڈر مرحوم کے اتنا نہیں سمجھے | غریبی اور محنت پہلے یا جاہ و حشم پہلے
ذرہ ذرہ سے لگاوٹ کی ضرورت ہے یہاں | عاقبت چاہے تو انسان زمیندار نہ ہو
ہر آرزوے دلی کی تم تیغ تیز کرو | لالچ میں بہت ضرر ہے لالچ نہ کرو

شیخ جی قانع کے گھر میں ہو جسم ‌ ‌ ‌ ورنہ اب مٹتی ہے ہستی آپ کی

فلسفے میں کیا دھرا ہے گھر کا ہو یا لندن کی ‌ ‌ ‌ سعی کا موقع ملے تو آرٹ[۱] یا سائنس سیکھ

دشمن دانا سے بچ پہچان لے نادان دوست ‌ ‌ ‌ صرف لفاظی سے ان روزں نہیں ملنے کی بھیکھ

۱؎ آرٹ کے معنی یہاں ادب کے نہیں ہیں ہنر کے ہیں۔

کالج و ٹیچر و حکام ہمہ در کار اند ‌ ‌ ‌ تا تو پاسے بکف آری و کنی عہدہ پری

طاعت حق بھی مگر شرط ہے روٹی جو ملے ‌ ‌ ‌ شیخ سعدی نے کہا ہے کہ بغفلت نخوری

ابر و باد و مہ و خورشید و فلک در کارند ‌ ‌ ‌ تا تو نانے بکف آری و بغفلت نخوری (سعدی)

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے ‌ ‌ ‌ لطف کیا ہے لدیئے موٹر پہ جو زر کے زور سے

غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اٹھا ‌ ‌ ‌ رو کتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے

افیشل اعمال نامہ کی نہ ہوگی کچھ سند ‌ ‌ ‌ حشر میں تو نامۂ اعمال دیکھا جائے گا

چاہا جو میں نے ان سے طریق عمل پہ وعظ ‌ ‌ ‌ بولے کہ نظم ذیل کو ارقام کیجیے

پیدا ہوئے ہیں ہند میں اس عہد میں جو آپ ‌ ‌ ‌ خالق کا شکر کیجیے آرام کیجیے

بے انتہا مفید ہیں یہ مغربی علوم ‌ ‌ ‌ تحصیل ان کی بھی سحر و شام کیجیے

یورپ میں پھریئے پیرس و لندن کو دیکھیے ‌ ‌ ‌ تحقیق ملک کا [illegible] و شام کیجیے

ہو جائیے طریقۂ مغرب پہ مطمئن ‌ ‌ ‌ خاطر سے محو خطرۂ انجام کیجیے

پیران بے فروغ کا گل ہو چکا چراغ ‌ ‌ ‌ ناحق نہ دل کو تابع اوہام کیجیے

رکھیے نہ دل کو دیر و کلیسا سے منحرف ‌ ‌ ‌ متروک قید جامۂ احرام کیجیے

رہیے جہاں میں وسعت مشرب سے نیکنام ‌ ‌ ‌ مجھ کو مرید ہندوؤں کو رام[۲] کیجیے

رکھیے نمود و شہرت و اعزاز پر نظر ‌ ‌ ‌ دولت کو صرف کیجیے اور نام کیجیے

سامان جمع کیجیے کوٹھی بنائیے ‌ ‌ ‌ باصد خلوص دعوت حکام کیجیے

آرائشوں سے گھر کو مہذب بنائیے ‌ ‌ ‌ تزئین طاق و سقف و در و بام کیجیے

یاران ہم مذاق سے ہم بزم ہو جیے ‌ ‌ ‌ موقع ملے تو شغل مے و جام کیجیے

۲؎ قابو میں لائیے

چشم ولب بتاں سے بھی غافل نہ ہوجیے
تکمیل شوق پستہ و بادام کیجیے[1]

نظارۂ مساں سے تر و تازہ رکھیے آنکھ
تفریح پارک میں سحر و شام کیجیے

مذہب کا نام لیجیے عامل نہ ہوجیے
جو متفق نہ ہو اُسے بدنام کیجیے

طرز قدیم پر جو نظر آئیں مولوی
پبلک میں اُن کو مورد الزام کیجیے

زنجیر فقہ توڑیئے کہہ کر خلاف شرع
مضمون لکھیئے دعویٰ الہام کیجیے

ممنوع ہے تعدد ازواج خاص کر
یوم گھوم پھر کے تنقیہ[2] عام کیجیے

قومی ترقیوں کے مشاغل بھی ہیں ضرور
اس مد میں بھی ضرور کوئی کام کیجیے

لڑکے نہ ہوں تو ہو نہیں سکتی چہل پہل
فکریں پئے وظیفہ و انعام کیجیے

تحصیل چندہ کیجیے لڑکوں کو بھیج کر
سارا علاقہ ہند کا اب خام[3] کیجیے

بے رونقی سے کاٹیئے کیوں اپنی عمر کو
کیوں انتظار گردش ایام کیجیے

جو چاہیئے وہ کیجیے بس یہ ضرور ہے
ہر انجمن میں دعوئے اسلام کیجیے

لیکن نہ بن پڑیں جو یہ باتیں حضور سے
مردوں کے ساتھ قوم میں آرام کیجیے

[1] لب و چشم۔ [2] صفائی۔ [3] قبضہ کر کے مالگذاری وصول کرنا۔

کیا فرض یہ ہے کہ ہم ڈھٹائی سے رہیں
لازم کیا ہے بلند ادائی سے رہیں

کافی ہے خدا کی یاد اک گوشہ میں
روٹی مل جائے اور صفائی سے رہیں

HIGH THINKING AND PLAIN LIVING. بلند خیالی اور سادہ زندگی میں بسر کرنی چاہیئے۔

مذموم ہے رمز[*] و طعنہ و کبر و حسد
رکھو یہ روش کرے جو اللہ مدد

ہم رنگ سے ارتباط با صدق و صفا
بے میل سے احتراز بے کینہ و کد

[*] رمز یہاں کپٹ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
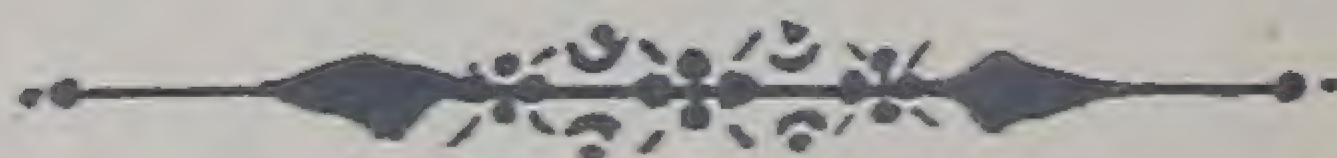
قافیہ

اے قبلہ مجھ پہ آپ چڑھے آتے ہیں یہ کیوں
ممبر اس انجمن کا ہوں ممبر نہیں ہوں میں

ممبر (۱) رکن (۲) ممبر لکڑی کی نشست جس پر بیٹھ کر وعظ کہا جاتا ہے۔

ضرورت کچھ نہ تھی اس کی کہ آپس میں بھی ہو جائے
سلام و رحمۃ اللہ کی جگہ گڈ نائٹ اور گڈ ڈے

حیات مذہبی سے بھاگتا تھا کھیل گڑیوں کا
کہاں کی قوم ہاں کچھ بن گئے ہیں نازنیں گڈے

۱؎ روز بخیر = GOOD DAY ۲؎ شب بخیر = GOOD NIGHT

بند ٹاپے میں تھے وہ بنگلے پر
صبح کے وقت ہنس پڑی اک میم

جب وہ بوسے بجائے کو کروں کوں
مرغ شاخ درخت لاہو تیم

زندگی سے میرا بھائی سیر ہے
پھر بھی خوراک اس کی ڈھائی سیر ہے

عقل نے اچھی کہی کل لالہ مجلس رائے سے
جھک کے ملنا چاہیے ہم سب کو ویسرائے سے

شعر کیسا ہی ہو لیکن قافیے ہیں اس کے خوب
کون ایسا ہے کہ جو ہو مختلف اس رائے سے

فقط سڑکوں سے تسکین نگاہ چشم شر
اندھیرا ہے گھروں میں راستوں میں لیمپ برقی ہے

ابتدا گرمی کی ہے اپریل سے
اب میں گھبرانے لگا کھپریل سے

موج ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی
جا کے گنگا پہ کیا کرتا ہوں بجے مائی کی

میں کیا کروں گا عزیزو یہ پارٹی لے کر
مزا تو جب ہے کہ آئے وہ یار ٹی لے کر

خموش ہو گیا بت کی طرح میں کونسل میں
برہمن اٹھے جو اپنی میجارٹی لے کر

۱؎ دعوت رخصت = PARTY ۲؎ چائے = TAE. ۳؎ کثیر جماعت = MAJORITY

مرغی نے کہا خوب کسی کیمپ میں لٹ کے
انڈا وہی اچھا ہے کہ بچہ جسے کھٹکے

ممبر علی مراد ہیں یا سکھ ندھان ہیں
لیکن معائنہ کو وہی نادان ہیں

ہم ریش دکھاتے ہیں کہ اسلام کو دیکھو
وہ زلف دکھاتی ہے کہ اس لام کو دیکھو

یا ایٹیشن کے صدقے چائے دُودھ اور کھانڈ[1]	یا ایجیٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے[2]
یا قناعت اور طاعت میں بسر کر زندگی	رزق کی کشتی کو کھے پتوار لے اور ڈانڈلے

[1] شکر۔ [2] ایک مقام کا نام ہے۔

چھوڑ کر رنج اپنے مٹنے کا	منتظر ہوں اب اُن[1] کے پٹنے کا

[1] یعنی رقیبوں کے۔

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لے کر	بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتھی لے کر
سودا اُس کو ہے جو سدھارا لندن	وہ دولت و جنس گھر میں جوتھی لے کر
یہ بولے رو کے پیرو اور گیا دین	دھرم دنیا سے اٹھا اور گیا دین
مس کو دیکھا عاشق زلف چلیپا ہو گیا	مست تھا دل بھول کر وسکی کا پیپا ہو گیا
من العلم قلیلا کو بھی دیکھو بعد او تیتم	نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم
چپکوں دنیا سے کس طرح میں	عورت نے کہا کہ گوند ہوں میں
قومی چندے کدھر سمائیں	کالج نے کہا کہ توند ہوں میں
بولے جاڑوں میں لالہ گنگا دین	دھوپ سے تجھ کو ہوتی ہے تسکین
ڈاڑھی سورج کی تھام لیتا ہوں	مختصر یہ کہ گھام لیتا ہوں
اُس کے دست نازنین سے پائی ٹی[1]	اب کہاں باقی ہے ہم میں پائٹی[2]

[1] چار۔ [2] تقدس۔

اجل آئی اکبر گیا وقت بحث	اب اِف[1] کیجئے اور نہ بٹ[2] کیجئے

[1] اگر = IF [2] مگر = BUT

ہوتا ہے نفخ یورپین نان پاؤ سے	میں خوش ہوں ایشیا کی خیالی پُلاؤ سے
جو پوچھا میں نے ہوں کس طرح ہے پی[1]	کہا اس بُت نے میرے ساتھ مئے پی (خوش)

نہ سن تو قرآن کا وعظ بھائی خوشی سے تقلید ہکسلے کر
پھرے گا گلیوں میں آخر اک دن دیا سلائی کا بکس لے کر

[1] HAXLEY = ایک انگریزی فلسفی) قافیہ کی تلاش دیکھئے اور جستجوئے سخن کی داد دیجئے۔

ایک۔ م
خوب!

رندان پختہ کار کو موسم کی قید کیا　　موقوف مے کشی نہیں ماہ اگست پر

اثر یہ تھا عیسوی نفس کا کہ زندہ ہوتا تھا جسم بے جاں
یہاں تو ہم مر رہے ہیں لیکن بتان ترسا کے دم میں آگے

قول بابو ہے کہ جب بل پیش ہو　　پیش حاکم بلبلانا چاہئے

محبت اپنی ہی پریوں سے رکھیں حضرت اندر　　مس مغرور لندن ان کی چیری ہو نہیں سکتی
فزوں ہے دلکشی مشرق کی مغرب کی لطافت سے　　حریف بلبل گلشن کینری ہو نہیں سکتی

ادھر ہے جلوۂ مضمون ادھر حسن قوافی ہے　　یہی اک شغل میرے دل کے بہلانے کو کافی ہے

سر میں شوق کا سودا دیکھا　　دہلی کو ہم نے بھی جا دیکھا
جو کچھ دیکھا اچھا دیکھا　　کیا بتلائیں کہ کیا کیا دیکھا

جلوۂ دربار دہلی۔

نظم ہے مجھ کو بادہ صافی　　شغل یہی ہے دل کو کافی
مانگتا ہوں یاروں سے معافی　　خیراب دیکھئے لطف قوافی
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا　　اچھے ستھرے گھاٹ کو دیکھا
سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا[1]　　حضرت ڈیوک کناٹ کو دیکھا

[1] LORD کی خرابی = لاٹ لکڑی کا ایک بڑا ستون۔

خیموں کا ایک جنگل دیکھا　　اس جنگل میں منگل دیکھا
برھما اور ورنگل دیکھا　　عزت خواہوں کا دنگل دیکھا

کشتی لڑنے کی جگہ۔ بیٹھنے کی درباری کرسی۔

اگزیبیشن کی شان انوکھی　　ہر شے عمدہ ہر شے چوکھی
اقلیدس کی ناپی جوکھی　　من بھر سونے کی لاگت سوکھی

نمائش گاہ

گو رقاصہ اوج فلک تھی　　اس میں کہاں یہ نوک پلک تھی
اندر کی محفل کی جھلک تھی　　بزم عشرت صبح تلک تھی

کی ہے یہ بندش ذہن رسا نے — کوئی مانے خواہ نہ مانے
ہم تو سنتے ہیں یہ فسانے — جس نے دیکھا ہو وہ جانے

بلبل ہیں آج ہم چمنستاں کے کمپ کے — پروانے کل بنیں گے کلیسا کے لمپ کے
فکر بہشت و کوثر و تسنیم ہو چکی — اب پارک کا خیال ہے چرچے ہیں پمپ کے
رکھتے تھے جو ہر اک قدم پھونک پھونک کر — خوگر ہوئے ہیں لیپ کے اسکپ کے جمپ کے

LEAP, SKIP, JUMP = اچھل، کود، پھاند۔

ڈارون صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں نہ مانونگا کہ وارث آپ کے لنگور تھے

موت چل دی میری مشت استخواں کو سونگھ کر!
چونک اٹھا اکبر غرض خواب گراں سے اونگھ کر

دیکھا جو نمائش چگا گو — دل نے کہا دین سے کہ بھاگو
اتنے میں اجل پکاری سر پر — بس ہو چکا خواب زیست جاگو
آتا نہیں مجھ کو قبلہ قبلی — بس صاف یہ ہے کہ بھائی شبلی
تکلیف اٹھاؤ آج کی رات — کھانا یہیں کھاؤ آج کی رات
حاضر جو کچھ ہو دال دلیا — سمجھو اس کو پلاؤ قلیا
سڑکیں تھیں ہر کمپ سے جاری — پانی تھا ہر پمپ سے جاری
نور کی موجیں لمپ سے جاری — تیزی تھی ہر جمپ سے جاری
کچھ چہروں پر مردی دیکھی — کچھ چہروں پر زردی دیکھی
اچھی خاصی سردی دیکھی — دل نے جو حالت کردی دیکھی
ڈالی میں نارنگی دیکھی — محفل میں سارنگی دیکھی
بے رنگی بارنگی دیکھی — دہر کی رنگا رنگی دیکھی
ہاتھی دیکھے بھاری بھرکم — ان کا چلنا کم کم تھم تھم
زریں جھولیں نور کا عالم — میلوں تک وہ چم چم چم چم
پرتھا پہلوے مسجد جامع — روشنیاں تھیں ہر سو لامع

جس کو دیکھو دید کا طامع ‌ ‌ کوئی نہیں تھا کسی کا سامع
سرخی سڑک پر کٹتی دیکھی ‌ ‌ سانس بھی بھیڑ میں گھٹتی دیکھی
آتشبازی چھٹتی دیکھی ‌ ‌ لطف کی دولت لٹتی دیکھی
چوکی ایک چو لکھی دیکھی ‌ ‌ خوب ہی چکھی پکھی دیکھی
ہر سو نعمت رکھی دیکھی ‌ ‌ دودھ اور شہد کی مکھی دیکھی
ایک کا حصّہ من و سلوا ‌ ‌ ایک کا حصّہ تھوڑا حلوا
ایک کا حصّہ بھیڑ اور بلوا ‌ ‌ میرا حصّہ دور کا جلوا
اوج برٹیش راج کا دیکھا ‌ ‌ پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا ‌ ‌ رخ کرزن مہراج کا دیکھا
پہنچے پھاند کے سات سمندر ‌ ‌ تحت میں ان کے بیسیوں بندر
حکمت و دانش ان کے اندر ‌ ‌ اپنی جگہ ہر ایک سکندر
اوج بخت ملاقی ان کا ‌ ‌ چرخ ہفت طباقی ان کا
محفل ان کی ساقی ان کا ‌ ‌ آنکھیں میری باقی ان کا

ہجر کی شب یوہنی کاٹو بھائیو
ان کا فوٹو لے کے چاٹو بھائیو

جو سچی بات ہے کہدوں گا بے خوف و خطر اُس کو
نہیں رکنے کا میں ہرگز بری ٹوکے کہ جن ٹوکے
انار آتے جو کابل کے تو پڑتے سب کے حصّہ میں
امیر آئے تو ہم کو کیا مزے ہیں لارڈ منٹو کے

فرما گئے ہیں یہ خوب بھائی گھورن ‌ ‌ دنیا روٹی ہے اور مذہب چورن

تمھاری شاعری یہ پھلجھڑی ہے یا پڑاقا ہے
یہ حافظ ہی کی محفل ہے جہاں کا ساگ دِہا قاہے

قوم

کمر باندھی تھی یاروں نے جو راہ جب قومی میں
وہ بولے تو نہیں چلتا وہ بولے تو نہیں چلتا
کہا پیر طریقت نے اکڑ کر اپنی ٹمٹم پر
یہی منزل ہے جس میں شیخ کا ٹٹو نہیں چلتا

خدا کے منکر نبی سے غافل کہاں کے پیر اور امام صاحب
انھیں کے در پر جھکی ہے خلقت سلام صاحب سلام صاحب

دل تو مدت سے ہے خاک درِ دیر اے اکبرؔ
ہاں زبان پر ہے مگر کفر کی تردید ہنوز
ملت کو جو دیکھو تو نہیں حامی دیں ایک
قوت کو جو پوچھو کہیں دو دل بھی نہیں ایک

حریفوں سے لگاوٹ کرتے ہیں آپس میں لڑتے ہیں
یونہی بربادیاں آتی ہیں یونہی گھر بگڑتے ہیں

کپتان اپنی فوج میں ہیں ہم ہیں ڈوبتے
واللہ قوم پر ہے یہ قومی جہاز بوجھ
ٹوٹا یہ جس طرح سے ہو تازی کا ساز بوجھ
یوں بابوان ہند پہ اب ہے نماز بوجھ
اب تک کوئی بہتری تو ظاہر نہ ہوئی
گذرے جاتے ہیں ہم پہ سال و مہ و یوم
شاید کہ یہی ترقی قومی ہے
ہر شخص بجائے خود بنا ہے اک قوم

بنائے ملت بگڑ رہی ہے لبوں پہ ہے جان مر رہے ہیں
مگر طلسمی اثر ہے ایسا کہ خوش ہیں گویا ابھر رہے ہیں
ادھر ہے قوم ضعیف مسکیں ادھر ہیں کچھ مرشدان خود بیں
یہ اپنی قسمت کو رو رہی وہ نام پر اپنے مر رہے ہیں

لیڈر۔

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے
جو خیال میں نرالے تو مذاق میں انوکھے
نہ وہ وضع قوم کی ہے نہ وہ شان ہے نہ دھج ہے

کوئی ان میں ہے جو ایسا کہ وہ ڈون[1] کی ہے لیتا
جو اُسے بھی چھیر دیکھا تو وہ کمتر از کھرج[2] ہے
جو کہ آئے سیر لندن ہیں اسیر و کبر و فیشن
جو نہیں گئے ہیں بن ٹھن انھیں اینڈ گی گرن ہے
نہیں کوئی صاف سینہ بہم ان میں بھی ہے کینہ
یہ انھیں کہیں کمینہ وہ انھیں کہیں اُپج ہے
کہیں میم کا ہے پھندا کوئی دخت زر کا بندہ
ہے پھر اس پہ تازہ خندہ کہ دل اس میں کیا حرج ہے

[1] بہت بلند راگ [2] بہت آہستہ راگ۔

تھا شوق ادائے مطلب اک حسن کے ساتھ
اکبر نے جو فکر کی تو وہ بات بنی
دیوانہ تھی قوم عشق میں پریوں کے
پکڑی گئی اور علام جنات بنی
ہو جنھیں مقدرت و صنع و نفاذ قانون
بس انھیں کو صف اقوام میں نیشن سمجھو

(قوم) اصلی قومیت کیا ہے؟

اپنے بھائی کے مقابل کبر سے تن جائیے
غیر کا جب سامنا ہو بس قلی بن جائیے
فلسفہ الحاد کا کر لیجئے فوراً قبول
دین کی ہو بات تو ابطال پر ٹھن جائیے
چندے کے مجلس میں پڑھئے رو کے قرآن مجید
مذہبی محفل میں لیکن مثل دشمن جائیے
شیخ صاحب ہے یہی قومی ترقی کی شناخت
روٹھنے سے کچھ نہیں ہے فائدہ من جائیے

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں
اغیار ان پہ گزرتے ہیں خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا زباں کی کبھی بحث
ہے سخت مضر یہ نسخہ گاؤ زباں
اے شیخ جب نکیل نہیں دست قوم میں
پھر کیا خوشی جو اونٹ مرے ریل ہو گئے
اب تو جاگو ایشیائی بھائیو!
نیند کی غفلت میں صدیوں سو لئے

ایک اس عہد میں دو دل بھی نہیں اے اکبر
یہی باعث ہے کہ میں نے کبھی ہم ہم نہ کیا

ہر سمت تو ہے اک دام بلا رہ سکتے ہیں خوش کس طرح بھلا
اغیار کی کاوش ایک طرف آپس کی لڑائی ایک طرف

ناتوانی سے مٹا جاتا ہے آپس کا وہ میل | نبض کے ساتھ ہے اب سانس کا چلنا مشکل
ہنر سے بھی فوائد ہم کو حاصل ہو نہیں سکتے | سبب یہ ہے کہ ہم آپس میں یکدل ہو نہیں سکتے
مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا | کہ قدر اُٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی
اتحاد باہمی اس ملک میں آسان نہیں | کوئی سرسید ہے کوئی بابو آشوتوش ہے

مختلف الخیال و مختلف المذاق کے لوگ یہاں جمع ہیں۔

گردن رفامر کی ہر اک سمت تن گئی | بگڑی ہو قوم کی مگر ان کی تو بن گئی
قوم کی مسجد میں کیجئے جھاڑ پھونک | اسپتالوں میں وہ اچھی ہو چکی
کوئی صاحب نہ ہوں للہ ناخوش سن کے یہ مصرع | خیال حبّ قومی پیچھے اور فکر شکم پہلے

کوئی مرکز ہی نہیں پیدا ہو پھر کیونکر محیط
جھول ہے پیچیدگی ہے ابتری ہے بھول ہے

کیا خوشی اس کی مجھے ان کو جو نوابی ملی | روغنی صاحب نے لی مجھ کو وہی آبی ملی
نہ سُنّی ہے خوش اور نہ شیعہ ہے شاد | ہے دونوں کے مرکز میں باہم فساد

یہ ۱۹۱۸ء کا نقشہ ہے جس وقت جنگ عظیم رک گئی تھی مگر ترکستان پر مالی۔ اقتصادی۔ تجارتی۔ ملکی۔ اور سیاسی ہر قسم کا انتشار تھا اور ایران میں خانہ جنگی ہو رہی تھی۔ کاش مرحوم اس وقت تک اور زندہ رہتے تو جو کچھ ہم دیکھ رہے ہیں وہی دیکھتے کہ فضل خدا سے اب مرکز بھی قائم ہیں، آپس میں اتحاد بھی ہے ہر طرح کی ترقی بھی ہے

نہ تجارت کا طریقہ نہ عبادت کا لگاؤ | یا گورنمنٹ کے دفتر میں ہیں یا قوم کے سر

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچہ میں ڈھل رہی ہے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے
قوم ہی کو دیکھئے زندہ ہے اور موجود ہے

لفظ قومی پر بلا مرکز اکڑنا چاہیئے اس کے معنی یہ ہوئے آپس میں لڑنا چاہیئے

کیا اچھے ڈھب سے صلح اور میل وملت کی نصیحت ہے۔

ہم کو سنبھالتی ہے ملّت جو لا بنائے مَیں کو نباہتی ہے عزّت جو دل میں آئے

قانون = LAW

کیا حال قوم مجھ سے تو پوچھتا ہے ہمدم ہم کا پتہ نہیں ہے مَیں ہیں مگر بہت کم

جب پیشوا نے اپنا کعبہ جُدا بنایا اپنے مرے کو سب نے اپنا خدا بنایا

جھوٹی لگاوٹوں سے ہرگز نہیں ہے سیری حرص وطمع نے کھودی اس قوم کی دلیری

بگذار بہ حال خودم اے بزم تعلّی عبرت زدہ را کار بہ آئزز دگاں نیست

عزّت = HONOUR

چرخ نے پیش کمیشن کہدیا اظہار میں قوم کالج میں اور اس کی زندگی اخبار میں

کوئی نہ آیا میرے پاس "ہرکوجپ" کے لئے جو صورتیں نظر آئیں وہ صرف ہپ کے لئے

"ہرکوجپ" کہنے کے لئے۔

حافظؔ کے فیض نے روکا ہے باب اتحاد شکوہ انگیز اک نہ اک قصہ ہر اک کو یاد ہے

استخوان مغربی کا شکر کرنا ہے بجا باہمی عف عف یہ لیکن قابل افسوس ہے

قوم ضعیف تنگ ہے چندوں کی مانگ سے کالج کے چیونٹے لپٹے ہیں ٹیڑی کی ٹانگ سے

عالم میں جب جو مستند و باوقار ہیں گو نچا ہوا پرس ہے وفاتی کی سانگ سے

پولیس میں شیخ ہیں مسجد اُجاڑ ایوان خالی ہے کتب خانہ بھرا جاتا ہے اور میدان خالی ہے

اس کا پسینا ہے اور اس کے ہیں بھپارے یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے

اس خوان مغربی سے بچتا ہے کون لیکن حضرت نگل رہے ہیں بندے نے چکھ لیا ہے

قومی ترقیوں کی زمانے میں دھوم ہے مردانے سے زیادہ زنانے میں دھوم ہے

گردن کشی کریں گے عرب میں اب اونٹ بھی
اب تک تو ہند ہی میں بھڑکتی تھی مجھ سے گائے

شوہر افسردہ پڑے ہیں اور مرید آوارہ ہیں بی بیاں اسکول میں ہیں شیخ جی دربار میں

قوم پر ممبری کا فیر ہوا — کل جو اپنا تھا آج غیر ہوا
شیخ جی مر گئے کمیٹی میں — غل مچا خاتمہ بخیر ہوا

وہ قوم کی شرط ہی نہیں ہے زباں کہیں ہے مکاں کہیں ہے
ستون ہی جب نہیں میسر تو کیا دکھاؤں میں ٹھاٹھ چھت کا

دنیا کی ہوس دھرم[1] کا لیتی ہے جو رنگ — وقت ہوتی ہے جاتر[2] ہی ہوتے ہیں تنگ
گنگا جی کا بہاؤ تو یکساں ہے — آفت ہے مگر پراگ[3] والوں کی یہ جنگ

[1] مذہب۔ [2] مسافر۔ [3] پراگ۔ الہ آباد کا پرانا نام ہے۔ پہلے پراگ تھا پھر فقیر آباد ہوا پھر الہ آباد ہوا۔

جن لوگوں کا قومی کوئی مرکز نہیں ہوتا — اُن میں کا کوئی فرد معزز نہیں ہوتا
قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

خیال حالت قومی سے دل کو پست کرتا ہوں
مگر جب دیکھتا ہوں اپنا بنگلہ جست کرتا ہوں
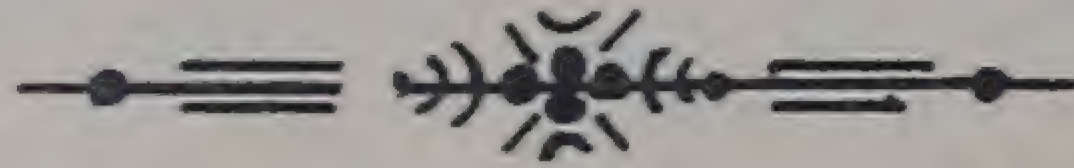
قصیدہ

قصیدہ مبارکباد جشن جوبلی ملکہ معظمہ قیصر ہند حسب ایمائے مسٹر ہاول صاحب جج سنہ ۱۸۸۷ء

زمانے میں خوشی کا دور ہے عشرت کا ساماں ہے
برنگ گل ہر اک باغ جہاں میں آج خنداں ہے

کہیں ہے رقص کی محفل کہیں ہے جلسۂ دعوت
کہیں تصویر بنتی ہے کہیں سرو چراغاں ہے

کہیں خیرات خانے جاری ہوتے ہیں کہیں مکتب
کہیں تقسیم کپڑوں کی پئے فصل زمستاں ہے

تعجب کیا اگر ایسی خوشی ہے اہل عالم کو
یہ حیرت کیا جو قیصر کا ہر اک دل سے ثنا خواں ہے

سریر آرائی پنجاہ سالہ خیر و خوبی سے
محل لطف باری ہے مقام شکر یزداں ہے

رئیس امن و اماں سے ناظر حال ریاست ہیں
ہری کھیتی زمینداروں کی ہے سرسبز دہقاں ہے

ہزاروں مدرسے قائم ہوئے ہیں سیکڑوں کالج
جہاں فکر ارسطو بس بھی اک طفل دبستاں ہے

جہاں چلتا نہ تھا کچھ زور رواں اب ریل چلتی ہے
میسر خاکساروں کو بھی اب تخت سلیماں ہے

نہ کچھ کھٹکا ہے چوروں کا نہ قزاقوں کی ہے دہشت
رواں بے زحمت و خوف و خطر ہر سمت انساں ہے

طلسم تازہ دیکھا کارخانہ تار برقی کا
زبان تار پر وہ بات ہے جو دل میں پنہاں ہے

محبت بڑھ رہی ہے فاتح و مفتوح کی باہم
گرہ جو دل میں تھی وہ اب مثال در غلطاں ہے

پریس کو بھی ہے عہد امپریس میں کامل آزادی
زباں خامہ مضمون نگاراں سیف براں ہے

فروغ مہر و مہ سے جب تلک ہے زینت عالم
نشاط انگیز جب تک گردش گردون گرداں ہے

دل اہل جہاں ہے جب تلک مرکز تمنا کا
ہوائے آرزو جب تک محیط قلب انساں ہے

خدا کے نام کی عزت ہے جبتک اہل دانش میں
تجلی علم کی جب تک چراغ راہ عرفاں ہے

ہماری حضرت قیصر رہیں اقبال و صحت سے
کہ جن کا آفتاب عدل اس کشور پہ تاباں ہے

ظرافت

لغزشیں مد ظرافت میں جو کچھ آئیں نظر
دوستوں سے التجا یہ ہے کریں اس کو معاف

سرد تھا موسم ہوائیں چل رہی تھیں برف بار
شاہد معنی نے اوڑھا ہے ظرافت کا لحاف

کمزوریاں

خوانِ فلک پہ جو ملے شکر کے ساتھ کر قبول
غم کی شکائتیں ہیں کیا آیا ہے پیش کھا بھی جا

پیش آنا اُردو کا محاورہ نہیں ہے۔

ترا ناوک بھی اے صیاد کیا ہی اوج پرور ہے
کہ تیرا صید بسمل رہتا ہے آخر نہیں ہوتا

'آخر نہیں ہوتا' اُردو میں نہیں کہتے۔

نہ خلق اس کی خبر لیتی نہ عقل اس کی مدد کرتی
خدا جب تک کسی کا حافظ و ناصر نہیں ہوتا

'ہے' کا حذف خلاف فصاحت ہے۔

اس مس پہ کون میرے سوا ہو فریفتہ
گاہک میں ہی ہوں ہند میں لندن کے مال کا

مال کا لفظ ویسا ہی ہے جیسا " وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے"

بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے پہلے بوسہ پر
خموش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد

اخلاق سوز ہے۔

ہر لگاوٹ کی وہ دھج ہے کہ تڑپ جاتا ہے دل
کسی استاد سے تم سیکھے ہو شرمانا بھی

سیکھے ہو = تم نے سیکھا ہے

لیا نہ تخلیہ میں ان کا بوسہ چوک ہوئی
بلا سے مجھ پہ وہ ہوتے اگر خفا ہوتے

جناب حضرت واعظ کا واہ کیا کہنا
جو ایک بات نہ ہوتی تو اولیا ہوتے

نہ رہنے دیگا مجھ کو جوش دل اب دلکش ہرگز
قیامت ہو گیا ہے آپ کا سینہ ابھرنے سے

ویسا ہی جیسے ؎ دست عشاق باز کب آئیں ؛ ہاتھ ٹوٹیں کہا کرے کوئی

تیروں نے غم کے قلب کو کمبخت کر دیا
سوز دروں نے سینہ کو دم پخت کر دیا

بخت نہیں پُخت ہے غلط ہے۔

جھنجھلا کے بولے ان سے جو لپٹا اندھیرے میں
اندھیر اس طرح کا تو دیکھا کہیں نہیں

ابتذال ہے محض اندھیرے اور اندھیر کے لئے شعر کہا گیا۔ مثلاً احسان صاحب)

"ہوا اندھیرے کا بُرا شرم سے کٹ کٹ گئی میں
جس کو لپٹایا تھا میں نے مرا بھائی نکلا"

ایسا شوق نہ کرنا اکبر — گورے کو نہ بنانا سالا
بھائی رنگ یہی ہے اچھا — ہم بھی کالے یار بھی کالا
نیچر نے دیدیا ہے پٹہ رجولیت کا — کیونکر نہ ہوں بتوں سے طالب قبولیت کا

مردی

تخلیئے میں آج میں نے ان کا بوسہ لے لیا — دیکھئے ڈگری جو ہو دعویٰ تو دائر ہو گیا

بتذل اور بازاری ہے۔

جو سن چکے میری غزلیں تو بولے چندہ لا — جو ہنہنایا ہے اتنا تو آج لید بھی کر

اس شعر سے کس قدر تعفن آتی ہے۔ کیسی غلاظت آمیز تشبیہ ہے۔

خلاف شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

بازاری محاورہ ہے اور بازاری معنوں میں ہے۔

گو کہ وہ کھاتے پڈنگ اور کیک ہیں — پھر بھی سیدھے ہیں نہایت نیک ہیں
جب میں کہتا ہوں کہ گیو می کس ڈیر — ہنس کے کہتے ہیں کہ یو مے ٹیک ہیں

ٹیک کے بعد 'ہیں' غلط ہے اس کے علاوہ سب غلط ہے بیکار ہے کوئی خاص بات نہیں۔

سینۂ مس کا ابھار اے دل فساد انگیز ہے — لوگ سچ کہتے ہیں بادنجان باد انگیز ہے

کیسی بھونڈی تشبیہ ہے۔

ہر اک ریمارک آپ کا عقرب کا نیش ہے — مجھ کو بھی رنج غیر کا سینہ بھی ریش ہے
مجھ سے کہا کہ گوز شتر ہے ترا سخن — اس سے یہ کہدیا کہ تو گوبر گنیش ہے

دونوں مبتذل ہیں۔ بازاری ہیں۔ چرکین کے کلام کی بو آتی ہے۔

پیش آجائے جو مسجد تو نمازی بھی سہی
بت جو موقع پہ ملیں دست درازی بھی سہی
گالیاں اُس نے جو دیں وصل کا طالب میں ہوا
کہدیا جان کہ ترکی ہے تو تازی بھی سہی

صرف ترکی اور تازی کے محاورے کے لئے معنے نچھاور کئے گئے ہیں اور لطف یہ کہ محاورہ

بھی غلط معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے   پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ٹچ نہ کرو

(نقطہ = POINT - چھونا = TOUCH) محض دو لفظوں کے استعمال کے لئے کس قدر مبتذل جذبہ کا اظہار کیا ہے۔

لپٹ بھی جا نہ رک اکبر غضب کی بیوٹی ہے   نہیں نہیں پہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

(حسن = BEAUTY، فرض = DUTY) محض قافیوں کے لئے مذاق سلیم کا خون کیا گیا ہے۔

سُدیشی گورنمنٹ سے لچ گئی   یہ باٹی پیپرمنٹ سے پچ گئی

ریاح۔ کتنی لغو اور غیر متین تشبیہہ ہے۔

نہیں بدلی زبان اس شوخ کی یہ کون کہتا ہے
میں جب جاتا ہوں اس کی بزم میں سٹ ڈاؤن کہتا ہے

DOWN - کا تلفظ ڈاؤن ہے۔ کون کا قافیہ غلط ہے۔ اس کے علاوہ دلیل نہایت کمزور ہے اور شعر میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔

کرتے ہیں بائسکل میں خوب وہ دفع ریاح   اب تو بیلن ارغنون کا یہ سواری ہو گئی

کس قدر غیر مذہب مذاق ہے محض پر کوئی کا نتیجہ۔

میں بھی گریجویٹ ہوں تو بھی گریجویٹ   علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ

کیا اچھی فرمائش ہے۔

ٹرخا دیا ہر اک کو مغرب نے پاس کر کے
سید بھی کورے کھسکے برسوں مساس کر کے

⊷⊷⊷
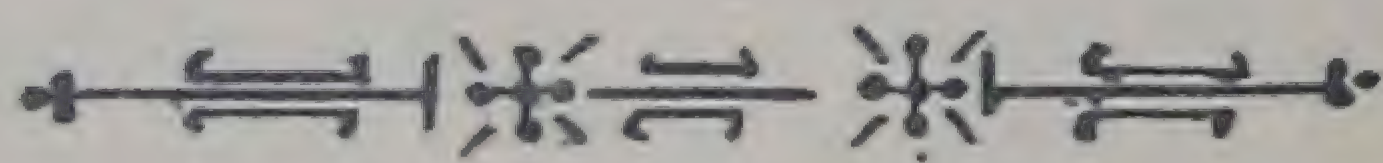
مُصوّری فطرت

کہتے ہیں فطرت جسے یہ ہے نقاب روئے دوست — ہے اسی پردہ میں پنہاں آفتاب روئے دوست

پردہ فطرت خرد افروز و حکمت خیز ہے — ہے جنوں انگیز لیکن آب وتاب روئے دوست

دیکھ لی جس نے جھلک اس کے وہ پہنچا دار تک — زینت ممبر ہوا محو حجاب روئے دوست

ذوق معنی ہو تو اے اکبر نظر آگے بڑھا — عالم نیچر تو ہے لوح کتاب روئے دوست

بہار آئی کھلے گل زیب صحن بوستاں ہو کر — عنادل نے مچائی دھوم سرگرم فغاں ہو کر

بچھا فرش زمرد اہتمام سبزہ تر میں — چلی مستانہ وش باد صبا عنبر فشاں ہو کر

عروج نشہ نشو و نما سے ڈالیاں جھومیں — ترانے گائے مرغان چمن نے شادماں ہو کر

بلائیں شاخ گل کی لیں نسیم صبح گاہی نے — ہوئیں کلیاں شگفتہ روئے رنگین بتاں ہو کر

جوانان چمن نے اپنا اپنا رنگ دکھلایا — کسی نے یاسمن ہو کر کسی نے ارغواں ہو کر

پختہ طبعوں پر حوادث کا نہیں ہوتا اثر
کوہساروں میں نشاں نقش پا ملتا نہیں

جوشش گریہ پیہم کا ہے باعث رخ یار — جزر و مد ہو نہ سمندر میں اگر ماہ نہ ہو

ہو نمود اور حسینوں کی چلے جائیں جو آپ — رونق آجائے کواکب میں اگر ماہ نہ ہو

محو تمکین رہے نفرت ہو سبک وضعی سے — صورت کوہ ہے انسان صفت کاہ نہ ہو

خدا ہی جانے کتنے قالبوں میں مشترک ہوگی
یہ خاک جسم بھی دنیا میں تیری ہو نہیں سکتی

فنا کا دور جاری ہے مگر مرتے ہیں جینے پر — طلسم زندگانی بھی عجب اک راز فطرت ہے

دام ہستی کی بھی ترکیب عجب رکھی ہے — جو پھنسے اس میں وہ پھر جان بچا ہی نہ سکے

یہاں بیداریوں سے خون دل آنکھوں میں آتا ہے
گلابی کرتی ہے آنکھوں کو واں تاثیر سونے کی

سر خاک شہنشاہان عالم کہتی ہے عبرت — قدم رکھے بچا کر آئے جو شہر خموشاں میں

جب واقعات اصلی پیش نظر نہ آئے — شاعر نے کام رکھا تحسین و آفریں سے

الفاظ نے سنور کر اپنے قدم جمائے — نیچر نے کی گذارش رخصت ہوں میں یہیں سے

حسن نور شمع ہر محفل میں ہر شب ہے وہی — موسم باراں میں لیکن کثرت پروانہ ہے

خانہ ہستی کے ٹکڑے اڑ رہے ہیں نزع میں — پھینکئے اب کوٹ کو تہ کیجئے پتلون کو

اس بحر میں ہوں مثل حباب اے خم ہستی — طوفان میری کشتی کو ڈبو ہی نہیں سکتا

شور بلبل جوش گل موج نسیم انوار صبح — اللہ اللہ کس قدر ہیں دلکشا آثار صبح

چھیڑا ہے راگ بھونرے کا ہوا کی ہے نئی دھن بھی
غضب ہے سال کے بارہ مہینوں میں یہ پھاگن بھی

یہ رنگ حسن گل یہ نغمۂ مستانہ بلبل
اشارہ کرتی ہے فطرت ادھر آ دیکھ بھی سن بھی

ہوئے روشن یہ معنی چاند کیوں شاعر کو پیارا ہے
کمال اس میں یہ ہے عارض[1] بھی ہے ابرو[2] بھی ناخن[3] بھی

[1] بدر۔ [2] پہلے ہفتہ کا چاند۔ [3] و نیس ۲۹ کا چاند۔

مفلسی میں بھی تکلف دوست ہے طبع بلند
سرو بستاں بے بضاعت ہے مگر خوش پوش ہے

غضب کی آتش فشاں ہوا ہے پڑے ہیں بستر پہ جل رہے ہیں
عرق میں ڈوبے ہوئے سراپا تڑپ رہے ہیں ابل رہے ہیں

عامل ہے ہوا باغ کی معمول ہے مٹی — مٹی ہے کبھی پھول۔ کبھی پھول ہے مٹی

عامل معمول مسمریزم کی اصطلاحات ہیں۔

منتشر رہنے میں پاتے ہیں اب آرام حواس — شوق مجموعہ ہوش خرد افزا نہ رہا

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں — اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی خوش رنگ چست نازک پیاری — پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برق کی طبیعت کا ابھار — تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم
وہ بھی ہے بلا زیادت کم قائم
گو تابع جوشش برق پروازی ہیں
دونوں کے خطوط طیر متوازی ہیں
کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے
اللہ اللہ کیا ہنر مندی ہے
ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں
فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں
کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں
پریاں اِندر کی جس سے شرمائی ہیں
اِس سمت اگر خیال انسان بڑھ جائے
دامان نظر پہ رنگ عرفاں چڑھ جائے

یہ نظم نظم معریٰ ہے یعنی BLANK VERSE جس میں وزن تو ہے مگر ردیف قافیہ کچھ نہیں ہے۔

چلا جاتا تھا اک ننھا سا کیڑا رات کاغذ پر
بلا قصد ضرر اس کو ہٹایا میں نے اُنگلی سے
مگر وہ ایسا نازک تھا کہ فوراً پس گیا بالکل
نہایت ہی خفیف اک داغ کاغذ پر رہا اس کا
ابھی وہ روشنی میں شمع کی کاغذ پہ پھرتا تھا
لیا میرے سوا نوٹس ہی کس نے اُس کا دنیا میں

نوٹس لینا۔ خیال کرنا۔ TO TAKE NOTICE

نہ تھی فطرت کی کیا کاریگری اس کے بنانے میں
نسب نامہ بھی اس کا عالم ذرات میں ہوگا
یہی تھی اس کی ہستی اور اس میں اس کی مستی بھی
نہ ماتم کرنے والا ہے نہ لائف لکھنے والا ہے

لائف (LIFE) = حیات۔

وہ دھبا درس عبرت دے رہا ہے مجھکو اے اکبر
معاذ اللہ کیا سمجھا ہے تو نے اپنی وقعت کو
تجھے بھی صفحہ روئے زمین سے ایک دن آخر
مٹا دے گی کوئی تحریک فطرت حکم باری کی
عجب حیرت سے میں ہوں دیکھتا اس داغ کاغذ کو
مرے نظروں میں تو نقشہ یہ ہے دنیائے فانی کا

داغ = دھبا

صریحاً جسم تھا اک جان تھی احساس تھا اس میں
اور اب دھبا سا ہے کیا جانے کوئی کیسا دھبا ہے

معاذ اللہ معاذ اللہ سنانے کا عالم ہے
بہت جی چاہتا ہے روؤں اس ہستی کے دھبے پر

اصل کاغذ جس پر دھبا ہے حسن نظامی دہلوی لے گئے۔ اس کا فوٹو انھوں نے چھاپا ہے۔

یہ ہیں برسات کے دن تیسری بھادوں گزرتی ہے
میں اپنا غم غلط کرتا ہوں کچھ اشعار لکھنے سے

جلوہ عیاں ہے قدرت پروردگار کا
کیا دلکشا یہ سین ہے فصل بہار کا

نازاں ہیں جوش حسن پہ گلہائے دلفریب
جوبن دکھا رہا ہے یہ عالم اُبھار کا

ہیں دیدنی بنفشہ وسنبل کے پیچ و تاب
نقشہ کھچا ہوا ہے خط زلف یار کا

سبزہ ہے یا یہ آب زمرد کی موج ہے
شبنم ہے بحر یا گہر آبدار کا

مرغان باغ زمزمہ سنجی میں محو ہیں
اور ناچ ہو رہا ہے نسیم بہار کا

پرواز میں ہیں تیتریاں شاد و چست و مست
اک ساز دلنواز ہے مضراب و تار کا

ابر تنک نے رونق موسم بڑھائی ہے
غازہ بنا ہے روئے عروس بہار کا

بدلی ہوئی رُت محسوس ہوئی بھونرے کی بھی آواز سُنی
فطرت کی بسنتی یہ ٹھمری بے ساختہ و بے ساز سُنی

طوفان جوش دل کی آنسو میں ایک جھلک ہے
موتی میں کیا دھرا ہے بس ایک بوند پانی

دور کوہ لب ساحل سے جو گزری اک موج
کوہ نے اس سے کہا تو نے یہ دیکھا مراد وج

مجھ سے مل کر تجھے جانا تھا برائے دم چند
بولی سالک کبھی کرتے نہیں ساکن کو پسند

ہیں بڑے آپ مگر اپنی جگہ سے ہیں اٹل
اپنی رفتار میں کیا فائدہ ڈالوں میں خلل

ہنس کے اس بحث پہ بولا کسی جانب سے حباب
پوچھئے موج سے ہے بھی اسے رک جانے کی تاب

اپنے بس ہی میں نہیں ہے یہ تعلی کیسی
اضطراری ہے روش شان ارادی کیسی

بہ گئی موج یہ کہہ کر کہ میں مغرور نہیں
تجھ میں اے کوہ مگر روشنی طور نہیں

بلبلا ٹوٹ گیا کوہ بھی خاموش رہا
وہ ہی حیرت رہی دریا کا وہی جوش رہا

مُصوّری جذبات

بے ساختہ رہتی ہے مصیبت میں یہ لب پر / فطرت ہی کی جانب سے دعا بھی ہے کوئی چیز

دل کو بے عشق حقیقی نہیں ہوتی حرکت / وہیں چلتی ہے یہ کشتی کہ جہاں تھاہ نہ ہو

پھنسی جسم خاکی میں روح لطیف / اسیر کمند ہوا ہو گئی

وقت پیری آگیا اکبر جوانی ہو چکی / سانس لینا رہ گیا اب زندگانی ہو چکی

جلوۂ معنی کا تو صورت کا اثر کیا / بلبل گل تصویر کا شیدا نہیں ہوتا

خدا پناہ میں رکھے کشاکش غم سے / اسی سے تار نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل / پر کروں کیا یونہی تسکین ذرا ہوتی ہے

یہ اضطراب یہ بے چینیاں یہ بیتابی / مجھے ہمیشہ ہے بجلی کو ایک پل کیلئے

مریض غم کیا کرتا ہے ضبط نالہ ہمت سے / مگر منہ زرد ہو جاتا ہے جب کروٹ بدلتا ہے

بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں / کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

لندن کو چھوڑ لڑکے اب ہند کی خبر لے / بنتی رہیں گی باتیں آباد گھر تو کر لے

راہ اپنی اب بدل دے بس پاس کر لے چل دے / اپنے وطن کا رخ کر اور رخصتِ سفر لے

واپس نہیں جو آتا کیا منتظر ہے اس کا / ماں خستہ حال ہو لے بے یاد باپ مر لے

مغرب کے مرشدوں سے تو پڑھ چکا بہت کچھ / پیران مشرقی سے اب فیض کی نظر لے

میں بھی ہوں اک سخنور آ سُن کلام اکبر / اِن موتیوں سے آ کر دامن کو اپنے بھر لے

عشرت صاحب کو لکھا تھا۔

عفو کن یارب اگر تقویٰ نماند بر مزار / دل بہ پہلو ہست و کارم با شباب افتادہ است

کمال شوق میں صرف اک نظارہ کافی ہے / حسین خود ہی ہے عاقل اشارہ کافی ہے

جس طرح ہے تجھے الم جسم کی تمیز / دیکھے گا درد جان کو بھی اک دن تو اے عزیز

بھوک سے زائد ہو جس کے پاس کھانا اُسکے پاس / اتنی دولت بن کر رکھنے کی جگہ ملتی نہیں

پڑا ہے قحط بشر مر رہے ہیں فاقوں سے
خوشی ہو گیا مجھے شبرات میں پٹاخوں سے

کبھی ہوئی ہے طبیعت یہ روشنی ہے فضول
اتار لیجئے صاحب چراغ طاقوں سے

خط میں کیا لکھا ہے قاصد کو کیا خبر اس کی
پوچھتا ہے مجھے انعام ملے گا کہ نہیں

اک طرف دام ترقی اک طرف موج شراب
ہر طرح حاضر ہیں ہم کہئے پھنسیں کہئے نہیں

بیان اپنی مصیبت کا تھا مجھے منظور
خیال تھا سوئے تشبیہہ جستجو میں تھیں

ہوئی جو ٹائی ٹنگ غرق کہدیا میں نے
کہ دل مرا تھا اور اس دل کی آرزو میں تھیں

ئے ٹنگ ٹکڑے ہوا ٹکرا کے آتش مرگ سے
دب گیا سائنس بھی آخر پیام مرگ سے

ایک جہاز کا نام ہے جس میں پندرہ عمائدین بوڑھے بچے عورت مرد ساحل کے دس میل کے اندر غرق ہو گئے۔ جہاز بنانے والے کا دعوے تھا کہ برف کی بڑی سے بڑی چٹانیں اور موجوں کے زبردست سے زبردست طوفان بھی اس کو نہیں دبا سکتے۔ کیا اچھا نتیجہ نکالا ہے۔

کیوں جلا رکھا ہے اس دور نے پیری میں مجھے
ستم غیر ضروری یہ فلک کا دیکھو

کیا گردوں نے نہیں غیر ضروری یہ بات
اپنے مٹنے کا بتدریج تماشا دیکھو

خانۂ اُمید آتا ہے نظر اُجڑا ہوا
دل کو حسرت ہے کہ یا اللہ کیا تھا کیا ہوا

جُدا رہتا ہوں گو تم سے مگر دل خوش نہیں رہتا
جو بس ہوتا جہاں رہتے ہو تم میں بھی وہاں رہتا

یہ چاہتا ہوں طبیعت کو انتشار نہ ہو
کسی پہ بار نہ ہوں کوئی مجھ پہ بار نہ ہو

بیان وے اثر میں جس کی قوت لا نہیں سکتا
زبانیں کہہ نہیں سکتیں دلوں پر جو گزرتی ہے

حواس و ہوش رخصت ہو چکے دم بھی نکل جاتا
تو فطرت کے جو قرضے ہیں وہ سب بیباق ہو جاتے

ادا ہو جاتے۔

ایک ایک قطرہ کا مجھے دینا پڑا حساب　　خون جگر ودیعت مژگان یار تھا

میں چاہتا ہوں کہ بس ایک ہی خیال رہے　　مگر خیال سے پیدا خیال ہوتا ہے

تمناؤں کی حالت کچھ نہ پوچھو دل کے بجھنے پر
اندھیرے میں نہیں معلوم پروانوں پہ کیا گزری

طلب تحسین کی کیوں تجھ کو ہے بزم حریفاں میں
سرور طبع خود ہے داد تیرے خوش کلامی کا

جوانی نے تو اپنے واسطے ہم کو اٹھایا تھا　　بوڑھاپا تو بٹھائے اب خدا کے واسطے ہم کو

تازگی طبع کی ممکن ہی نہیں ہجر کی شب　　قصہ سن کر بہ تکلف کوئی سو جائے تو کیا

مذہب
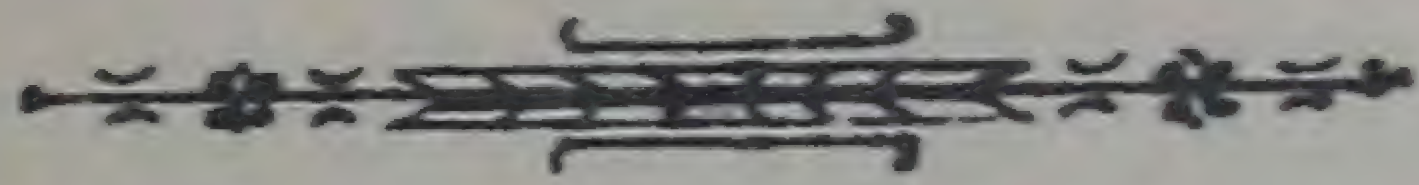
موت کے عشووں کے آگے بارِ منطق کچھ نہ تھا
دل کو مذہب کے قدم پر سر کو دھرنا ہی پڑا

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا
دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

وہ بھی نافہم ہے جو خضر کا طالب نہ ہوا
وہ بھی نافہم ہے جو خضر کو منزل سمجھا

خوبیٔ مذہب دمِ آخر کھلی
نزع میں مونس فقط ایمان ہے

اُمیدِ حور میں مسلم تو ہو گیا ہوں مگر
خدا ہی ہے کہ جو مجھ سے یہ پنجگانہ چلے

عہدِ طفلی سے ہے مذہب میں گرفتاریٔ دل
ساتھ ساتھ اپنے بڑھا کی ہے یہ بیماریٔ دل

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گذر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ

کعبے سے بت نکال دیئے تھے رسولؐ نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

جب علم گیا تو شوقِ عزت معدوم
دولت رخصت تو ذوقِ زینت معدوم

مسجد سے یہ آئی گوشِ اکبر میں صدا
مذہب جو مٹا تو زورِ ملت معدوم

مذہب ہے گم ترقیٔ یورپ کے سامنے
معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی

لیکن وہ آفتاب ہے اور یہ ہے مثلِ ابر
ابرِ غلیظ سے ہے نہاں آفتاب بھی

مرد کو چاہیئے قائم رہے ایمان کے ساتھ
تادمِ مرگ رہے یادِ خدا جان کے ساتھ

میں نے مانا کہ تمھاری نہیں سنتا کوئی
سر ملانا تمھیں کیا فرض ہے شیطان کے ساتھ

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت
تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

ترجمہ ۔ یکے از اکابر یورپ سنہ ۱۸۹۰ء ۔

ہلائیں کس طرح سر صدر پر نزلہ ہے مذہب کا
بہت اونچے سروں میں بچ رہی ہے اب تو گت اُن کی

مگر قومی اطبا دور ہی کر دیں گے یہ نزلہ
قویٰ اطفال کو کر دے گی آخر تربیت اُن کی

تماشا دیکھئے بجلی کا مغرب اور مشرق میں
کلوں میں ہے وہاں داخل یہاں مذہب پہ گرتی ہے

یاروں کو فکر روزِ جزا کچھ نہیں رہی
بس کام ہے انھیں رہ عیش و نشاط سے

کہتے ہیں حرج کیا ہے جو تاریک ہے وہ پُل
بائیسکل پہ گذریں گے ہم پُل صراط سے

ہے نور خدا بھی طالب رزق کا دوست ڈاڑھی بھی تو پیٹ کی طرف جاتی ہے

ہیں ہوا پر کفر کے گیسو پریشان ان دنوں
کوئے دل میں کیونکر آئے بوئے ایمان ان دنوں

کھو دیا تمکین دیں کو تو نے اے شوق نمود عزت اصلی نثار نام عزت ہو گئی

یہ صندوق کتب بھاری ہے یارب اٹھ نہیں سکتا
یہ ہے مذہب تو مجھ سے بار مذہب اٹھ نہیں سکتا

چارپائے بروکتابے چند

یہ شان بے نیازی اور یہ بیگانہ فطرت گلا گیا مرگ ہاشم[1] کا وہی کیا تھا ہمیں کیا ہیں

[1] لسان العصر کا چودہ برس کا جوان بیٹا۔

اسی حیرت میں عمریں کٹ گئیں ارباب بینش کی کسے اللہ کہئے اور کس کو ما سوا کہئے

صداقت کے نشاں اس مصرعۂ اکبر سے ملتے ہیں
کلیں سائنس سے چلتی ہیں دل مذہب سے ہلتے ہیں
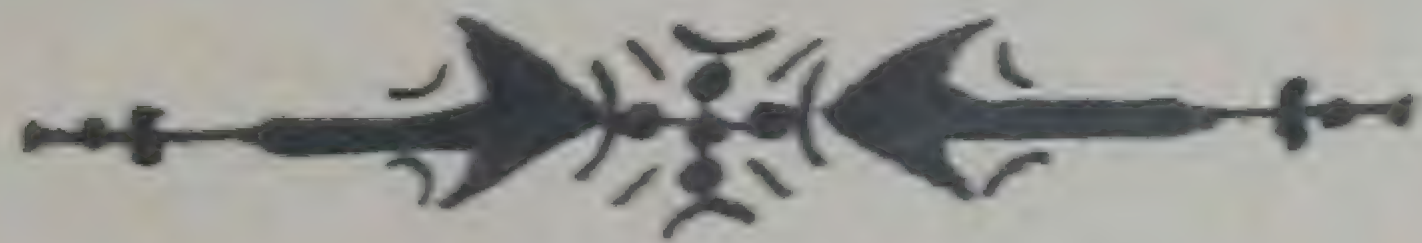
منقبت

عاشق جو آستانہ مشکل کشا کی ہے
تابش مری جبیں پہ نور خدا کی ہے

حب علیؓ سے ہوگی دلوں کو شگفتگی
کلیوں کو احتیاج نسیم وصبا کی ہے

روبہ مزاجیان سگ دنیا کی دیکھ لیں
حسرت بس اب زیارت شیر خدا کی ہے

صورت شگفتہ ہر گل رنگیں قبا کی ہے
مستانہ چال باغ میں باد صبا کی ہے

پھولوں سے لو لگائے ہے باد صبا کی لے
دمساز تان بلبل شیریں نوا کی ہے

سبزہ لہک رہا ہے بصد انبساط طبع
سنبل میں تاب یار کی زلف دوتا کی ہے

مرغان باغ وجد میں ہیں فرط شوق سے
ڈوبی ہوئی مزے میں طبیعت ہوا کی ہے

آراستہ ہے ایک طرف بزم مومنین
کثرت لبوں پہ حمد و درود و دعا کی ہے

پوچھا جو اس سماں کا سبب بول اٹھے ملک
پیدائش آج حضرت مشکل کشا کی ہے

جناب فاطمہؓ کے مرتبے کا کیا کہنا
ہمیشہ چاہیئے ان پر درود خواں رہنا

جناب حیدر کرارؓ کی ہیں وہ بیوی
حسنؓ حسینؓ کی ماں اور رسولؐ کی بیٹی
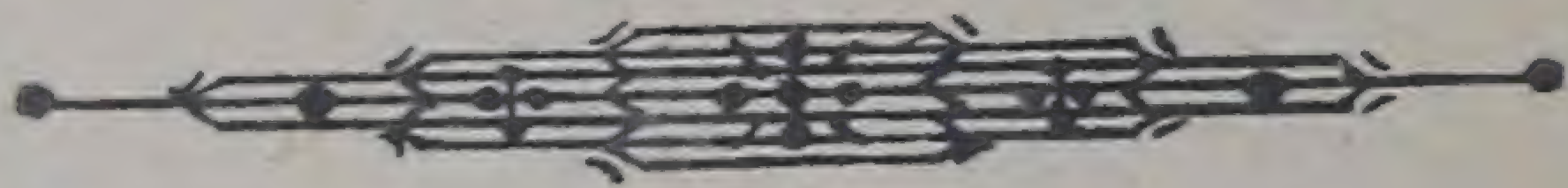
معاشرت

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

مے انھوں نے پی اب اُن کے پاس کیونکر دل لگے
جانور اک رہ گیا انسان رخصت ہو گیا

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق اتنا ہے
اسے کشتی نہیں ملتی اسے ساحل نہیں ملتا

کہاں کی پوجا نماز کیسی کہاں کی گنگا کہاں کی زمزم
ڈٹا ہے ہوٹل کے در پہ ہر اک ہمیں بھی دو ایک جام صاحب

عزیزان وطن سوچیں سول سروس سے کیا حاصل
یگانوں میں رہے بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

فتنہ نہیں فساد نہیں شور و شر نہیں
یاں زن نہیں زمین نہیں اور زر نہیں

مانا کہ ہر طرح سے میں بے اختیار ہوں
پر یہ بتاؤ تم کو خدا کا بھی ڈر نہیں

کچھ نہ ہاتھ آئے مگر عزت تو ہے
ہاتھ اس مس سے ملانا چاہیئے

لطف ساقی سے نہ چھلکے جام دل
ظرف عالی کی یہی پہچان ہے

اونچا نیت کا اپنی زینہ رکھنا
احباب سے صاف اپنا سینہ رکھنا

غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبر
لیکن ہے شدید عیب کینہ رکھنا

غفلت کی ہنسی سے آہ بھرنا اچھا
افعال مضر سے کچھ نہ کرنا اچھا

اکبر نے سنا ہے اہل غیرت سے یہی
جینا ذلت سے ہو تو مرنا اچھا

ہر چند محل انقلابات رہا
گھٹنے بڑھنے کا پیچ دن رات رہا

چھوڑی نہیں منزلیں قمر نے اپنی
ذی رتبہ و صاحب مقامات رہا

خواہش ہے اگر تجھے غنی بننے کی
دولت کی ہوس ہے اور دھنی بننے کی

شخصی حالت کو چھوڑ کر اے ہندی
کوشش لازم ہے کمپنی بننے کی

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی
ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی

کچھ پڑھکے تو صنعت و زراعت کو دیکھ
عزت کے لئے ہے کافی اے دل نیکی

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے

لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

آگاہ ہوں معنی خوش اقبالی سے
واقف ہوں بنائے رتبۂ عالی سے

شرطیں عزت کی اور ہیں اے اکبر
چلتا نہیں کام صرف نقالی سے

پاکیزگی نفس کی دشمن مے ہے
انسان کو خراب کرنے والی شے ہے

شیطان کی ہے پرائیویٹ سکرٹیری
مُسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

پاتی ہیں قومیں تجارت سے عروج
بس یہی ان کے لئے معراج ہے

ہے تجارت واقعی اک سلطنت
ناز یورپ کو اسی کا آج ہے

لفظ تاجر خود ہے اے اکبر ثبوت
دیکھ لو تاجر کے سر پر تاج ہے

تجھے انگلش سے جب موقع نہیں ہے گرم جوشی کا
تو پھر کیا لطف ہے اے ہم نفس اس بادہ نوشی کا

تکلف سے جواب اس نے دیا بس کر کہ اے اکبر
ادا کرتا ہوں میں یہ حق فقط پتلون پوشی کا

ہرگز نہیں ہم کو سلطنت کا افسوس
ہے ابتری معاشرت کا افسوس

انگریزوں پہ ہے بہت کم الزام اس کا
ہے اپنے ہی سیل معصیت کا افسوس

داخل مری دانست میں یہ کام ہے پُن میں
پہنچائے گا قوت شجر ملک کے بُن میں

تحریک سودیشی پہ مجھے وجد ہے اکبر
کیا خوب یہ نغمہ ہے چھڑا دیس کے دھن میں

چو مسٹر نباشد ترا میزبان
چہ بر میز خوردن چہ بر روئے خوان

نیچریت چیست از دین گم شدن
نے قمیص و کوٹ و پتلون و بٹن

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ ناولہا
کہ قرآں سہل بود اول و لے افتاد مشکلہا

بکن تزئین پائے خود ز بوٹ ڈاسن و پتلون
کہ سر سید خبر دارد ز رسم و راہ منزلہا

تہذیب مغربی کی بھی ہے وارنش غضب
ہم کیا جناب شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے

دست و پا بستہ ہوں میں ظاہر کوئی گن کیا کروں　　دوسروں کے بس میں ہوں فکر تمدن کیا کروں
روٹی ملے جو سکھ سے کافی ہے اللہ اللہ　　ظلمت کدہ ہے دنیا ہر شے کو کیوں ٹٹولو

نہ اس میں دخل منطق کو نہ دولت کو نہ طاقت کو
دلی حالت خدا ہی کی عنایت سے سنبھلتی ہے

یہ معذرت تو ملاقاتیوں سے آپ کریں　　مجھے تو کام فقط آپ کے سلام سے ہے
سایۂ مغرب میں شوق دل نے پھیلائے تو پاؤں　　چار ہی دن میں مگر پتلون ڈھیلی ہو گئی
پیٹ سے دل نے کہا درجہ ہمارا ہے بڑا　　ساغرِ جمشید ہم ہیں تو ہے بنئے کا گھڑا
پیٹ بولا اصطلاحیں تری سب منسوخ ہیں　　ہم ہیں اب غزنی گدام اور تو ہے غزنی جھونپڑا
بے گزٹ ہو کے جو رہئے تو محلے میں حقیر　　با گزٹ ہو کے جو چلئے تو فرشتوں میں خفیف
کیسے چکر میں بزرگوں کو پھنسا رکھا ہے　　حضرت پیر فلک بھی ہیں عجب ذات شریف
نئی مخمل کی نکٹائی تو گویا طوق گردن ہے　　وہی بتخانہ اچھا تھا وہی زنار اچھی تھی
اکثر یہی ہے حالت قانون مغربی　　آزادیوں کی قید میں روح ان کی ہے پھنسی
پکچر ہے اس طرف تو اُدھر بیہشتی بھی ہے　　اس سمت ناچ ہے تو ادھر خودکشی بھی ہے
تعلیم عورتوں کو ضروری ہے لاکلام　　لیکن جو یہ اثر ہے تو بس دور سے سلام
ہم کو کمال شوق سے تعلیم دیجئے　　لیکن کچھ اپنے گھر کی بھی اصلاح کیجئے
ہم فائدہ اٹھائیں گے مغرب کے راج سے　　لیکن پناہ مانگیں گے ایسے رواج سے
وطن دیس کی تھی جب یہ گاتا تھا اک دہاتی　　بسکٹ سے ہے ملائم پوری ہو یا چپاتی
قیمت کو شرح سے بڑھ کر دیتے ہیں ٹھرے کے دام　　بے حسی کا میکدہ ہے غفلتوں کا دور ہے

ہر چند ہے کہ مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کے بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن
اس شوخ کے گھونگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

"آگرہ میں مقدمہ ہوا تھا۔ ایک میم نے اپنے شوہر کو زہر دیدیا۔ ایک صاحب نے اپنی میم کو قتل کیا"

حال مسز کلاک و مسٹر فلم کھلا
تھا کل بیان پیش عدالت کھلم کھلا

بتخفیف تشدید بہ ضرورت۔ شعر

ان کو کرایا قتل اور ان کو پلایا زہر
تہذیب مغربی کی یہ تکمیل اور قہر

پردے پہ اعتراض ہو اور زہر ہو دوا
پالیگمی پہ طعن ہو اور یہ ستم روا

تعدد ازدواج۔ ایک سے زیادہ بیوی رکھنے کی شرعی اجازت۔

لاکھوں مقدمات ہوئے بعض کھل گئے
گذرا زمانہ یاد کے دامن سے دھل گئے

فتنے کا ہے قصور نہ مفتون کا قصور
سب کچھ ہے یہ خرابی قانون کا قصور

پردہ نہیں طلاق میں آسانیاں نہیں
جائز کہیں تعدد ازواج یاں نہیں

فطرت کا اقتضا جو ہے وہ کس طرح رکے
پھر کیوں گناہ جرم کی جانب نہ دل جھکے

آسان ہو طلاق تو دل شاد کیجئے
بے قتل غیر اپنا گھر آباد کیجئے

پردہ جو ہو تو ایسے مواقع بھی کم ملیں
کیوں بزم مے میں شوخ نگاہیں بہم ملیں

قانون میں روا ہو اگر دوسرا نکاح
پھر کیوں یہ قتل زوجۂ اولی کا ہو مباح

جائز شرعی طور پر۔

جب پردہ و طلاق و تعدد روا نہیں
پھر بدمعاشیوں کے سوا کچھ دوا نہیں

جانیں ہزار جاتی ہیں بچے بلکتے ہیں
مستان مے جگہ سے بھلا کب سرکتے ہیں

مغرب کا دل جو خواہر مشرق کے ساتھ ہے
یہ بھی گھروں میں ان کے لئے ملتی ہاتھ ہے

خواہر مشرق۔

بس ظاہر نمود چمک اور ادا میں ہے
دل کی خبر نہیں ہے کہ وہ کس ہوا میں ہے

محاورات

بے عشق کے جوانی کٹنی نہیں مناسب
کیونکر کہوں کہ اچھا ہے جیٹھ کا نہ تپنا

چودھویں منزل میں وہ ماہ خوش اقبال آگیا
صبر و تقوے پر جو بھاری ہے وہی سال آگیا

کرگئی کام نگاہ بت پرفن کیسا
تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

کہیں گے تعمیل ذات پر ہو نشان دو یا پتہ بتاؤ
بتوں کے آگے ہے سخت مشکل خدا کو اپنا گواہ کرنا

واعظا تیری زبان پر ہے مذمت مے کی
یہ سخن تیرا گلوگیر ہوا چھو کی طرح

یہ تھی قسمت رزق جو ٹوٹے دانت
غرض کوڑی کوڑی ادا ہو گئی

ہوتا ہے نفع یوروپین نان پاؤ سے
میں خوش ہوں ایشیا کے خیالی پلاؤ سے

مرا سوز دل آپ کیا دیکھتے ہیں
یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے

درگاہ جانے والے ہیں غیروں کے ساتھ وہ
گھی جل رہا ہے آج تو گھر گھر چراغ میں

رخصت ہو جو علم دیں تو پھر دین بھی جائے
گل ہو جو چراغ ابھی ہو پگڑی غائب

شراب دولت سے مست ہیں وہ مئے قناعت سے ہم ہیں سرخوش
نہیں ہے کچھ باہمی تعلق وہ اپنے گھر خوش ہم اپنے گھر خوش

دنیا کی حرص و آز کا واعظ شہید ہے
گو پیر ہو گیا ہے مگر زن مرید ہے

شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا
وہ شش ہے نے غاسی میں آٹا گیلا کر دیا

کرو نہ تعمیر گھر کی اکبر حدود میونسپل کے اندر
یہ اہل کاران بد دیانت بنیں گے پھوڑا بغل کے اندر

شاید امپرومنٹ ٹرسٹ کی طرف اشارہ ہے

نہیں ان کو کچھ شرم لاحول قوم
یہ ملحد تو چکنے گھڑے ہو گئے

"پانی پڑا پھسل گیا"

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے
زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

چندوں کے سوجھتے ہیں ان کو مضموں — دل شاد ہوا اس سے قوم یا ہو محزوں
لڑکے انھیں دیکھکر مچاتے ہیں دھوم — ہیں یہ نئی روشنی کے چندا ماموں

شوق لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو — اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

اک برگ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کچھ خبر نہیں اے ڈالیو تمھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں

کہیں اس عہد میں دو دل نظر آتے نہیں ایک — اثر معنے یک جان و دو قالب نہ رہا

کل جو رچرخ مرے ہی حصہ میں آپڑا — دنیا پڑی تھی پر وہ مجھی پر برس پڑا

محاورات کو بدلیں "براہ ریل" جناب — "ٹکٹ بدست" کہیں اب بجائے پا بہ رکاب

بھروسا باغ ہستی میں نہیں کچھ نخل قامت کا
نفس کیا ہے ہوا کی بیل ہے دھوکے کی ٹٹی ہے

ظاہر ہوئی کمیٹی و کالج کی اک لکیر — آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

مجبور بدل جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں
یکتائی کا دعوے خوب نہیں اللہ کے بندے او[ر] بھی ہیں

خدا جانے مرا کیا وزن ہے ان کی نگاہوں میں — سنا ہے آدمی کو وہ نظر میں تول لیتے ہیں

ساتھی ملے جب ایسے نازک خیالیاں کیا — سینا ہے جب گزی کا سوئی مہین کیوں ہو
"جیسا دیس ویسا بھیس" ٹاٹ پر موبخ کی بخیہ نہیں ہوتی۔

گو سانس چل رہی ہے خون اب نہیں جہنده — مشرق بدست مغرب مردہ بدست زندہ

جب غم ہوا چڑھا لیں دو بوتلیں اکٹھی — ملا کی دوڑ مسجد اکبر کی دوڑ بھٹی

وعدۂ بوسہ ابرو کا نہ گرخیر سے ذکر — دل لگی میں کبھی تلوار بھی چل جاتی ہے

شیران شرق کا انھیں منظور ہے شکار — بھینسے بندھے ہوئے ہیں ترقی کے شوق کے

میں نے تو جل کے کہدیا اس سال جون میں
ٹٹی اگر نہیں نہ ہو خس کم جہان پاک

نہیں ہے کچھ شکایت مندروں کی — کہ جیسی روح ہے ویسے فرشتے

جب اک بھائی تھے اس منصب پہ ممتاز　　تو پھر کیوں آپ نے کی جست و پرواز

ووٹ بازی کے متعلق۔

لگے کہنے کہ رہنے دیجئے پند　　مرا بس کیا مریداں می پرانند

پیراں نمی پرند مریداں می پرانند

اس کا گھوڑا جس کی کاٹھی　　بھینس اسی کی جس کی لاٹھی

روز بٹھا دے تھانے تھانے　　دنیا دیکھے دنیا مانے

تجھ کو تو ہے خالی چھپنا　　اس سے اچھا ہر کو جپنا

بھیجی جو تم نے مجھ کو لیچی　　شربت کی نظر ہے اس سے نیچی

منہ میں رکھ کر جو میں نے چوسا　　بولی یہ زباں کہ واہ موسے

موسیٰ۔ محمد موسیٰ صاحب برادر خورد مولوی احمد علی صاحب۔ ایم۔ اے۔

موسا۔ موس لیا۔ دھوکا دے کر سارا مال لے گئے۔

عدو کے شست سے بچتے نہیں ہیں　　یہ کالے ہیں مگر کوّے نہیں ہیں

ہندوستانی کالے تو ہیں مگر کوّے کی طرح سیانے نہیں ہیں۔
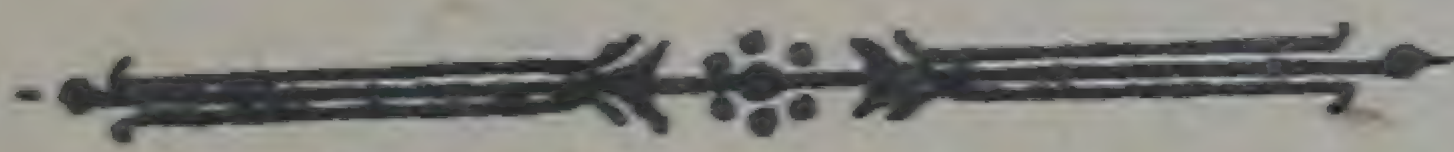
مادہ پرستی

منکر ہیں روح کے جو یہ اہل غرور
اک امر ہے پوچھنا ہیں ان سے ضرور

بے فہم و خرد کا تم کو دعوے یہ کہو
پیدا ہوا مادے میں کیوں کر یہ شعور

رکھو جو مقابل اس کے سارا عالم
دنیا بخدا ہے ایک ذرے سے بھی کم

اس اک ذرے میں ہے ہماری کیا اصل
نا فہم ہیں کر رہے ہیں نا حق ہم ہم

مخلوط کرو نہ نفس و نیچر کو بہم
گو فہم نے بھی لیا ہے نیچر سے جنم

جو بھوک لگے زبان کو وہ ٹھیک نہیں
نافع وہ طعام ہے کہ طالب ہو شکم

اللہ کا صدق دل سے جو طالب ہو
حیرت نہیں گر ملک کا ہم قالب ہو

ہرگز نہ بڑھیں گے اس سے نیچر کے مرید
ممکن نہیں جسم روح پر غالب ہو

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھا ہے اس نے برق کو اور بھاپ کو

برق گر جائے گی اک دن اور اڑ جائے گی بھاپ
دیکھنا اکبر بچائے رکھنا اپنے آپ کو

چیخے، چلائے، کودے، اچھلے، ہٹے لے
ہر پھر کے وہیں رہے جہاں تھے پہلے

حالت تو یہی ہے بلکہ اس سے بدتر
یوں منہ سے جو جس کے دل میں آئے کہہ لے

ہوائے ایجاد رنگ ملت کو ہر روش پر بدل رہی ہے
جو بات بگڑی بنے وہ کیونکر جو چل گئی ہے وہ چل رہی ہے

جو قوم ہمسایہ ہے نمازی نہیں ہے اس پر بلا یہ طاری
ہم اپنی مستی میں گر رہے ہیں وہ ہوش میں ہے سنبھل رہی ہے

ہم اپنی صورت بگاڑتے ہیں بنا رہی ہے وہ اپنے گھر کو
ہم اپنا نقشہ مٹا رہے ہیں وہ اپنے سانچے میں ڈھل رہی ہے

زبان اکبر میں کب یہ قدرت کہ کہہ سکے راز سوز حسرت
وہ شمع اس کو بیاں کرے گی جو قبر سید پہ جل رہی ہے

وہ ہنس کے بولے جگہ کہاں ہے دکھاؤں کاریگری جو اپنی
کہا تھا منکر سے میں نے اک دن بنا تو لے آسمان اپنا

اب مادہ کے چھاننے والے ہی رہ گئے — روحانیات کا وہ اکھاڑا نکل گیا
جان ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی — موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا
شارح دیوان ہستی ہے قیاس مغربی — ہے ازل بھی تجربوں کے زیر فرماں ان دنوں
نہ راز آسمان جانا نہ کچھ حال زمیں جانا — رہیں بحثیں بہت اور درحقیقت کچھ نہیں جا[نا]

ذروں کو ملا کر ذروں سے صناعی کی عزت پاتے ہو تم
کس درجہ کا حق حاصل ہے انھیں جو دل کو ملاتے ہیں دل سے

ڈارون صاحب یہ اچھا مسئلہ سمجھا گئے — دعوے مخدومیت میں مست ہر لنگور ہے
یعنی انسان بندر تھا بتدریج فیض ارتقار سے انسان ہوگیا۔

کبھی سائنس کے ان کے دیوتاؤں سے ذرا پوچھو
یہ مشت خاک کیونکر جان کے سانچے میں ڈھلتی ہے

وہی بیخ شجر تحریک موسم بھی وہی لیکن
کوئی ڈالی تو رہ جاتی ہے کوئی شاخ پھلتی ہے

بھلا سائنس کیا سمجھے نزاکت شوق عاشق کی
کہاں فوٹو سے وہ نکلا جو میرے دل میں ارماں تھا

نعت
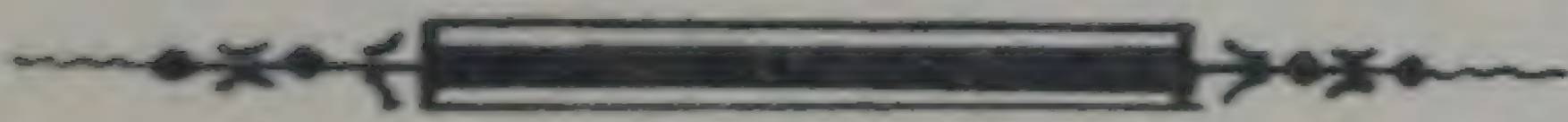
وہ تو موسے ہوا جو طالب دیدار ہوا　　پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمھیں دیکھا ہوگا

نظر کران کی طرف ادب سے تو بھر دیں تیرے دل کو سب سے
عجب نہیں عاشقان رب سے ظہور کار عجیب ہونا

چمن قرآن ہے ہر لفظ اس کا ہے گل　　نہاں ہر گل میں ہے بوئے محمدؐ

محمد پھول ہیں واعظ صبا ہیں　　کہ پھیلاتے رہیں بوئے محمدؐ

ہوئی زائل جہاں سے ظلمت وکفر　　پڑا جب پرتو روئے محمدؐ

"کشف الدجے بجمالہ" کا ترجمہ ہے۔

ہوا ہے باعث ایجاد عالم حسن یہ کس کا　　یہ کس کے دیکھنے کو مجمع اہل نظر آیا

"لولاک لما خلقت الافلاک" کی دوسری تصویر ہے۔

نزع میں نام لیا قبر میں مذکور آیا　　کون سی جا تھی جہاں وہ نہ مجھے یاد رہے

یہ جلوۂ حق سبحان اللہ یہ نور ہدایت کیا کہنا
جبریل بھی ہیں شیدا ان کے یہ شان نبوت کیا کہنا
وہ کفر کی ظلمت دور ہوئی اور محفل دیں پر نور ہوئی
یہ مہر ہدیٰ سبحان اللہ یہ صبح سعادت کیا کہنا
جس دل میں ہو پرتو کرسی و عرش اس دل کی بلندی صل علیٰ
جس سینے میں قرآں اترا ہو اس سینے کی عظمت کیا کہنا
تسبیح سے دنیا گونج اٹھی تکبیر کا غل تا عرش گیا
تاثیر ہدایت صل علےٰ یہ جوش عبادت کیا کہنا
حضرت کی نبوت میں ہو کس طرح مجھے شک
ہر ذرہ کو ہے ورد رفعنا لک ذکرک

تھی شان جلالی کہ عدو رک گئے آخر　　وہ نور تھا عالی کہ صنم جھک گئے آخر

احباب نے طویل مضامیں وہاں پڑھے	لیکن مری زبان کا تھا حصہ مختصر
میں نے بزم نعت میں اتنا ہی پڑھ دیا	بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
وجد میں لائے گا یہ مضمون اہلِ ذوق کو	دھوم تھی روزِ ازل اس سید ذی جاہ کی
جب رُخ کے آثار فطرت کہہ کے حرف لا الہ	نورِ احمدؐ سے اٹھی آواز الا اللہ کی
فکر رسول پاکؐ ہے فخر زبان انس و جن	رُوح کو اس سے ہے سرور قلب ہے اس سے مطمئن
ولولۂ دل جواں قوت خاطر مسن	سنئے اگر بگوش ہوش وردِ ملک ہے رات دن

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

صلوات ہو محمدؐ پر اصلوات ہو محمد

خضرِ رکوع ہے یہی شوق سجود اسی سے ہے	حالت ذوق و وجد کا دل میں ورود اسی سے ہے
دین خدائے پاک کی شان نمو اسی سے ہے	منبعِ خیر ہے یہی ہمت جود اسی سے ہے

یعنی یہی کلمہ عبادت خدا کے لئے بندہ کا رہبر ہے۔ ؂ منبع = سرچشمہ ؂ جود = بخشش ۔سخاوت۔

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

ہے یہ وہ نام خاک کو پاک کرے نکھار کر	ہے یہ وہ نام خار کو پھول کرے سنوار کر
ہے یہ وہ نام ارض کو کر دے سما اُبھار کر	اکبر اسی کا ورد تو شوق سے بے شمار کر

؂ خار = کانٹا ؂ ارض = زمین ؂ سما = آسمان ۔

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

شافع عاصیاں ہیں وہ تائبوں کے کفیل ہیں	فیض رسان خلق ہیں حامی بے عدیل ہیں
شکل میں وہ جمیل ہیں شان میں وہ خلیل ہیں	منظر نور حق ہیں وہ مہبط جبرئیلؑ ہیں

؂ گنہگاروں کے بخشوانے والے ؂ حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ۔

صلِّ علیٰ محمدؐ صلِّ علیٰ محمدؐ

سینہ بت ہیں ان سے شق کفر کے دل میں تیر ہیں	حکم خدا کے ہیں مطیع دین کے دستگیر ہیں
راحت جان و روح ہیں روشنی ضمیر ہیں	خلق ہے ان سے مستفید ہادیٔ بے نظیر ہیں

؂ فائدہ اٹھاتے ہیں۔

حالت ملک و قوم پر ہوں شب و روز بے قرار　　دین سے دل کو پھیر دیں ایسے سبب ہیں بے شمار
مرکز طبع کیا بنے جس سے ہو کم یہ انتشار　　آئی صدا فلک سے یہ پڑھ تو اسی کو بار بار

صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

رہنے دے آسماں اگر تجھ سے ہے بر سرِ جفا　　ہو نہ ملول تجھ سے ہے دولت و جاہ اگر خفا
مسلک مستند ہے یہ چھوڑ نہ تو رہِ صفا　　نسخہ خط دیں یہ ہے ہے یہی ٹھیک فلسفا

صلِّ علیٰ محمدٍ صلِّ علیٰ محمدٍ

مدیح سرورِ کونین میں خامہ اُٹھاتا ہوں　　خیال کفر کی ظلمت پہ اک بجلی گراتا ہوں
شب اوہام ہے شمع یقین محفل میں لاتا ہوں　　چراغ طور ایمن کوہ معنی پر جلاتا ہوں

الٰہی شوخی برق تجلّی دہ زبانم را
قبول خاطر موسیٰ نگاہان کن بیانم را

ثنا. توصیف۔

محمد پیشوا اور رہنمائے خلق و عالم ہیں　　معزز ہیں مقدس ہیں مکرم ہیں معظم ہیں
فروغ منزل ہستی ہیں نور عرش اعظم ہیں　　حبیب حق ہیں ممدوح ملک ہیں فخر آدم ہیں

انھیں کے رنگ سے رنگ گل ہستی کی زینت ہے
انھیں کی بو سے عطر آگیں بنی آدم کی طینت ہے

انھیں کے دل کو آگاہی ہوئی تھی راز فطرت پر　　انھیں کی طبع کو وجد آگیا تھا ساز فطرت پر
وہی چشم خدا بیں محو تھی آواز فطرت پر　　انھیں کا ناز غالب آگیا تھا ناز فطرت پر

وقائع ان کے عزم و فکر کے سانچے میں ڈھلتے تھے
ذرائع غیب سے تکمیل مقصد کو نکلتے تھے

وہ نظریں ساقی میخانہ یزداں پرستی تھیں　　وہ آنکھیں مظہر انوار راز بت پرستی تھیں
انھیں پر بدلیاں خالق کے رحمت کی برستی تھیں　　اسی محفل کی بخشیں خلد کے پھولوں سے بستی تھیں

اسی سرکار نے رتبہ بڑھایا طبع انساں کا
اسی دربار نے خلعت پہنایا نور ایماں کا

نہ سمجھا پھر ہر اک نے آب و سنگ و نار کو حاکم
طبائع ہو گئے تحقیق موجودات کے عازم
جو تھے صناع تاثیر عناصر کے ہوئے عالم
پرستاران عنصر نے عناصر کو کیا خادم
ہوئی توحید بالا جڑ کٹی عنصر پرستی کی
پڑی بنیاد اسی ارشاد سے علمی ترقی کی

غلط سمجھا گیا دعوئے بتوں کی فاعلیت کا
یقین پیدا ہوا حکم خدا کی کاملیت کا
بڑھا نور بصر گذرا زمانہ جاہلیت کا
بجا ڈنکا زمانے میں بشر کی قابلیت کا

معانی ان کے روشن تھے اندھیرے میں اُجالے میں
سماجاتا تھا خوف اُن سے تعرض کرنے والے میں
وہ یوں اصحاب میں تھے جس طرح ہو چاند ہالے میں
مصنف سیل[۱] کو لکھنا پڑا اپنے رسالے میں
اشارہ عقل کی جانب کلام حق میں واضح ہے
یہی قرآن در گنجینۂ فطرت کا فاتح ہے

قدم اُن[۲] کے لئے تھے بہر حل مشکل مسائل نے
ہدایت ان سے حاصل کی جہاں میں طبع مائل نے
جوابوں میں تشفی پائی ان سے طبع سائل نے
نہایت ہی فصاحت سے لکھا ہے کارلائل[۳] نے
جو طاقت رات کو دن اور دن کو رات کرتی تھی
وہ طاقت یعنی یہ فطرت خود ان سے بات کرتی تھی

معاشر دیکھ کر شان اُن کی ان کو شاہ کہتا تھا
مسافر راہ پا کر ان کو خضر راہ کہتا تھا
مخاطب معترف[۴] ہوتا تھا حق آگاہ کہتا تھا
مخالف کو حسد تھا پھر بھی دل میں واہ کہتا تھا
دل کافر میں بھی قدر ان کی تھی ان کا ادب کچھ تھا
زہے شان نبوت کچھ نہیں تھا اور سب کچھ تھا

جواہر خانہ اس چشم کرم سے سینہ بنتا تھا
حقائق کا خرد کا علم کا گنجینہ بنتا تھا
لطافت سے صفا سے نور سے آئینہ بنتا تھا
علوئے[۵] فکر سے عرش بریں کا زینہ بنتا تھا

---

۱ SALE ایک انگریزی مصنف ہے ۲ ان کے لئے راستہ کرتے تھے ۳ CARLOYLE ایک زبردست انگریزی مصنف اٹھارھویں صدی میں گزرا ہے ۴ اقرار کرنے والا ۵ بلندی خیال۔

مریدان کے نہ تھے مشتاق دنیا کی تگ و دو کے
قدم افلاک پر پڑتے تھے اس ہادی کے پیرو کے

چمن ان کے سخن کے فیض بے ہمتا سے کھلتے
قلوب ان کے نظر کے رعب ہوش افزا سے ملتے تھے

بشر کی کیا حقیقت ہے فرشتے جھک کے ملتے
ہجوم خلق تھا راہ طلب میں شانے چھلتے[1] تھے

فلک تھا دم بخود باد مصیبت چل نہ سکتی تھی
خدا کی بات تھی ٹالے کسی کے ٹل نہ سکتی تھی

[1] چپ چاپ۔

نصائح

اعلیٰ مقصود چاہیئے پیش نظر
کوشش تری گو ہو لطف ذاتی کیلئے

فرہاد پہاڑ پر عمل کرتا تھا
شیریں کیلئے کہ تا شپاتی کیلئے

بیٹے کو لوگ کہتے ہیں آنکھوں کا نور ہے
ہے زندگی کا لطف تو دل کا سرور ہے

گھر میں اسی کے دم سے ہے ہر سمت روشنی
نازاں ہے اس پہ باپ تو ماں کو غرور ہے

خوش قسمتی کی اس کو نشانی سمجھتے ہیں
کہتے ہیں یہ خدا کے کرم کا ظہور ہے

اکبر بھی اس خیال سے کرتا ہے اتفاق
اس کا بھی ہے یہ قول کہ ایسا ضرور ہے

البتہ شرط یہ ہے کہ بیٹا ہے ہونہار
مائل ہے نیکیوں پر برائی سے دور ہے

سنتا ہے دل لگا کے بزرگوں کے پند کو
وقت کلام لب پہ جناب و حضور ہے

برتاؤ اس کا صدق و محبت سے ہے بھرا
اس میں نہ ہے فریب نہ کچھ مکر و زور ہے

افکار والدین میں ہے دل سے وہ شریک
ہمدرد ہے معین ہے اہل شعور ہے

راضی ہے اس پہ باپ کی جو کچھ ہو مصلحت
صابر ہے باادب ہے عقیل و غیور ہے

رکھتا ہے خاندان کی عزت کا وہ خیال
نیکوں کا دوست صحبت بد سے نفور ہے

لیکن جوان صفات کا مطلق نہیں پتا
اور پھر بھی ہے خوشی تو خوشی کا قصور ہے

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں
جس کے سر پر جو چاہیں تہمت دھر دیں

بچتے رہو اُن کی تیزیوں سے اکبر
تم کیا ہو خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

ذات واحد میں عناصر ثلاثہ کے قائل ہیں یعنی خدا بہ حیثیت باپ کے، خدا بہ حیثیت بیٹے یا مسیح کے۔ خدا بہ حیثیت خالق و رب کے۔

وقت ہی پر ہر ایک کام اچھا
آسماں کا پروگرام اچھا

قرب ہے جن کو تخت شاہی کا
دور ہی سے انھیں سلام اچھا

لائحہ عمل، سردی، گرمی، روز، شب، بارش، کہرا سب کے اوقات مقرر ہیں۔ مقربین سے زیادہ

ربط وضبط خطرات سے خالی نہیں۔

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھُولو — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھُولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھُولو

مخلوق الٰہی میں عمل پر جو نظر کر — انسان سے بدتر ہے نہ انسان سے بہتر
یہ ہے کہ جھکاتا ہے مخالف کی بھی گردن — سن لو کہ کوئی شے نہیں احسان سے بہتر

بنو گے خسرو اقلیم دل شیریں زباں ہو کر — جہانگیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر

نور جہاں بیگم کے لئے مشہور ہے کہ حقیقتاً پس پردہ سے وہ ساری حکومت کرتی تھی۔ جہانگیر برائے نام بادشاہ تھا۔

جوانی کی دعا لڑکوں کو ناحق لوگ دیتے ہیں — یہی لڑکے مٹاتے ہیں جوانی کو جواں ہو کر
بدی طینت کی چھپ سکتی نہیں شیریں زبانی سے — دل اچھا ہو تو نبھ جاتی ہے شاید بدزباں ہو کر
زمیں کی طرح جس نے عاجزی و خاکساری کی — خدا کی رحمتوں نے اس کو ڈھانکا آسماں ہو کر

اللہ کی جانب متوجہ رہیں احباب — صف ہو گی شکستہ جو کہیں رخ نہ رہا ایک

نماز جماعت میں ایک بھی قبلہ سے پھر جائے تو ساری جماعت ٹوٹ جاتی ہے۔

میں نے کہا کیوں لاش پہ آقا کی ہے مرتا — ہوٹل کی طرف جا کہ غذا بھی ہے کوئی چیز
کتے نے کہا ہو یہ جہالت کہ تعصب — لیکن مرے نزدیک وفا بھی ہے کوئی چیز

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ — آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک
دنیا کے انتظام پر اکبر نہ ہو ملول — انصاف یہ نہیں ہے کہ پا جاؤ سب تمھیں

طالب خدا کی راہ میں سر رکھے مثل ماہ — نور جبیں کہاں ہے جو داغ جبیں نہیں

کاہلی اور توکل میں بڑا فرق ہے یار — اٹھو کوشش کرو بیٹھے ہوئے کس دھیان میں ہو

کہتا ہوں میں ہندو مسلمان سے یہی — اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ — موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

اے جد بزرگ کے نواسو پوتو — تزئین کو تہ کرو زمینیں جو تو
کیا رٹتے ہو اپنی ہسٹری کو ہر وقت — اللہ مدد کرے گا ویسے ہو تو

شہوات کی پیروی کا منصوبہ نہ ہو
دولت تری خادمہ ہو محبوبہ نہ ہو
شہرت جو کمال سے ہو پیدا ہو جائے
لیکن بہ تکلفات مطلوبہ نہ ہو

لطف چاہو اک بُت نوخیز کو راضی کرو
نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظ قوم ہے مہمان نواز
گپ نویسوں کو اور اہل میز کو راضی کرو
طاعت و امن و سکون کا دل کو لیکن ہو جو شوق
صبر پر طبع ہوس انگیز کو راضی کرو

یہ منزل حرص و مال و دولت نہ دیگی دنیا میں تم کو راحت
ہوس بڑھائے گی تشنگی کو نظر کرے گی سراب پیدا

نگاہیں ہوں تو ویرانے میں بھی آبادیاں دیکھیں
اگر دل ہو تو ہر پہلو سے کر لے دل لگی پیدا

آسماں کی چھت بہت نیچی سر نخوت[1] کو ہے
کبر سے کہدو کہ دنیا میں اُبھرنا دیکھکر
قصد تو جائز ہے لیکن اپنا قابو دیکھکر
ہاتھ اٹھانا چاہئے انساں کو بازو دیکھکر

"چادر دیکھ کر پاؤں پھیلانا چاہئے"

اکبر اس جلوۂ خاموش کو بے حس نہ سمجھ
ہاں بصیرت سے تہی دیدۂ نرگس نہ سمجھ
راحت زیست کے سامان کے دھوکے میں نہ آ
امتحاں گاہ کو تو عیش کی مجلس نہ سمجھ
جاہ و منصب میں نظر عاقبت کار پہ رکھ
خاتمہ جس کا ہو افسوس اُسے آفس نہ سمجھ
صبر کے ساتھ مصیبت میں جو ہو حسن عمل
بہر انجام یہ امرت ہے اسے بِس[2] نہ سمجھ

اسٹیشن فنا کی بھی کیا خوب ریل[3] ہے
اس راہ میں ہر ایک پسینجر[4] کا میل[5] ہے
غفلت نے کر دیا جنھیں آزاد وہ ہنسیں
میری نگاہ میں تو یہ دُنیا ہی جیل ہے

چھیڑنا اچھا ہے ساز سعی کا اس بزم میں
آدمی کو زندگی میں اک نہ اک دھن چاہئے
ہو دسمبر میں مبارک یہ اُچھل کود آپ کو
خون مجھ میں بھی ہے لیکن مجھکو پھاگن چاہئے

مذہب دبا ہوا نہ ہو فکر معاش سے
اندازہ ترقی ملت اسی میں ہے

---

[1] غرور [2] زہر [3] گاڑی = [4] PASSENGER - مسافر - رستہ چلنے والے -
[5] ڈاک گاڑی = MAIL

کر نہ بازار میں تو جا کے ضرورت پیدا — گھر میں احساس ضرورت ہو تو بازار کو جا

فارغ از بحث گندم و جو نہ ہوئے — اک روز بھی تارک تگ و دو نہ ہوئے

ننانوے ہی رہے کبھی سَو نہ ہوئے — جمعیت دل کہاں حریصوں کو نصیب

غم نہ کھا روٹی تو گیہوں کی رہی — حرج کیا روپیہ جو کاغذ کا چلا

جنگ کے بعد کچھ دنوں کے لئے کرنسی سے ایک روپیہ کے نوٹ چلے تھے۔

زیادہ بے لطفی ہو چلی تھی اس وقت یہ اشعار معارف نے چھاپے۔ ورنہ نصیحت اور امر بالمعروف ہمیشہ چاہئے۔

اغیار کو ہو مژدہ آپس میں چھڑ گئی ہے — اس وقت مولویت صوفی سے بڑھ گئی ہے

صوفی کو ضد یہ دارم پائے چرا بنوئم — مُلّا کو زعم ہے یہ دانم چرا نگویم

صوفی کا ہے اشارہ میرا پیالہ دیکھو — مُلّا یہ کہہ رہے ہیں میرا رسالہ دیکھو

صوفی کا ہے ترانہ حق کی ترنگ اچھی — مُلّا پکارتے ہیں منطق کی جنگ اچھی

صوفی یہ کہہ رہے ہیں معنی سمجھ کے پڑھیئے — مُلّا یہ کہہ رہے ہیں قرآن ہی سے بڑھیئے

یہ بات ہے یقینی ہرگز نہیں قیاسی — اس جنگ میں ہے بیشک نادانی سیاسی

وہ بھی جماعتیں ہیں وہ بھی ہیں نظم ملت — گو قید ظاہری کی پاتے ہیں ان میں قلت

مجلس میں ہے تزلزل میلوں میں برہمی ہے — دینی طریق میں تو ہر سمت اب کمی ہے

دیکھا نہیں تھا لیکن مردوں پر آپریشن[2] — کہتے ہیں کر رہے ہیں ہم یہ رفارمیشن[1]

[1] REFORMATION = اصلاح [2] OPERATION = عمل جراحی

اس وقت شاید آتی کچھ کام یہ خصومت — بازو قومی جو رکھتے ہوتی اگر حکومت

کیسی دلیل شرعی کیسا خرد کا فتوے — تنگی رزق نے تو چرخے دیئے ہیں کتوا

جان حزیں کو ان کے تن سے ملایئے تو — ہوتا رہے گا نشتر پہلے چلایئے تو

لیکن یہ دیکھئے تو حضرت میں جان بھی ہے — ہے ہاتھ میں قلم بھی منہ میں زبان بھی ہے

تیشے سے توڑ دو تم ایسا یہ بُت نہیں ہے — وضع کہن کا مٹنا اس کی یہ رُت نہیں ہے

اس وقت کیا تمھاری یہ خوش خیالیاں ہیں
آپس میں گالیاں ہیں غیروں کی تالیاں ہیں

بہتر ہے کام لینا نغمات موعظت سے
روکو گلے کو لیکن ایسی جلیت پھرت سے

شیعہ ہوں خواہ سنی ملا ہوں خواہ صوفی
بے سود جنگ باہم ہے سخت بیوقوفی

باتیں نئی کہاں سے لاکر کوئی کہے گا
تم بھی وہی رہوگے وہ بھی وہی رہے گا

دیکھو ذرا تنزل تو خود ہی زور پر ہے
موقوف کب یہ حالت آپس کی شور پر ہے

وقت نزاع باہم ہرگز نہیں ہے یارو
اللہ کو پکارو! اللہ کو پکارو!!

مکالمت

پھرتے ہیں تذکرہ کالج و اسکول کے ساتھ　　خیر مقدم ہے ہمارا ڈنر اور پھول کے ساتھ
معترض گو نہیں دینے کے کبھی بھول کے ساتھ　　مستقل چال میں ہم اپنی ہیں معمول کے ساتھ

اعزازی دعوتیں اور ہار گجرے جو پہنائے جاتے ہیں۔

عمر گذری ہے اسی بزم کی طراری میں
دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں ؛ پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں　(انیس)
کوئی خاص بات نہیں غالباً جسٹس محمود ابن سرسید کی طرف اشارہ ہے۔

پرانی روشنی کا جواب

بے ضرورت نظر آتا ہے تعلی کا یہ فیر　　معترض کون ہے جب آپ کی نیت ہو بخیر
اب تو سب آپ کے اپنے ہی ہیں کم رہ گئے غیر　　نہ حرم آپ کو بیگانہ سمجھتا ہے نہ دیر

آپ کو لطف گورنمنٹ سلامت رکھے
مستفید اس سے ہمیں تا بہ قیامت رکھے

غربا بھی ہیں مگر قوم کے اجزا اکثر　　غربا ہی سے تعلق میں ہے ان کو تو مفر
دور ہے ان سے خود آرائی مغرب کا اثر　　بحث ان کی بھی اسی بات پہ ہے ختم مگر

آپ کا دل رہ مغرب کا اگر سالک ہے
کیجئے چین غریبوں کا خدا حافظ ہے

آپ بنگلوں میں ہیں مسرور تو پھر ہم کو کیا　　آپ مسجد سے ہوئے دور تو پھر ہم کو کیا
آپ مسند پہ ہیں مغرور تو پھر ہم کو کیا　　جاہ ہے آپ کو منظور تو پھر ہم کو کیا

ہمیں ابھریں گے کبھی گو ابھی پستی میں ہیں
آپ دھبوں کی طرح دامن ہستی میں ہیں

نئی روشنی

کرلی ہے میں نے خوب نئی روشنی کی جانچ
مجھ سے بہت نہ کیجئے اَب آپ تین پانچ
ان لیڈروں کی شعلہ زبانی سے کیا ہوا
ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب پہ آئی آنچ

نئی اور پرانی روشنی کا موازنہ

نئی روشنی

پاس کالج کہ جو ہیں ووٹ طلب کرتے ہیں
عشوہ ہائے عجمی کے وہ ہوئے ہیں کشتہ
ان کو ہے لمنڈ و وسکی کی ضرورت اور یہ
پھیلتے وہ ہیں کہ اغیار سے جوڑیں رشتہ
وقت کو دیکھ کے اب آپ ہی انصاف کریں

پرانی روشنی

پاس مسجد کے جو ہیں طاعت رب کرتے ہیں
یہ رخ سادگیٔ طرز عرب کرتے ہیں
رفع پانی سے فقط خشکی لب کرتے ہیں
یہ ہیں سمٹے ہوئے اور حفظ نسب کرتے ہیں
وہ ستم کرتے ہیں یا آپ غضب کرتے ہیں

لباس و اتحاد و دین و غیرت ایک لقمے میں
نئی تہذیب کا یہ پیٹ ہے یارب کہ مٹکا ہے

شام

اقتباسات

رقعات اکبر مرتبہ "ہمایوں" شائع شدہ لاہور

بنام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی

صفحہ ۱۰ (۱) ۱۵ ۲۵/۲

"زندگی ہے جس کا میں زیادہ مشتاق نہیں ہوں تو کبھی ملنا تو ہوگا۔"

صفحہ ۱۲ (۲) ۵؍اکتوبر ۱۹۱۶ء

"مدت سے ارادہ تھا کہ دادِ سخن کی شکر گزاری کروں، آج ساعت تھی کہ قلم اٹھایا میرے خرافات نے مجلس علماء و فقہا سے داد پائی۔ اس کو اپنی ارتقا سمجھتا ہوں۔"

صفحہ ۱۳ (۳) ۵؍اکتوبر ۱۹۱۶ء

"شب گذشتہ آپ کا کارڈ مجھ کو ایسے وقت میں[1] ملا کہ میں دو مہینے کے قیام کے بعد یہاں آ رہا تھا۔ گویا ٹکٹ[2] بدست تھا ـــــ ماجد صاحب اس وقت تشریف فرما تھے۔ پیام شوق و حسرت ان کے سپرد کیا۔"

صفحہ ۱۴ (۴) ۲۱؍فروری ۱۹۱۷ء

"آپ کے طرزِ سخن سے جو آگاہ ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ نے میرے ناچیز کلام کی نسبت جو ریمارکس کسی تحریر سابق میں کئے تھے وہ میرے لئے باعث فخر ہیں۔ میں نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ ممکن ہے کچھ غلط فہمی ہوئی ہو۔"

صفحہ ۱۵ (۵)

"خواجہ حسن نظامی صاحب کے محرم نامے کے متعلق آپ کی تحریریں دیکھیں۔ اظہار مدعا

---

[1] میں زائد ہے اور فصاحت سے گرا ہوا ہے [2] پا بہ رکاب کی جگہ" محاورات کو بدلیں براہ ریل جناب ٹکٹ بدست کہیں اب بجائے پابہ رکاب۔

میں جو لطافت و نزاکت ہے آپ ہی کا حصہ ہے۔ خواجہ صاحب صوفی نہاد بزرگ ہیں ان کے کاموں میں کچھ روک ہے۔ دنیا کا تعلق ضرور تھا مذہبی ہسٹری پر جُھک پڑے۔ سید عقیل میرا پوتا ہے۔ دس برس کا سن ہے۔ میں عشرت سے کہتا ہوں کہ اس کو عربی پڑھاؤ۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ندوے میں داخل ہو، اور اس کی نگرانی کے لئے ایک مولوی صاحب بھی ساتھ رہیں کوئی عزیز بھی رہے، کچھ انگریزی تعلیم بھی ہوتی رہے۔ میرا یہ حال ہے کہ زندگی بار ہے ؎

وقت طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا   اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

اب اس وقت ان کی عمر ۱۹۳۱ء میں ۲۴ برس کی ہے۔ نہایت ذہین ہیں، طباع ہیں۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے بی۔اے پاس ہو چکے ہیں۔

صفحہ ۱۶ و ۱۷

(۶)

"خدا جانے خواجہ صاحب کی غلطی ہے یا پالیسی یا عقائد میں تبدیلی، بہرکیف خواجہ صاحب میرے بڑے عنایت فرما ہیں۔ میں آپ کی مدح میں مبالغہ نہ کروں گا کہ آپ کو تصنیف شعر کی زحمت ہو۔ یہی کہوں گا کہ آپ مجھ سے بہتر ہیں۔ اسی سبب سے آپ کا مشتاق رہتا ہوں کہ کچھ سیکھوں۔ میرے ایک دوست نے میرا حال دریافت کیا تھا۔ میں نے یہ شعر لکھ دیا ؎

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا ہے حال   کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

انھوں نے بیحد پسند کیا۔ ہمدم میں میرے چند شعر چھپے ہیں۔ صواب کی جگہ ثواب کر دیا ہے۔

بس یہی فقرہ کہ شام ہجر نے مارا اسے ہ کوئی کہہ آتا تو کتنا مختصر پیغام تھا ـــــ (ثاقب) کتابت کی غلطی سے موصوف کو بہت تکلیف ہوتی تھی۔

صفحہ ۱۸   (۷)   ۱۳ مئی ۱۹۱۷ء

آپ کے اشعار نے میرے داغ دل ہرے کر دیئے۔ ہرے تو رہتے ہی ہیں یہ کیئے لہولہان کر دیئے۔ جوش غم نے آپ سے ایسے مصرع کہلا دیئے۔ ع۔ شمع اس راہ میں اس کا رخ انور نہ ہوا۔ ع۔ وہ گیا اور بپا دہر میں محشر نہ ہوا ـــــ ورنہ صرف علمی قابلیت اور قوت قافیہ پیمائی کافی نہیں۔

مکتوب الیہ کی بیوی نے ۱۹۱۶ء میں وفات پائی تھی انھیں کی یاد میں سلیمان صاحب نے یہ موتی بکھیرے تھے۔

حضرت اکبر کا معیار شعر گوئی کیا ہے؟

صفحہ ۱۹ (۸) ۲۸ مئی ۱۹۱۷ء

"انتخاب میں سخت اُلجھن ہوتی ہے ـــــ چند شعر مسودے سے نقل کراکر بھیجتا ہوں۔ بیدریغ حذف وترمیم کے بعد شائع فرمایئے یا ناپسند کردیجئے۔ بقول مولانا شبلی مرحوم کے جو کہنا تھا کہہ چکا۔"

کوئی بیکس رہ نہیں سکتا زمان جارج میں لیڈیوں نے لیا واعظ کو اپنے چارج میں

منصف مزاجی اس کا نام ہے۔ (منجملہ اشعار مرسلہ)

صفحہ ۲۱ (۹) ۱۷ جون ۱۹۱۷ء

"حواس پر اعتبار نہیں رہا، ڈرتا تھا کہ کسی تحریر سے کچھ غلط فہمی ہوئی۔ شکر ہے کہ آپ کے خط سے اطمینان ہوا۔"

صفحہ ۲۲ و ۲۳ (۱۰)

"کل جو نظم بھیجی ہے اس میں شعر اول کے مصرع ثانی پر نشان بناکر حاشیہ پر یہ آیت لکھدیجئے۔

ان الذین اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت سیجعل لھم الرحمٰن ودّا۔

ترجمہ بھی کردیجئے گا اور اس مصرعہ پر "کاٹو یہ وقت اپنا طعنوں میں اور گلوں میں" نشان بناکر حاشیہ پر یہ آیت لکھدیجئے۔

لا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان۔

(۱۱)

میری شاعری کا مزا تو آپ کے اُستاد مرحوم کے ساتھ اُٹھ گیا زمانہ بھی بدل گیا اور بدلتا جاتا ہے۔ (حضرت شبلی نعمانی)

صفحہ ۲۳ (۱۲)

اچھا کیا آپ نے ابھی وہ نظم رُحماء بینھم شائع نہیں کی، دو چار مہینے التوا بہتر ہے ہیجان نفسانیت اور بدگمانی ذرا کم ہو، اگرچہ وہ نظم نہایت بے گناہ ہے۔

صفحہ ۲۴

"ستارۂ صبح" بند ہوگیا "آفتاب" نکلا۔ لطیفہ ذہن میں آیا کہ ابراہیم اس سے بھی مطمئن نہیں وجاہت حسین صاحب (اخبار ندکور کے اسسٹنٹ ایڈیٹر) کا خط آیا ہے آپ دیکھ رہے ہیں

ہم لوگوں پر کیسا نازک وقت ہے۔

(ابراہیم خلیل اللہ نے پہلے ستاروں کو پھر چاند سورج کو پھر اور مادی چیزوں کو خدا کہا اور پھر ایک کو اپنی خداداد قابلیت استدلال سے رد کرتے گئے آخر معرفت حاصل ہوگئی اسی طرف اشارہ ہے۔

مولوی ظفر علی خاں نے نظر بندی سے رہا ہو کر آفتاب نکالا، زمانہ نظر بندی میں ستارہ صبح نکالا تھا۔

صفحہ ۲۸ (۱۴) ۱۲ر جون ۱۹۱۷ء

"غم نے جو میری حالت کر رکھی ہے اور جن آلام میں مبتلا ہوں اگر آپ کو معلوم ہوں تو تعجب کیجئے کہ جس قدر حواس باقی ہیں یہ بھی کیوں باقی ہیں۔"

صفحہ ۲۶ و ۲۷ (۱۵) یکم ستمبر ۱۹۱۷ء

آپ کے حالات و خیالات آپ کو ترقی مراتب انسانی کی طرف لئے جاتے ہیں اور یوں تو کلرکوں کی لائن دنیا کے لئے کھلی ہوئی ہے ــــــ آپ سے ملنا ہوتا تو انتخاب اشعار میں مدد ملتی۔ مسودے بے ترتیب پڑے ہوئے ہیں۔ مجھ کو تو ضعف و علالت نے بہت معذور کر رکھا ہے۔ جرأت سفر کم ہے۔ کیوں نہ ہفتے عشرے کو آئیے۔ بل سفر خرچ میرے ذمہ۔

صفحہ ۲۷ و ۲۸ (۱۶) ۳ر دسمبر ۱۹۱۷ء

"تعلقات کی نزاکت اور پولیٹیکل انتشار کی حالت نے بالکل افسردہ کر دیا ہے۔"

صفحہ ۲۸ (۱۷) ۲۷ر مئی ۱۹۱۸ء

"آپ نے مُلّا و صوفی کی نظم کو خوب زندگی بخشی اقبال صاحب (سر محمد اقبال) اس سے خوش نہ ہوئے۔ خط آیا۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کس حق سے وہ مُلّا بنتے ہیں۔ میں تو صوفی بنتا نہیں۔ شاعری کا کچھ مذاق ہے۔ اگرچہ بقول آپ کے شاعری اور تصوف اور فلسفہ سب ایک ہے۔ اقبال صاحب لکھتے ہیں کہ میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں جس کے معنی ہوئے شخصی۔ یہ لفظ مغربی معنوں نے استعمال کیا ہے بمقابلہ فلاسفہ کے خدا کے۔ جس کا وجود عالم ہی کے ساتھ اور اسی میں طاری و ساری ہے الگ نہیں ہے۔ اقبال صاحب کا مطلب ہے کہ ہندو فلاسفی الگ خدا کو نہیں مانتی اور صوفی بھی ہمہ اوست کہتے ہیں لیکن میں پرسنل خدا کو مانتا ہوں۔ اس بات میں آپ نے[۱] صحیح لکھا ہے کہ یہ بحث ہی نہ کرنا چاہئے

[۱] سلیمان صاحب کے سلسلہ مضامین "اہل السنہ" کی طرف اشارہ ہے۔

اسی نے اختلاف ڈالا ہے۔ جو قرآن میں ہے وہی کہو۔ پرسنل گاڈ کہنا اتنا ہی بے جوڑ جس قدر ہمہ اوست کہنا۔ بلکہ ہمہ اوست میں تو ایک بات ہے۔ عربی الفاظ اور قرآن کی اصطلاح چھوڑ کر پرسنل گاڈ کیا معنی ــــ اقبال صاحب نیک نیتی سے احتیاط کا پہلو اختیار کرتے ہیں۔ پروفیسر بھی تو ہیں، اور تماشا سنئے کوئی صاحب آصف نامی ہیں۔ انھوں نے مسز سروجنی نائیڈو کے اشعار کا ترجمہ چھپوایا ہے عنوان یہ ہے "ہمشیرہ محترمہ" سروجنی نائیڈو ہیں۔ "خطیب" سے پوچھتا ہوں کہ ہمشیرہ کس قاعدہ سے لکھا گیا ہے۔ یہ ریمارک اپنے مروجہ مراسم تمدن کے لحاظ سے ہے ورنہ ماں بہن کہنا تو اچھی بات ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو تو بہت نامور اور قابل تعریف ہے اس کا نوٹس آپ بھی لے سکتے ہیں۔

صفحہ ۳۱ (۱۸)

کلکتہ کے حالات معلوم ہوئے ہوں گے۔ مسلمانوں کی حالت پر بڑا افسوس ہے اللہ رحم کرے ہو سکے تو کچھ لکھئے۔

کلکتہ کے ایک اینگلو انڈین اخبار نے روضہ نبوی صلعم کے متعلق جو ناپاک الفاظ لکھے تھے اس سے مسلمانوں میں جوش پیدا ہوا اور قتل و غارت تک نوبت پہنچی اسی سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔

صفحہ ۳۲ و ۳۳ (۱۹) ۱۰ ستمبر ۱۹۱۸ء

میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت دنیا کدھر جا رہی ہے۔ بہر حال جس بات کو اپنے حق میں بہتر سمجھیں بشرط امکان بعد امکان اس کو کئے جائیں۔ میں تو اب اُکتا گیا ہوں۔ مفقود الخبر ہونے کا آرزو مند ہوں، آپ کی تحریروں کو پڑھ کر یہ اشعار کہے تھے۔

ادھر جوانوں کو ہے سودا کہ سیر بازار انھیں کرائیں
ادھر خواتین جلوت آرا ہنوز مست اپنی فوج میں ہیں
مگر قید حرم کہاں تک حجاب کے دن نقاب کب تک
کہ گبرو ترسا کی لیڈیاں بھی شریک واعظ کی نوج میں ہیں

اسلام میں اتحاد اور ترقی دکھایئے۔

سلیمان صاحب نے آزادی نسواں کے متعلق معارف میں کچھ نوٹ لکھے ہیں۔

صفحہ ۳۳ و ۳۴ (۲۰) ۲۸ جنوری ۱۹۱۹ء

"دنیا دار المحن ہے۔ میرے لئے تو ہے آپ بھی سمجھے ہوں گے۔ سکونت کے لئے مستقل جگہ

کا ٹھکانا نہیں جہاں اطمینان سے بقیہ عبرت آگیں زندگی بسر کروں۔ زمانے کا رنگ دیکھ کر دل بجھ گیا ہے۔

صفحہ ۳۴ و ۳۵ (۲۱)

دن سے بائیں پانوں میں درد پیدا ہو گیا ہے۔ چلنا دشوار ہے۔ ہنوز کوئی تدبیر سود مند نہیں ہوئی۔ شاید جراحت کی ضرورت پڑے۔ افسوس کہ آپ سے ملنا نہیں ہوتا ورنہ کچھ بار دل اُتر جاتا۔

صفحہ ۳۵ و ۳۶ (۲۲) ۲۷ مارچ ۱۹۱۹ء

یہ شعر مجھ کو بہت پسند ہوا۔

دو سہ گام گر پے دل برہش دویدہ باشی زچہا گزشتہ باشی بہ چہا رسیدہ باشی

پنجاب کے ایک کرمفرما دوست دوسرے مصرع کو نہیں مانتے وہ کہتے ہیں "زچہا گذشتہ باشی بہماں رسیدہ باشی"

کیا آپ کا کتب خانہ اس کا پتہ لگا سکتا ہے کہ میں نے تو سنا اور یاد رکھا ہے بلیغ اور بامزہ سمجھتا ہوں اپنی رائے بھی لکھیے۔ پرچہ نظام لاہور سے نکلا ہے باوجود میری تحریر کے۔ نامہ نگار صاحب نے اس کو قائم رکھا ہے میں اچھا نہیں ہوں کھویا کھویا رہتا ہوں۔

صفحہ ۳۶ و ۳۷ (۲۳) ۱۶ اپریل ۱۹۱۹ء

"دو سال ہوئے مسٹر برن چیف سکریٹری گورنمنٹ سے بمجبوری ملنا پڑا تھا۔ ان کو فارسی لٹریچر کا شوق ہے۔ بسلسلہ مکالمت میں نے یہ اشعار اُن کو سُنائے اور یہ بھی کہہ دیا کہ آپ تو اس کو قبول نہ کریں گے اور شاید کوئی اس کی تصدیق نہ کریگا لیکن میری حالت یہی ہو گئی ہے ؎

ہنگامہ شکر و شکوہ دنیا میں ہے گرم لیکن مرے دل سے یہ صدا آتی ہے
کھلتا نہیں راز دہر شکوہ ہے تو یہ اور شکر یہ ہے کہ موت آجاتی ہے

انھوں نے فرمایا کہ آپ نے سچ کہا میں بھی یہی خیال کرتا ہوں۔

صفحہ ۳۷ و ۳۸ (۲۴) ۲۵/۹ ۱۹

تین ہزار سے زیادہ نظمیں بیاضوں میں موجود ہیں۔ حصہ سوم کے لئے پبلک کا بڑا تقاضا ہے حیران ہوں کہ ترتیب و انتخاب کیونکر ہو۔ سوسائٹی کی خاطر ہے ورنہ طبیعت دنیا سے بالکل

بے تعلق ہو گئی ہے۔ کوئی مونس و غمخوار نہیں رہ گیا۔

رقعات بنام مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شروانی

صدر الصدور و امور مذہبی ریاست حیدر آباد (دکن)

صفحہ ۴۱ و ۴۲ (۱) ۹/۳

عشرت سلمہ کا عقد ۳۰ مارچ روز پنجشنبہ پریاواں ضلع پرتاب گڈھ میں ہوگا — میں قائم مقام (ہو کر) ڈسٹرکٹ و سشن ججی بنارس پر جا رہا ہوں۔ ناکارہ ہوں مگر مجبور۔

صفحہ ۴۲ (۲)

ندوۃ العلما چمن ہے تو آپ اس کے پھول ہیں اور اگر زیادہ با معنی ہونا چاہوں تو آپ اس کے بلبل ہیں۔ میں نے آپ کی تصنیف کی بہت قدر کی نہ صرف اس سبب سے کہ "وہ محض انڈکس نہیں ہے جس میں علما اور کتب اور دیار و امصار کے نام لکھدیئے گئے ہوں جن سے اگرچہ معلوم ہوتا ہو کہ مولف مصنف کو بہت سی کتابیں حوالہ دینے کے لئے میسر آئیں اور شائد ورق گردانی میں اس نے محنت بھی کی۔ لیکن پڑھنے والے کی عقل نہ بڑھے نہ دائرہ معلومات مفیدہ بجز اس کے کہ وہ مولف کو داد دے اور کچھ فائدہ حاصل نہ کر سکے۔" بلکہ اس میں مغز بھی ہے واقعات بیان کئے گئے ہیں جن سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے۔ مجھے تو فائدہ پہنچا۔ ارادہ کر لیا ہے زیادہ محنت کروں گا۔ آپ کی عبارت اکثر جگہ داد طلب ہے —— اچھی جماعت کے ذکر سے آپ نے اپنی طبیعت کو بسایا یا اس کی خوشبو انشاء اللہ آپ کی روح کو گود میں لئے رہے گی۔"

بنام سید افتخار حسین صاحب بی اے رجسٹرار عدالت العالیہ

جوڈیشلی اودھ

صفحات ۴۴ و ۴۵ و ۴۶ (۱) ۲۸ اکتوبر ۱۹۱۳ء

مستم از بادہ شبانہ ہنوز۔ بادہ شبانہ سے مطلب وہ حظ و لطف ہے جو تین چار دن آپ کی برادرانہ بے تکلفی، مخلصانہ مہماں نوازی، عارفانہ خیالات، طالبعلمانہ ذوق تحقیق اور نستعلیق و باادب زندگی

سے حاصل ہوا حسرت ہوئی کہ اب تک ایسے بلند و پاکیزہ خیالات رکھنے والے قیصر باغ کے بلند و مصفا ایوانوں میں جاگزیں ہیں لیکن کل شئ یرجع الی اصلہٖ (ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع کرتی ہے) اس کی توجیہ کرتا ہے۔

مثل ہے کہ "تین دن مہمانی بعد ازاں صدقہ"، آپ کی محبت برادرانہ اور نوازش کریمانہ اور قدرشناسی شاعرانہ کی لذت ایسی ہے کہ ایک دن صدقہ کی مد میں رہا۔ ابنائے زمانہ کے مذاق و شاغل کو دیکھ کر احتراز اولیٰ نظر آتا ہے لیکن آپ کی مجالست و مکالمت غذائے روح ہے — جب وائسرائے نے شفقت پدرانہ کا اظہار کیا تو دالان اور زیرین زمین کی بحث کیا ؎

لاٹ صاحب ہی جب کہ باپ بنے　　خواہ مسجد ہو خواہ شاپ بنے
گا رہے ہیں خوشی میں با دف و چنگ　　مولوی شد رہا ز قید فرنگ

صفحہ ۴۷ و ۴۸　　(۲)　　۲۳ دسمبر ۱۹۱۳ء

آپ کے خط کی کیا اچھی نیچرل اور معنی خیز عبارت ہے آپ نے بے ساختہ اور قلم برداشتہ لکھا ہے لیکن مرقع بلاغت ہے کیوں نہ ہو "زہر جنس در نفس پاکش علوم" علم بھی خوب ہے دل بھی خوب ہے۔ آپ کے اس فقرے پر کہ توجہ الی الموت البتہ ہے مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو　　حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

یاد مرگ تو عجب چیز ہے کچھ نہ پوچھئے کہ مجھ پر کیا گذرتی ہے۔

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا　　شدت یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

صفحہ ۴۹ و ۵۰　　(۳)　　۱۲ اپریل ۱۹۱۴ء

میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس وقت جو شخص بادہ غفلت سے مخمور نہیں ہے اپنے مستقبل کی تاریکی میں گم ہے — اپنا کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ اپنا کوئی نہیں سب بیگانے ہیں دوسرے یہ کہ آپ اپنا منہ کھولئے، پہلے میں نے آپ کے شعر کے اول معنی سمجھے اور متامل ہوا لیکن فوراً دوسرے معنی ذہن میں آگئے اور پھر رک گیا — محمد نسیم صاحب (ایڈوکیٹ لکھنؤ) حال ہی میں آئے تھے مجھ کو مغموم دیکھ کر بہت اصرار سے لکھنؤ آنے کا وعدہ لے گئے)

صفحہ ۵۰ و ۵۱ (۴) ۲۷ مئی ۱۹۱۴ء

الہ آباد میں تو قیامت کی گرمی ہے۔ ان روزوں ایسی فکر میں ہوں کہ کلیات کا چوتھا ایڈیشن چھپوادوں تیسرا ایڈیشن بھی ختم ہوگیا اور مانگ باقی ہے۔ تیسرے حصہ کے لئے بھی مواد تیار ہے اب تو اس سے بھی دل گھبراتا ہے۔ کہنے سے نہیں چھپوانے سے لیکن پبلک کی خواہش کی رعایت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ بزرگان دہلی نے دعوت و شرکت انجمن پر اصرار کیا تو یہ شعر ذہن میں آیا ؎

بگزار بجال خودم اے بزم تعلی   عبرت زدہ را کار بہ آمیز زدگاں نیست

آمیزہ کی ترکیب کو ملاحظہ فرمائیے گا۔

صفحہ ۵۲ و ۵۳ (۵) ۱۸ جون ۱۹۱۴ء

آپ کے خط کے ساتھ ابر رحمت بھی پہنچا۔ وہ تکلیف خارجی گرمی کی تکلف جاتی رہی۔ لیکن صفرائے محترقہ کا ہیجان ہوگیا ہے۔ ضعف ہے دل مایوس سے کچھ مدد نہیں ملتی ایک قدرتی شین ہے چلی جاتی ہے ؎

اب میری زندگی میں نہیں نور انبساط   یہ شمع جل رہی ہے مگر ہے بجھی ہوئی

یہ شعر کل کہا تھا ایک شعر یہ بھی کہا تھا ؎

افسوس جیٹھ ہی میں ہم چل بسے تڑپ کر   پانی پڑا مگر کب؟ آدھا اساڑھ تپ کر

صفحہ ۵۶ (۶)

اس وقت ایک صاحب دفتر صاف و مرتب کر رہے ہیں۔ آپ کا خط انبار میں ملا جس میں آپ کا یہ شعر تھا ؎

مٹا دیا ہے زمانے نے اس قدر ہم کو   کہ اب حریف بھی اپنا نظر نہیں آتا

اس کے ساتھ آپ کے ریمارکس بھی تھے یہ شعر ۱۱ اپریل شاید ۱۹۱۴ء کے افتخار حسین صاحب کا ہے آج آپ خدا جانے کن حالات میں ہوں گے اور کہاں ہوں گے مجھ کو اپنا ایک مطلع یاد آیا ؎

معاذ اللہ دور چرخ کیا کیا رنگ لاتا ہے   جنھیں آتا تھا ہم پر رشک اب اُن کو رحم آتا ہے

آپ کو اپنے شعر پر یہ شبہ تھا کہ تیر نشانے تک نہ پہنچا ممکن ہے کسی کو یہ شبہ ہو کہ میرا تیر نشانہ سے آگے نکل گیا لیکن اقتضائے حالات یہی ہے۔

صفحہ ۵۸ و ۵۹ (۹) ۱۳ اکتوبر ۱۹۱۸ء

حصّہ سوم کلیات کا پبلک کی طرف سے تقاضا ہے۔ ہنوز منتخب و مرتب نہیں کر سکا۔ آپ سے ذی علم ماہر سخن اور زمانہ شناس کی ضرورت ہے۔ پھر چھپوانا بھی دردسر ہے۔ عشرت سلمہ کو میں نے کاپی رائٹ دیدیا ہے لیکن ان کو اپنے کاموں سے فرصت نہیں ملی ہے۔ دہلی لاہور میں کچھ لوگ خواستگار ہیں لیکن وہ بہت دور ہیں۔

صفحہ ۶۰ (۱۰) ۶ دسمبر ۱۹۱۸ء

۵۔سال قمری سے عمر تجاوز ہو چکی۔ چوں نگہ می کنم نماند بسے ــــ صدہا اشعار آپ کے سننے کے قابل ہیں۔

سب کو یہ مسلم ہے کہ معبود وہی ہے کم ہیں جو سمجھتے ہیں کہ مقصود وہی ہے

۱۹۲۱ء میں انتقال ہوا۔ کے نزدیک کی جگہ استعمال کیا گیا ہے۔

صفحات ۶۱ و ۶۲ و ۶۳ (۱۱) ۱۵ اپریل ۱۹۱۹ء

مجھ کو تو اس بات پر فخر ہے کہ آپ نے محض قابلیت سے اعتبار پیدا کیا اور ترقی حاصل کی۔ کبھی آپ کو تماشا گروں کے اسٹیج پر نہیں دیکھا۔ میرا اصول یہی تھا اور ہے ــــ

ــــ جاورے، اور حیدرآباد سے شدید تحریک و تشویق ہو رہی ہے دل ہی نہیں چاہتا لکھنؤ میں محض بخیال راحت الگ انتظام کرتا ہوں لیکن بسا اوقات ناخواستہ ملاقاتوں سے پریشان ہو جاتا ہوں عمر ۷۵ آلام ایسے عوارض کا یہ حال کہ ۱۸ گھنٹے باوقات مختلف تکلیف وہ احساس بوجہ ضعف اعصاب کے ہوا کرتا ہے اور سمجھتا ہوں کہ نزع قریب ہے۔ ہمنشینوں کو یہ حالت نہیں معلوم ہوتی ہے۔ ہنسی آتی ہے کہ رشتۂ حیات بھی تانت ثابت ہوا کرتا ہے لیکن دم بھر کو بھی اس کا اعتبار نہیں ــــ میرا تو یہ شعر میرے حسب حال ہے۔

دنیا سے تعلق کیا رکھوں کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے

دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کے دن کے لئے اور کس کیلئے

ایک صاحب شورش موجودہ پر نظم کے طالب ہیں بحق گورنمنٹ دل چاہتا ہے یہ لکھ کر بھیجدوں ــــ

کمر خموشی پہ ہم نے باندھی کہاں کے روکٹ کہاں کے گاندھی
غبار عبرت سے بند ہے آنکھ چل رہی ہے فنا کی آندھی

صفحہ ۶۳ و ۶۴ (۱۲) ۱۰ر جولائی سنہ ۱۹۱۹ء

آپ کا خط پڑھ کر اسی پر یہ شعر لکھدیا۔

اس میں کیا شبہ ہے محنت تو ہے اور کام تو ہے ساتھ ہی اس کے مگر زر تو ہے اور نام تو ہے

مطلب تو اس سے یہ تھا مگر قافیوں نے الجھالیا۔

شمع کافور کو گو لیمپ نے کافور کیا نور خاطر کو مگر پر تو اسلام تو ہے

فرق معنی نہیں اُردو ہو کہ ہندی ہو لغت ماگھ میں دھوپ تلفظاً سہی گھام تو ہے

کیوں ہو شیطاں کی طلب بہر سرور ہستی عشق کی مے تو ہے اور دل کا مے جام تو ہے

حصہ سوم کی تہذیب و ترتیب میں مصروف ہوں مشیر کوئی نہیں قریب ۲۶۰۰ کے نظمیں ہیں۔

یہ کے۔ بی کا تعلق ہو گیا کیوں نام اکبر سے کھٹکتے ہیں فرشتے اس گزٹ آلود آنر سے

K.B. خان بہادر۔ K.B. اکبر کے حروف بھی ہیں۔

صفحہ ۶۵ (۱۳)

"میں کھاتا کیا ہوں خوان احتیاط سے ریزہ چینی کرتا ہوں ـــــ لہذا کھانے کو تو ملتوی رکھیئے ـــــ میں انشاء اللہ بشرط زندگی و توانائی و درستی ہوش و حواس اور نہ واقع ہونے کسی آفت ارضی و سماوی کے کل آٹھ نو بجے صبح کے حاضر ہوں گا۔"

اقرار نامہ قانونی کا خاکہ اُڑایا گیا ہے۔

صفحہ ۶۷ و ۶۸ (۱۵) ۷ر اکتوبر سنہ ۱۹۱۹ء

"ضعف بہت ہے غذائے معمولی ہنوز نہیں ہوتی لیکن ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ ابھی کچھ دن اور جینا ہے کم سے کم آیندہ کنوار تک میں نے ایک شعر کہا یہ لطیفہ ملاحظہ ہو۔

کمزور ہے مری صحت بھی کمزوری بیماری بھی جب اچھا تھا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

مجھ سا مشکل پسند اور بے تعلق اور افسردہ دل بھی آپ کو نعمت سمجھتا ہے۔

صفحہ ۲۷۲، ۲۷۳ (۱۹) ۹ ستمبر ۱۹۳۰ء

اختصار شب وصل کا آپ نے خوب خیال کیا۔ اس کے جواب میں یہ لطیفہ عرض کرتا ہوں کہ اگر میرا خط شب وصل سے بھی زیادہ مختصر تھا تو یہ سبب ہے کہ وصل ملاقات ہے اور المکتوب نصف الملاقات مشہور ہے لہٰذا میرا خط نصف شب وصل تھا ـــــ زمانے کے انقلاب اور یاروں کے انتشار اور دل بستگی کی راہوں کے انسداد نے دیوانہ کر رکھا ہے۔

رقعات بنام ہز اکسیلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سر کشن پرشاد صاحب بہادر سی آئی ای۔ جی سی آئی ای یمین السلطنت پیشکار و مدار المہام دولت آصفیہ نظام المتخلص بہ شاد

صفحہ ۵ (۱) ۲۷ را کتوبر ۱۹۱۴ء

"یہاں بھی ہندو مسلمان شیعہ سنی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے توحید اور صلح کل کے مسائل کو برابر بیان کرتے رہئے اور ان پر زور دیجئے ـــــ برسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا عرض کرتا ہوں شاید پسند فرمایئے۔

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں ‌ ‌ ‌ جو اہل وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھئے " حال ہی میں مست رہتے ہیں۔"

صفحہ ۷۷، ۷۸ (۳) ۳ر نومبر ۱۹۱۴ء

دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک ہے۔ اسی نے غیر خدا کو خدا بنا کر انسانوں میں تقسیم کر رکھا ہے ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا ‌ ‌ ‌ میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کر دوں۔ ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں ‌ ‌ ‌ آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں

چاہتا تھا بہت سی باتوں کو ‌ ‌ ‌ لیکن افسوس اب وہ جی ہی نہیں

جرأت عرض حال کیا ہوتی ‌ ‌ ‌ نظر لطف اس نے کی ہی نہیں

وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب سے کنارہ کشی کو اولیٰ سمجھا ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں اور وہ طبیعتیں جن پر یہ شعر صادق آتا ہے ؎

دن بھر ایک ایک منہ کو تکتا ہے ۔۔۔ بات کرنے میں عیب لگتا ہے

صفحہ ۸۹ ۔۔۔ (۶) ۔۔۔ ۲۶ نومبر ۱۹۱۴ء

بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے مگر موحد کا دل ٹھکانے رہے گا۔ اور کیا کچھ ترقیاں ہوں اگر دل لگا رہے۔

صفحہ ۸۳ ۔۔۔ (۷) ۔۔۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۴ء

"دنیا کا پوچھنا کیا شان ظہور تو یہی ہے لیکن غفلت شکن اسباب عالم دل کو بدل دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب کی خدمت میں تسلیم اسی کے ساتھ ایک لطیفہ بھی۔

خواجہ سے کیونکر نہ ہوتا پادری کو سوء ظن ۔۔۔ پیر ہی بے دخل کرتا ہے سدا اتوار کو

اس زمانہ میں خواجہ حسن نظامی صاحب شاہ صاحب کے پاس تھے۔

صفحات ۸۴ و ۸۵ و ۸۶ ۔۔۔ (۸) ۔۔۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء

دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں۔ اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے ؎

یہ عمر کب تک وفا کرے گی زمانہ کب تک جفا کرے گا ۔۔۔ مجھے قیامت کی ہیں اُمیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا۔ ع بحمد اللہ اب خون شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اس وقت کہا تھا جب سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی دوسرا شعر صاف تھا ؎

بہت کی سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر ۔۔۔ بالآخر چرخ ان کے سر کو زیر سنگ لایا ہے

ایڈیٹر نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلان جنگ منجانب برٹش ہو گیا۔ ان پر اعتراض ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا۔ تاہم کلفت ہوتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کی یہ بھی رکاکت ہے کہ ان کے نام پرائیویٹ چھٹی آئی تھی۔ انھوں نے اُس کو چھاپ دیا۔ خدا ان بلاؤں سے

نجات دے۔ سوسائٹی کا تعلق خوامخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگل اور پہاڑوں میں بھاگ جاتا مجھ کو اب کرنا کیا ہے ؎

فکریں کبھی تھیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو — اب کہہ رہا ہوں یارب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو عافیت میں گزرتی —— اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے کہ

دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونیکا نہیں — الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

صفحہ ۸۸ (۱۰) ۱۴ر جون ۱۹۱۵ء

میری ایک نو تصنیف غزل کا ایک شعر یہ ہے۔

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن — کس سے کہیئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو

دعا فرماتے رہئے کہ سکون خاطر میسر ہو اصل چیز یہی ہے۔

رقعات بنام شرف الدین احمد خاں صاحب مصنف خیالات

مؤلف سرگذشت بوعلی سینا

صفحہ ۹۳ و ۹۴ (۳)

"آنکھوں کی شکایت نے معذور کر رکھا ہے۔ حرف صاف دکھائی نہیں دیتے۔ بہ ضرورت شدید قلم اُٹھاتا ہوں یہی سبب ہے کہ اپنے مزخرفات پر اب تک نظر ثانی نہیں کر سکا۔ جو کلام میرا شائع ہو چکا ہے اس کو اِدھر اُدھر سے چھاپ دینے میں اجازت کی ضرورت نہیں ہے اور شاید کسی مطبع کو حق اعتراض بھی نہیں ہے۔"

صفحہ ۹۴ (۴)

آپ کا ترجمہ بہت اچھا ہے۔ میرے خط کی کیا ضرورت ہے۔ ناظرین خود ہی دیکھ لیں گے۔

صفحہ ۱۰۲ (۱۴) ۱۰ر اپریل ۱۹۱۰ء

جہاں تک نوشت و خواند کا تعلق ہے پُوری روشنی آگئی۔ سوسائٹی سے ملنے جُلنے اور چلنے پھرنے کے لئے کافی روشنی ہے۔

صفحہ ۱۰۳ (۱۵) ۲۶ر جون ۱۹۱۰ء

وحید کی ناکامیابی کا سخت افسوس ہوا، اس بے چارے پر جو الزام چاہئے لگایئے میں تو اس قدر زیادہ ناکامیابیوں کو سررشتہ تعلیم کی پولٹیکل پالیسی سمجھتا ہوں۔

سیاسی مصلحت۔

صفحہ ۱۱۰ (۲۲) ۶ر اگست ۱۹۱۳ء

"لیٹر فرام دی ہل" LETTERS FROM THE HELL کا ترجمہ آپ نے کہاں تک کیا ـــ اب تو ان مضامین سے مجھ کو زیادہ دلچسپی ہے۔

جہنم سے آئے ہوئے خطوط۔

صفحہ ۱۱۴ (۲۷) ۱۶ر جنوری ۱۹۱۵ء

"کیا بتاؤں کس عالم میں رہتا ہوں ہر روز دس پانچ مرتبہ ایک شعلۂ حسرت سینہ میں مشتعل ہو کر دل کو جلاتا ہے مجھ کو تڑپاتا ہے۔ خود کشی ناجائز اور زندگی بے حلاوت۔"

مرگ ہاشم کی وجہ سے۔

صفحہ ۱۱۵ (۲۸)

"قرآن بہت پڑھا کیجیے اور تسکین حاصل کیجئے۔"

صفحہ ۱۱۸ و ۱۱۹ (۲۹) ۱۳ر جولائی ۱۹۱۶ء

"پانوں کے نیچے آگ ہے اور آگے اندھیرا۔ کھڑا رہوں تو پاؤں جلتا ہے اور آگے بڑھوں تو معلوم نہیں کہاں جا پڑوں۔"

رقعات بنام آنریبل خان بہادر سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا

سابق وزیر تعلیم پنجاب

صفحہ ۱۲۱ (۱) ۲۱ر جون ۱۹۱۰ء

کوئی ذرہ تو اس کا تا بہ دامن اڑ کے پہنچے گا   یہ مشت خاک تیری راہ میں برباد کرتے ہیں (آتش)

کوئی تو ان میں کا پہنچے گا اس دست مبارک تک   یہ دو اک کارڈ اس کی راہ میں برباد کرتے ہیں

صفحہ ۱۲۳ و ۱۲۴ (۳) ۲۰ نومبر ۱۹۱۱ء

الحمد للہ کہ قرآن مونس تنہائی ہے۔ اس وقت اشعار ذیل گذارش کئے جاتے ہیں کہیں چھپے نہیں لیکن بعض صاحبوں نے ان میں بعض کو سنا اور بہت پسند کیا۔

مشرقی کو ہے ذوق روحانی
مغربی میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں
ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست
فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

صفحہ ۱۳۰ و ۱۳۱ (۹) ۱۱ اپریل ۱۹۲۱ء

مجھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ڈاکٹر اقبال کی مثنوی انگلستان میں پسند ہوئی۔ مجھ کو اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم
یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولے

میں اقبال صاحب کی قدر اس سبب سے نہیں کرتا کہ دربار لندن میں وہ مقبول ہیں ؎

طالب ہوں میں تو اپنے ہی دل کی گیاہ کا
سودا نہیں ہے مجھ کو حریفوں کے واہ کا

میں تو زندگی ختم کر چکا اور ہمیشہ ادھر سے بے نیاز رہا ؎

عشق کو کیوں بے خودی مقصود ہے
حسن بے حد ہے خودی محدود ہے

میرا مطلع پیش نظر رکھے۔

اور بھی دور فلک ہیں ابھی آنے والے — خدا ہم سب کی عاقبت بخیر کرے اور باہم ہمدردی عطا فرمائے۔

مکاتیب اکبر بنام جناب مولانا عبد الماجد صاحب بی اے

مصنف فلسفہ جذبات وغیرہ

صفحہ ۵۰۴ (۱) یکم دسمبر ۱۹۱۳ء

آپ ملا نو خیز ہیں شعر کی قدر زیادہ نہ ہوگی۔ لیکن واقعات موجودہ کے لحاظ سے شاید ان اشعار کو نا پسند نہ کیجئے۔

شیخ صاحب تو یہاں فکر مساوات میں ہیں
بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں
قوم کے حق میں تو الجھن کے سوا کچھ بھی نہیں
صرف آنر کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی اور کوئی تیغ بکف
بس یہیں اس رزولیوشن کی خرافات میں ہیں

مسجد کانپور کے متعلق بلوہ اور گرفتاریاں۔

صفحہ ۷ (۴) ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء

"لوگ کہتے ہیں ابوالفضل کیوں نہیں پیدا ہوتے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر پیدا ہوں تو وہ بھی پیدا ہوں۔ یہ میرا خیال ضرور ہے کہ ترجمہ کرنے والے کو اس زبان میں جس میں ترجمہ کیا جائے زیادہ تبحر چاہئے کیونکہ سمجھنے سے سمجھانا مشکل ہے۔"

منطقی شاید کہتے ہیں کہ بلا مدد الفاظ خیال نہیں ہو سکتا لیکن مجھ کو تو غم بلا مدد الفاظ ہوتا ہے۔

صفحہ ۱۱ (۶) ۲۴ر ستمبر ۱۹۱۳ء

آپ کے دوست الہلال کا زر ضمانت ضبط ہو گیا ؎

مغرب کی برق ٹوٹ پڑی اس غریب پر
دور فلک ہلال کو لایا صلیب پر

صفحہ ۱۴ (۱۱) ۱۱ر اکتوبر ۱۹۱۳ء

"نہیں معلوم اس وقت کیا پہلو اختیار کرنا چاہئے کہ قوم و گورنمنٹ دونوں کی بدگمانی سے حفاظت ہو۔"

صفحہ ۱۷ (۱۴) ۲۸ر مئی ۱۹۱۴ء

"سخن دلکش بہت ہیں۔ سخن سنجیدہ کے لئے بہت سمجھ چاہئے۔ میرا ایک مطلع سن لیجئے ہے تو اور ہی رنگ لیکن آپ کچھ حظ حاصل کر سکیں گے۔

بہت دشوار ہے شائستۂ راہ طلب ہونا
نظر کو حد میں رکھنا شوق دل کا با ادب ہونا

صفحہ ۱۷ (۱۵) ۳۱ر مئی ۱۹۱۴ء

"امانت رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس رقم کی بساط ہی کیا ہے۔ اپنے دلی خلوص اور ہمدردی کو میرے لئے امانت رہنے دیجئے۔"

لہ فلسفہ جذبات کی قسمت۔

صفحہ ۲۱ (۱۶) ۱۱ر نومبر ۱۹۱۴ء

میں آپ کی غزل دیکھکر بہت خوش ہوا یہ شعر ہر اعتبار سے سانچے میں ڈھلا ہوا ہے۔

رہی ہر چند عقل صبر آموز نہ گیئں بے قراریاں نہ گیئں

صفحہ ۲۲ و ۲۳ (۲۷) ۱۲ر دسمبر ۱۹۱۴ء

"براہ کرم تکلف کو دخل نہ دیا جائے سادہ غذا شوربا چپاتی کھاتا ہوں اور وہ بھی بہت کم"

صفحہ ۲۳ (۲۵) ۲ر جنوری ۱۹۱۲ء

"الغرض سب شعر اچھے ہیں۔ البتہ افزائش حسن کی گنجائش ہے۔ طبیعت کا ذوق خود اس کو پیدا کرے گا۔ جب عالم معنی کے استغراق سے طبیعت آسودہ و بے فکر ہو کر حسن و صورت کا مذاق پیدا کرے گی۔"

ماجد صاحب کی دوسری غزل۔

صفحہ ۲۶ (۳۲) ۱۵ ۶/۸

مرا ایک شعر ہے ؎

دنیا میں جسے جو پیش آیا اکبر بس اس کے مطابق اس کی حالت بھی ہوئی

حالت میں خیالات اور میلان طبع کو داخل سمجھئے۔ پازیٹو سائینس مشغولی کے لئے خوب ہے لیکن ہمارے حصے میں نہیں آیا۔

صفحہ ۲۶ و ۲۷ (۳۳)

اس وقت آپ کا کارڈ دیکھ کر آپ کے ریمارک پر بے ساختہ ماشاء اللہ چشم بد دور کہتا ہوں۔

اوّل تو یہ کہ وہ مسئلہ فلسفہ آپ کے ذہن میں تھا۔ دوسرے (اور یہ بڑی بات ہے) یہ کہ آپ نے آپ کے ذہن نے میرے شعر کو فوراً اس فلسفے کے مطابق کر لیا۔

جب میں نے یہ شعر کہا تھا اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ ابتداءً ایک یونانی فلاسفر نے یہ مسئلہ بیان کیا تھا۔ اسی طرح جب میں نے یہ شعر کہا ؎

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں

عقیدے عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

اور جس کی داد ڈاکٹر اقبال صاحب نے دی، اس وقت مجھ کو یہ خبر نہ تھی کہ ہیگل نے اس خیال کو وسعت دی ہے لیکن فلسفہ ہے کیا۔

نتیجہ غور و فکر کا آپ نے صفائی بیان کی مجھ کو داد دی ہے ۔۔۔ یہ صفائی بیان غالباً بلکہ یقیناً اس سبب سے آئی کہ میرا اُوریجنل[1] خیال تھا اگر تقلید یا ترجمہ کا سانچہ اس کو پیدا کرتا تو یہ بے تکلفی نہ ہوتی۔

[1] ORIGINAL = اصلی ۔ اچھوتا ۔ نیا۔

صفحہ ۲۸ (۳۵) ۱۸ر ستمبر ۱۹۱۵ء

"مثنوی اسرارِ خودی" مصنفہ ڈاکٹر اقبال صاحب جس میں مصنف نے کہا ہے کہ اپنی خودی کو مٹانے والا فلسفہ جس کا مشرق پر بہت بڑا اثر ہوا، صحیح نہیں ہے۔ خودی کو بڑھانا چاہیئے۔ مثنوی کی نسبت تو کچھ زیادہ کہنا نہ چاہیئے۔ کیونکہ وہ مذہبی اور قومی جوش پر مبنی ہے۔ شعر نہایت اچھے ہیں ۵

هست در هر گوشهٔ ویرانه رقص می کند دیوانه با دیوانه رقص

یہ خودی ہستی و تصوف ہے۔ دیباچہ میں پولیٹیکل دانشمندی بھی ہے ۔۔۔ خطیب دہلی میں کسی صاحب نے میرے اشعار پر ایک بڑا ریویو لکھنا شروع کیا ہے۔ بہت مدح کی ہے لیکن میں اس کو غیر ضروری اور مضر سمجھتا ہوں "۔

صفحہ ۳۰ (۳۹) ۲ر فروری ۱۹۱۶ء

فلسفۂ اجتماع کا شکر گذار ہوں ۔۔۔ آخری فقرے خوب ہیں ان کو دیکھ کر میں نے یہ مطلع کہا۔

زباں پہ کیا ہو تری حمد اور ثنا کے سوا مجھے تو کچھ نظر آتا نہیں فنا کے سوا

قرب شادی میں فلسفہ اجتماع کی تصنیف خوب موزوں ہے۔ میں آپ کی اوریجنیلٹی (ORIGINALITY) کو اصل چیز سمجھتا ہوں آپ کی کیا بلکہ سب کی۔

صفحہ ۳۲ و ۳۳ (۴۲) ۱۱ر فروری ۱۹۱۶ء

"قرآن شوق سے دیکھیئے خوب دیکھئے بہت دیکھئے یہاں تک کہ بلا مدد ترجمہ اس کے ظاہری معنی سمجھنے لگیئے۔ تفسیروں کی تو حد نہیں۔ مذاق مفسرین کی بوقلمونی حیرت انگیز ہے۔ قرآن مجید کو بطور تلاوت پڑھا کیجئے۔ ایک سرے سے پڑھ جایئے اور پھر پڑھئے، زیادہ نہ رکیئے۔ پڑھتے چلے جایئے۔ ثواب کا

عقیدہ نہ سہی۔ لٹریری لطف و ذوق کا خیال کیجئے۔ ہر وقت طبیعت یکساں نہیں رہتی۔ کسی وقت کوئی آیت دل کو متوجہ کرے گی، مزا آئے گا یا کوئی مسئلہ منکشف ہوگا جو اس وقت اور ان روز وں ذہن میں نہ کسی وقت اسی طرح کوئی اور آیت دامنِ دل کو کھینچے گی۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم ؎ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست۔

غور اور اسٹڈی اور کریٹزم (CRITICSM) تنقید اور مضمون نگاری کے لئے قرآن مجید کو خاص طور پر جا بجا حسب مرضی دیکھنے کا کوئی اور وقت نکالئے۔

خدا قرآن کے رو سے قادر مطلق اور خالق کائنات ہے (ماجد صاحب نے لکھا تھا کہ ارسطو کے ایک خیال کے مطابق خدا کو محض علت العلل یا علت اولیٰ ماننے پر کیوں نہ اکتفا کی جائے۔ قرآن سے غالباً یہ پہلو نہیں نکل آئے۔ یہ سارا مکتوب اور اس کے بعد والا مکتوب اسی خیال کی تردید میں ہے) ارسطو نے خدا سے کیا واسطہ ارسطو میں CLASSIFICATION اور GENERALISATION کی بیحد قوت ہے لیکن میں نے کسی فلاسفر کو نہ دیکھا کہ اس کے معاصرین نے یا پیچھے آنے والوں نے اس کی تردید نہ کی ہو ؎

صدیوں فلاسوفی کی چناں اور چنیں رہی لیکن خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی

میں خدا کا نام تو جانتا ہوں۔ خدا کا خیال ناممکن پاتا ہوں۔ ماسوا پیش نظر ہے جہاں اس کا خیال آیا خیال خدا غائب ہوگیا۔ عبرت فنا اس سے دل کو ایک مزا ہے۔ مزا حسب استعداد بہت بڑھ جاتا ہے بمقر چپ ہے۔ منکر کو خبر نہیں۔

صفحہ ۳۴ (۴۳) ۲ رفروری ۱۹۱۶ء

کل میں نے بہت بے تکلفانہ آپ کو ایک خط لکھا لیکن معافی چاہتا ہوں بہت کچھ اریلیونٹ (غیر متعلق) ہے۔ آپ اپنا کورس خود خوب سمجھتے ہیں جو کچھ لکھا وہ سب واپس لیتا ہوں بجز اس کے کہ قرآن مجید میں صرف پرائم موور ہمیں بلکہ خدا قادر مطلق ہے سورہ رحمٰن میں کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِیْ شَاْنٍ ملاحظہ فرمایئے۔ اس کے سوا صدہا آیتیں ہیں۔ ثواب کے یہ معنی بھی سمجھئے کہ دل کو انبساط ہوا کسی مسئلہ کا انکشاف ہوا۔ مجھے تو روزے کا ثواب افطار کے وقت مل جاتا تھا اب تو رکھ ہی نہیں سکتا۔

صفحہ ۳۸ (۵۰) ۲۴ر جون ۱۹۱۶ء

فلسفہ نے اگرچہ آپ کے اجزائے طبیعت کو مستحکم و مضبوط کردیا ہے۔ لیکن آپ موتی ہیں۔ پتھر نہیں، خدا موتی کی آب کو برقرار رکھے۔

صفحہ ۴۵ (۶۱) ۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء

"انسائیکلوپیڈیا کا خیال مجھ کو مدت سے ہے لیکن ذرا اور نجینلٹی (ORIGINALITY) ہونا چاہئے"۔

ماجد صاحب و سلیمان صاحب نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تحریک کی ہے۔

صفحہ ۴۵ (۶۲) ۱۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء

انسائیکلوپیڈیا کی خبر اخباروں میں چھپ گئی ہے ۔ پہلے مجھ کو اپنا یہ مصرعہ یاد آیا تھا ع

فرنیچر ہم لے رہے ہیں اور مکاں کوئی نہیں

پھر میں نے اپنا یہ مطلع یاد کیا ؎

دنیا کی طوالت بیحد ہے خلقت کا تو لمبا قصہ ہے ہر شخص فقط یہ غور کرے اس کل میں مرا کیا حصہ ہے

اس لحاظ سے آپ اور سید سلیمان صاحب راہ پر ہیں، سب کچھ ہوجائے یہ خدا کے ہاتھ ہے

یہ دو شعر بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے۔

خدا نے جو عبرت عطا کی ہو تم کو تو ملت کے اعلیٰ مقاصد کو دیکھو

اُلوالعزمی راجہ صاحب کو سمجھو مذاق سلیمان و ماجد کو دیکھو

راجہ صاحب محمود آباد نے اُردو انسائیکلوپیڈیا کی تالیف و اشاعت کے لئے گرانقدر امداد کا وعدہ کیا تھا۔

صفحہ ۵۰ (۶۸) ۱۳/۲

بلینک ورس ؎ شیعہ سنی کا شغل تھا پہلے پھر مسلمان ہوگیا بندہ پھر رہا چند دن فقط انسان اور بالفعل صرف نیٹو ہوں خرافات ہے مگر اسی سے دن کاٹتا ہوں۔

صفحہ ۵۳ و ۵۴ (۷۳) ۲۳ر مئی ۱۹۱۷ء

فلسفۂ نظام کا مضمون بہت صاف ہے ایسی بحثیں کہ خدا اپنی مثل پیدا کرسکتا ہے یا نہیں

مجھے ہمیشہ تعجب میں ڈالتی ہیں کیوں نہ یہ بھی پوچھا جائے کہ اللہ میاں خودکشی کر سکتے ہیں یا نہیں۔

صفحہ ۵۵ (۸۴) جون ۱۹۱۷ء

"آپ برکلے کا ترجمہ کر رہے ہیں ـــــ کوشش کیجیے گا کہ بیان صاف ہو ـــ ابوالکلامی نہو۔ یہ سچ ہے کہ مباحث ہی پیچیدہ ہوں تو کوئی کیا کرے"

ہندوستان کا پالیٹکس بہت پیچیدہ اور مشکل اور خطرناک ہوتا جاتا ہے اُردو یونیورسٹی بھی اس میں داخل ہے، ہندو کا ہوم رول اور ذوق ہندی بھی اسی میں داخل ہے۔ انڈین کا فوج میں داخل ہونا بھی اسی میں داخل ہے ـــــ خدا وقت لائے کہ آپ کی تصنیفات الماریوں سے سینوں میں اور سینوں سے زبانوں پر پہنچیں۔

صفحہ ۶۵ و ۶۶ (۸۸)

"ظفر علی خاں صاحب سے ملئے تو میر اسلام شوق کہئے وہ پرجوش مسلمان ہیں لیکن قوم کی ناک بھی ہیں"

صفحہ ۶۹ ۶ر جولائی ۱۹۱۸ء

۱۹۱۳ء میں برگسن کا اکسپوزلش شائع ہوا ہے۔ میرا تو دل اب نہیں لگتا کہ کہاں تک ذہن کو قلابازیاں کھلاؤں۔ افلاطون سے لے کر کانٹ ہیگل تک اور ہکسلے تک سب کا عروج وزوال دیکھا۔ لفاظیاں اور خیال آرائیاں ہیں برگسن کی یہی عمر ہے جو دلنشین ہو جائے وہی سب کچھ ہے ـــ کہتا کہ اے دوست (برگسان مشہور فرنچ فلسفی) کی طرف سے جواب لکھیے، مگر نہ موقع، نہ ضرورت نہ تعلق آپ میں تو خود ریویو کی قوت ہے۔

صفحہ ۷۵ (۱۰۲) ۲۷ر مارچ ۱۹۱۹ء

فنا کا خیال گم کر دیتا ہے شاید وہی اچھے ہیں جو یہ کہتے ہیں۔

ذہن صاحب رہیں قیاس کے ساتھ ہم تو فطرت میں ہیں حواس کے ساتھ

بہر حال بہت پیچیدہ مباحث ہیں۔

صفحہ ۷۹ (۱۰۸) ۱۰ر جون ۱۹۱۹ء

خبر آئی اسلامیہ میل میں اخوت کو جانا پڑا جیل میں

ابھی یہ شعر موزوں ہوگیا، الفاظ کی مناسبت اور روحانی پہلو ملاحظہ فرمایئے۔ میں تو بہت INNOCENT [1] سمجھتا ہوں۔

[1] معصوم۔ بے ضرر۔ سادہ جو ہر سیاسی گرفت سے آزاد ہو۔

صفحہ ۸۰ (۱۱۰)

یہ فلسفہ کہ وجود درحقیقت ذہن ہی میں ہے۔ علم باری میں سب کچھ ہے ایسا صحیح فلسفہ ہے کہ میں اس کو کل من علیہا فان ویبقی وجہ ربّک ذوالجلال والاکرام کی ایک صوفیانہ تفسیر سمجھتا ہوں۔ کل من علیہا فان میں لفظ فنا سے ظاہرا یہی سمجھا جاتا ہے کہ بالآخر ہر شے کو فنا ہے لیکن ذہن کہتا ہے کہ بالآخر کیسا جب غور کرو اور حقیقت پر نظر ڈالو تو کل پر فنا حاوی ہو جاتی ہے صرف علم باری رہ جاتا ہے۔

صفحہ ۸۲ (۱۱۴) ۳ جولائی ۱۹۱۹ء

آپ کے سامنے دو شعر پیش کرتا ہوں ؎

موت سے وحشت بشر کا اک خیال خام ہے ۔۔۔ اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے

اس شعر کے متعلق ایک طویل بحث ہوئی ہے۔

غم میں بھی قانون فطرت سے میں کچھ بدظن نہیں ۔۔۔ یہ سمجھتا ہوں کہ میرا دوست ہے دشمن نہیں

صفحہ ۸۵ (۱۱۹) ۲۷/۲ ۱۹

لڑکی کو بہ نسبت لڑکے کے اس زمانے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ داماد اپنا ہوتا ہے بیٹا غیر کا ہو جاتا ہے

(ماجد صاحب کے یہاں لڑکی پیدا ہوئی تھی)

صفحہ ۹۰ (۱۲۶) ۵/۱۰ ۱۹۱۹ء

ناتندرستی زندگی تلخ کردیتی ہے۔ میں تو اس کی نذر ہوگیا ہوں ؎

خلق مجھ سے طالب پابندی اخلاق ہے ۔۔۔ میری یہ حالت کہ مجھ پر تھینک یو بھی شاق ہے

صفحہ ۹۰ (۱۲) ۱۳/۱۰ ۱۹۱۹ء

"دیکھئے ہاتھ کانپ گیا ہندسہ کی شکل بگڑ گئی۔ لیکن دماغ میں بھی غلط قیاس پیدا ہوتے ہیں۔"

صفحہ ۹۲ (۱۲۹) ۵ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

ینگ راڈ سے مجھ کو گرمجوشی کی خواہش دیوانگی معلوم ہوتی ہے ؎

زندہ ہوں تو مجھ پہ ہنسنے والے ہیں بہت مرجاؤں تو کوئی رونے والا نہ رہا

صفحہ ۹۳ و ۹۴ (۳) دہلی ۲۵/۱۰ ۱۹ء

CONTINUITY OF SOUL (بقائے وسلسلہ روح) کا مضمون آپ نے خوب سمجھا میں تو مانتا ہوں۔ چند دہریوں کے سوا سب اس بات پر متفق ہیں کہ روح معدوم نہیں ہوتی ہاں مسلم کہتے ہیں کہ برزخ میں رہے گی، ہندو تناسخ کے قائل ہیں۔

صفحہ ۱۰۳ و ۱۰۴ (۱۴۸)

صادق الملک صاحب نے بھی حرّا والے شعر کو بہت پسند کیا لیکن آپ صاحبوں کو مشاغل حرا کا بھی کچھ خیال چاہیئے۔

؎ رفتار اور سمت میں موج ہوا کی ہے اے قصہ گوئے بدر ضرورت حرا کی ہے

صفحہ ۱۰۲ (۱۴۹) ۶ر جون ۱۹۲۰ء

چند روز ہوئے یہ شعر موزوں ہوا تھا ؎

حسن بت دیر میں کھینچے لئے جاتا ہے ہمیں کیا نتیجہ ہے برہمن سے کھنچے رہنے کا

جب انگریزیت ہم پر ہر طور سے چھائی ہوئی ہے تو ترک موالات سے کیا نتیجہ۔

صفحہ ۱۱۰ (۱۵۹) ۱۵ر اکتوبر ۱۹۲۰ء

حصہ چہارم میں اپنی ایک نظم دیکھی ؎

جس بات کو مفید سمجھتے ہو خود کرو اوروں پہ اس کا بار نہ اصرار سے دھرو

کافی ہے بس یہ وعظ کہ عزت ضرور ہے تقویٰ بہت ضرور ہے اللہ سے ڈرو

حالات مختلف ہیں ذرا سوچ لو یہ بات دشمن تو چاہتے ہیں کہ آپس میں لڑ مرو

صفحہ ۱۱۴ (۱۶۷) ۲۲/۲ ۲۱

"آپ سے ملنے کا مشتاق ہوں اگرچہ بہت علیل ہوں ایسا کہ حواس کو انجوا نے نہیں کر سکتا۔"

صفحہ ۱۱۸
(۱۷۳)

"حوادث نے اسی حلقہ میں رہنے پر مجبور کیا ہے جس کو ہم سے مذاق وخیال میں تبائن کلی ہے۔"

مکاتیب اکبر بنام لسان الہند عزیز لکھنوی

صفحہ ۴۳ (۱۰) ۵ر مئی ۱۹۱۰ء

"میری زیادہ تر توجہ تردید الحاد پر رہی جو اس زمانے میں پھیل گیا ہے۔ بہت پولٹیکل اشعار ہیں، بہت اخلاقی ہیں ـــــ اکثر اشعار شرح طلب ہیں۔ اس میں میں عام قواعد کا پابند ہوں اگر ظاہرا کہیں تجاوز ہے تو وہ دلیل کے ساتھ ہے۔"

صفحہ ۵۳ (۲۴) ۲۴ر نومبر ۱۹۱۰ء

"کیا کہوں کیا گذری اور کیا گذر رہی ہے، اس حادثہ کا وہم وگمان بھی نہیں تھا۔ مرحومہ کے ساتھ عشرت منزل کا خاتمہ ہوگیا۔ ہاشم گیارہ سال کا ہے اگر زندہ رہا تو اس کی شادی کے بعد شاید یہ گھر پھر زندہ ہو، عشرت تو پردیس کے ہو رہے۔"

ہائے اکبر کی اکبری نہ رہی۔

صفحہ ۵۸ (۲۶) ۱۷ر فروری ۱۹۱۱ء

یونیورسٹی کی دھوم ہے۔ ایگزیبیشن کی دھوم ہے۔ دہلی دربار کی دھوم ہے۔ لندن میں مسجد کی دھوم ہے۔ ہماری آپ کی ترقی کی دھوم ہے۔ ہز ہائینس آغا خاں کی دھوم ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش　　من انداز قدرت را می شناسم

EXHIBITION = نمائش۔

صفحہ ۵۹ (۲۸) ۶ر مئی ۱۹۱۱ء

"اسکولی شاعری مشکل ہے۔ ملازمان سررشتہ تعلیم کا حق ہے آپ جب ارادہ کریں گے مشکل پڑے گی ہاں بلا ارادہ بہت ایسے اشعار نکل آئیں گے جو منتخب ہو سکیں۔"

صفحہ ۶۴ و ۶۵ (۳۲) ۴ اکتوبر ۱۹۱۱ء

نئی پرانی روشنی کی مکالمت کے عنوان سے چھپوا دیجئے آخر میں ایک بریکٹ میں (وہ بھی ننھا سا بریکٹ) صرف اکبر لکھوا دیجئے۔ نہ حضرت نہ سلامت نہ خان بہادر پھر دیکھا جائے گا۔۔۔ یونیورسٹی کا میں ایسا ہی خیر خواہ ہوں جیسا انگریزی عملداری کا۔ یونیورسٹی ہماری تکمیل نفس بلکہ تکمیل انسانیت کیلئے اتنی ہی ضروری ہے جس طرح انگریزی عملداری ہم کو مہذب انسان بنانے کے لئے ضروری تھی یونیورسٹی قوم کے لئے ضروری نہ ہوتی تو لندن سے کیوں صدا اٹھتی اور ہمارے رئیس اس کے لئے کیوں دوڑتے، ہماری سمجھ جو مشرقی لٹریچر اور ہمارا مذاق جو دیرینہ عادات پر مبنی ہے معیار صحیح نہیں ہے۔ اس رنگ کو نیا خون خوب سمجھتا ہے۔ اسی کو مزا بھی آئے گا ہم تو قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔

صفحات ۶۵ و ۶۶ و ۶۷ (۳۳) ۷ نومبر ۱۹۱۱ء

سید صاحب کا ارادہ تھا کہ علی گڈھ یونیورسٹی ہو جائے وہ ارادہ اب پورا ہوگا۔ میرے ذہن میں یہ چار مصرعے آئے تھے۔

ابتدا کی جناب سید نے جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی قوم کا کام اب تمام ہوا

لیکن میری شاعری کا ضعف تھا کہ اس نظم سے کام پورا نہ ہونے کے معنی نہ پیدا ہوئے بلکہ ایک اور پہلو نکل آیا، نئی روشنی کی پبلک سے داد ملنے کی امید نہ رہی۔

یونیورسٹی سے پرانی روشنی کی وحشت بھی بجا ہے اور نئی روشنی کا ادھر میلان بھی قانون فطرت کے مطابق ہے۔ پرانی روشنی اپنی مجموعی لیکن خیالی حالت کی شیفتہ ہے، نئی روشنی اپنی منفردہ (یعنی ہر شخص بالانفراد) لیکن واقعی حالت کی شائق ہے۔ نیچر[۱] نئی روشنی کے ساتھ ہے۔ کوئی زبردست طاقت نہیں ہے کہ نیچر کو پرانی روشنی کے مطابق کا تابع کر کے مجموعی حالت میں لائے آپ کا خیال صحیح ہے کہ پرانے بزرگ لکیر کے فقیر اور ضرورت زمانہ سے بے خبر ہیں۔ بیشک نئی روشنی کا ساتھ دنیا کو دینا چاہئے ورنہ کس کے ہو کے رہیں گے اور کدھر جائیں گے، اسی بات پر صبر کرنا چاہئے کہ نئی روشنی میں گو ہر شخص باخبر ہے لیکن اپنی ہی ضرورت سے الفاظ کچھ ہوں مطلب اپنا ہے ۵

---

[۱] NATURE = فطرت

دلا دے ہم کو بھی حاجت سے لائلٹی کا پروانہ　　قیامت تک رہے سیّد ترے آنر کا افسانہ

اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ ؎

بہت مشکل ہے نبھنا مشرق و مغرب کا یارانہ　　اِدھر حالت فقیرانہ اُدھر سامان شاہانہ

لیکن جن کو یارانے کا شوق ہے وہ یہی کہتے ہیں ؎

مبارک شیخ کو نان جویں کے ساتھ یہ قرأت　　ہمیں تو دیر میں پرشاد کھانا اور بھجن گانا

بعض لوگ یہ معذرت کرتے ہیں اور ان کی معذرت کسی قدر بجا ہے ؎

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہ سید سے　　قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں

صفحہ ۲۹　　(۳۶)　　۱۳ر جنوری ۱۹۱۱ء

ان ایڈیٹروں کے اصرار سے پریشان ہوتا ہوں پھر آپس میں ایسی تلخ فیلنگس[1] پیدا ہوتی ہیں۔ اخلاقی حالت ملک روز بروز پستی کی طرف جا رہی ہے۔ دولت اور علم باطن کی کمی کا اقتضا ہی یہ ہے۔ کل ایک عجیب شعر ذہن میں گذرا، ملاحظہ فرمائیے گا کیا پہلو ہیں۔

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم　　یہی ہے عشق تو اب ترک عاشقی اولے

[1] FEELINGS = جذبات حسیات۔

صفحہ ۷۰ و ۱۷　　(۳۸)　　۲۳ر جنوری ۱۹۱۲ء

ایک صاحب نے جالندھر سے رسالہ اُردو نکالا ہے۔ اُردو زبان کی درستی کے لئے ٹائٹل پیج پر یہ شعر پاتا ہوں۔

خال رخ علم بے گماں ہے اُردو　　معنی کی زمیں کا آسماں ہے اُردو

مجھ کو تامل ہے کہ "آسمان اُردو" ہے یا "اُردو آسمان" ہے صریح ظاہر ہے کہ اُردو کو آسمان کہا ہے، پس علامت اضافت اُردو کی تابع اور تانیث ہونا چاہئے۔ معنی کی زمین کی آسمان ہے اُردو، اگر اُردو کو خبر نہ کریں اور دو فقرے ہوں یعنی یوں کہیں کہ "معنی کی زمین کا آسمان کوئی ہے؟" اور جواب دیا جائے کہ اُردو اس وقت زمین کا آسمان صحیح ہے لیکن اس وقت بھی جوابی فقرہ اُردو میں مقدر ہوگا کہ "معنی کی زمیں کا آسمان اُردو ہے" میں کہوں گا یہ عورت اس جنگل کی شیر ہے نہ یہ کہ جنگل کا شیر ہے۔ تاہم بحث نازک ہے آپ کیا کہتے ہیں — ہاں صاحب آپ ارمانوں اور افسانوں کو

قافیہ کریں گے اور ایوانوں اور ویرانوں کو قافیہ کریں گے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ ایطائے خفی ہے۔
ارمان اور افسانہ میں واو نوں جمع لگا دیا۔ اسی طرح ایوان اور ویرانہ میں واو نوں جمع لگا دیا۔

صفحہ ۷۲ (۴۰) ۲۷ جنوری ۱۹۱۲ء

میرے سوالات سے آپ متردد اور متامل ہوں گے۔ یہ بحثیں ایسی ہی ہیں۔ اب میں اپنا خیال عرض کئے دیتا ہوں۔ امر اوّل قاعدے کے رو سے وہی صحیح ہے جو میں نے عرض کیا "اس جنگل کا شیر بلی ہے"۔ "اس جنگل کی شیر بلی ہے"۔ اس مثال سے معانی مختلف صاف ظاہر ہیں لیکن روک ٹوک نہ چاہیئے۔ جو ترکیب سامعین پر گراں نہ ہو جائز ہے۔ امر دوئم میرے نزدیک یہ قافیہ جائز ہے گو مستحسن نہ ہو، لفظ مکتوبہ کا اعتبار کیا جائے تو بعد حذف علامت جمع ارماں و افساں رہ جاتا ہے، یہ دونوں لفظ خود قافیہ یکدیگر ہیں۔ فارسی والوں نے الف نوں کا خیال کیا تھا اُردو کے واؤ نوں کا خیال نہیں کیا۔

صفحہ ۷۳ و ۷۴ (۴۱) ۳ر فروری ۱۹۱۳ء

آپ سے نظر ثانی کی درخواست ہے ان فقرات کو ملاحظہ فرمایئے۔ "اُس جنگل کا شیر بلی ہے"۔ "اس جنگل کی شیر بلی ہے"۔ شیر دونوں جگہ مضاف ہے۔ لیکن دیکھیئے دونوں فقروں کے معنی الگ ہیں۔ جب مضاف مشبہ بہ ہو تو مشبہ کے تابع ہو جاتا ہے اور علامت اضافت کی تانیث و تذکیر مشبہ کے اعتبار سے ہوتی ہے الّا اس صورت میں کہ مشبہ صراحتاً مذکور نہ ہو ــــ چونکہ یہ رسالہ قواعد کی ترتیب و تعین کا مدعی تھا۔ اس طرف نظر گئی ــــ توالی اضافت مخل فصاحت ضرور ہے لیکن یہ مخل بیچارگی ہے۔ ع جمالِ پاک رخ شاہ بحر و بر دیکھا۔ کیا صاف مصرعہ ہے اُردو میں کہئے۔ بحر و بر کے شاہ کے پاک رخ کے جمال کو دیکھا۔ کے کے کی صدا کیا بُری ہے۔

کس قدر۔ بہت۔

صفحہ ۷۶ و ۷۷ (۴۲) ۱۳ر جولائی ۱۹۱۳ء

"مخزن میں میرے چند شعر چھپے ہیں۔ میرا مصرعہ تھا ع اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا۔ ایڈیٹر صاحب نے ع کیا خوش جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا، بنا دیا ہے۔ خوش کو خشک کے ساتھ انھوں نے مناسب سمجھا لیکن شاید زبان تو وہی ہے جو میں نے لکھا تھا۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔

فارسی میں تو خوش گفتنی" خوب ہے لیکن اُردو میں کیا خوش آپ نے کہا مجھے تو اچھا نہیں معلوم ہوتا"۔

صفحہ ۸۰،۷۸و۸۰ (۴۶) ۱۶راکتوبر ۱۹۱۲ء

"زمیندار نے ایک پرچہ میں اس عنوان سے "لسان العصر کے ۳۰ نشتر" بہت سے شعر چھاپے لیکن یہ نہ لکھا کہ کلیات دوم سے منتخب ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو لکھا کہ ۳۱ واں نشتر ملاحظہ ہو ؎

کھلا دیوان مرا تو شور تحسیں بزم میں اٹھا مگر سب ہو گئے خاموش جب مطبع کا بل آیا

غالباً اب وہ اشتہار چھاپ دیں ــــ آج کل یہاں یہ حال ہو رہا ہے جس پر یہ کہنا پڑا۔

گئے وہ دن کہ جنوں تھا مجھے پری کے لئے حواس باختہ ہوں اب تو ممبری کے لئے

صفحہ ۹۵ و ۹۶ (۶۶) ۵ر مارچ ۱۹۱۴ء

حال میں دو چار شعر کہے تھے۔ بعض حضرات نے ان کو بہت پسند کیا نقلیں لے گئے ؎

تو وضع پہ اپنی قائم رہ قدرت کی مگر تحقیر نہ کر دے پائے نظر کو آزادی خود بینی کو زنجیر نہ کر

گر تیرا عمل محدود رہے اور اپنی ہی حد مقصود رہے رکھ ذہن کو ساتھی فطرت کا بند اس پہ در تاثیر نہ کر

دو شعر اور ہیں۔

باطن میں ابھر کر ضبط فغاں، لے اپنی نظر سے کار زباں دل جوش میں لا فریاد نہ کر تاثیر دکھا تقریر نہ کر

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر

ایک تازہ شعر اور سناتا ہوں۔

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

صفحہ ۹۸ (۶۷) ۶ر مئی ۱۹۱۴ء

افسوس ہے کہ آپ کا مکان سڑک میں آ گیا۔ عجیب اتفاق ہے تھوڑا زمانہ گذرا میں نے مطلع کہا تھا ؎

تنگ دنیا سے دل اس دور فلک میں آ گیا جس جگہ میں نے بنایا گھر سڑک میں آ گیا

صفحات ۹۹و۱۰۰و۱۰۱و۱۰۲ (۷۰)

آپ کے شعر پر شاعرانہ وجد آیا کیا بات پیدا کی ہے ؎ میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی۔

(دل سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہوں گے ؛ میں نے پردہ جو اٹھایا تو قیامت دیکھی)

واہ ـــــ معترض صاحب کا اعتراض اگر میں یہ نہ سنتا تو کبھی یہ وہم بھی آتا۔ اوّل مصرعہ میں جو ضمیر غائب ہے سارا مدارِ معنی اور انحصارِ رجوعِ خیال سامع اسی پر ہے۔ فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ "وہ ہوں گے تنہا" وہ کے لفظ سے اگر خواہ مخواہ اور ضرورتاً اور بلا ارادہ اور فطرتِ سامع کی زبردستی سے خیال بی گوہر جان کی طرف رجوع ہو گیا تو دوسرا مصرعہ نہ معلوم کیا مکروہ منظر اس کے سامنے پیش کرے لیکن عارفانہ مذاق اور بلند خیالی اس ضمیر کو "شاید تنہا نشین مسندِ حسن" (عرفی) کی طرف رجوع کرے گی۔

یہ فقرہ کہ خلوت میں وہ ہوں گے تنہا۔ پہلے مصرعہ میں صریحاً اس کی تائید کر رہا ہے اور کسی رقیب کا گذر ہے اور اس سے ہم آغوش ہے تو باوجود دوسرے مصرعہ کے یہ الفاظ مصرعہ اوّل کے نہ ہوتے بلکہ یوں کہا جاتا کہ میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں رقیب ان سے کچھ باتیں کر رہا ہے لیکن پردہ اٹھایا تو وہ ظالم مشغول..... شرت تھا یعنی قیامت ہو رہی ہے۔ یا یہ کہا جاتا میں سمجھتا تھا کہ خلوت میں وہ تنہا ہیں لیکن جا کر دیکھا تو رقیب بھی موجود تھا حالت علٰحدگی اور بجا..... کا تقابل یا حالت تنہائی اور حالت موجودگی غیر کا تقابل ہو سکتا ہے۔ تنہائی اور..... شرت کا کوئی منطقی تقابل نہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا خیالِ سامع کا میلان ہے کہ فوراً اسفل کی طرف رجوع ہوا۔

نگویم سماع اے برادر کہ چیست   اگر مستمع را بدانم کہ کیست
گر از برجِ معنی پرد طیرِ او   فرشتہ فرو ماند از سیرِ او
وگر مردِ لہوست و بازی و لاغ   قوی تر شود دیوش اندر دماغ

لیکن معترض صاحب معذور ہیں سوسائٹی کا یہی مذاق ہے۔ انھوں نے نیک نیتی سے ایسا خیال کیا ہوگا۔ قیامت کے لفظ سے شاعر جو مراد چاہے لے۔ لیکن اُردو زبان یا کسی زبان میں یہ لفظ مباشرت کے معنی نہیں پیدا کرے گا۔ "اس نے صرف دیکھ لینے کی اجازت دی آپ نے قیامت کی کہ بوسہ لے لیا" یہاں بوسہ ہی قیامت ہوا ـــــ میں آپ کے معترض صاحب کی خاطر یا سوسائٹی کی خاص حالت کے لحاظ سے مشورہ دے سکتا ہوں کہ شعر پڑھنے سے پہلے کہہ دیجئے کہ عارفانہ یا حقیقت کا رنگ ہے۔ لیکن عام طور پر ضرورت نہیں شعر صاف ہے" میں سمجھتا تھا کہ آخرت میں خدا اکیلا نظر آئے گا۔ وہاں تو قیامت نظر آئی۔ قیامت کا لفظ قابلِ داد ہے اور بھی نازک مفہوم پیدا ہوتے ہیں۔ بیان میں لطف کہا جاتا ہے۔ کیا یہ اعتراض نہیں ہو سکتا ہے۔ قیامت کی خبر تو خدا سے

پہلے ہی دے دی ہے۔ آپ کو اس پر حیرت کیا ہوئی۔ لیکن کیا یہ جواب نہیں دیا جاسکتا کہ یہ شعر مولوی صاحب نے نہیں کہا، ایک عاشق نے کہا ہے وہ تو معشوق کو تنہا ہی تصور کرتا ہے اور تنہا ہی پسند کرتا ہے۔ کسی ایرانی نے خوب کہا ہے ؎

جہانے مختصر خواہم کہ دروے ہمیں جائے من وجائے تو باشد

شاعر کے خیالات کسی قانون کے پابند نہیں ہوتے اور بھی مزے ہیں۔ میرا یہ مطلع ملاحظہ فرمایئے حشر سے بھی آگے بڑھ گیا ہوں ؎

میرے دل سے امیازدی وفردا اُٹھ گیا حشر بھی ماضی نظر آیا جو پردا اُٹھ گیا

میں نے شاید بے ضرورت خامہ فرسائی کی ہے سوال یہی ہے کہ لفظ قیامت بمعنی مباشرت ہے یا نہیں۔ دوسرے شعر کیسا ہے؟ جواب یہ ہے کہ قیامت بمعنی مباشرت نہیں۔ شاعر جو مراد چاہے اس سے لے بشرطیکہ صاف طور پر اس کا اظہار ہو —— اور شعر اچھا خاصہ پر تکلف معنی خیز ہے۔ لفظ قیامت کی داد دینی چاہیئے۔

صفحہ ۱۱۰ (۸۲) ۲۰ رجنوری ۱۹۱۶ء

سانس لیتا ہوں تو اب خون کی بُو آتی ہے۔ قیامت کا مصرعہ ہے۔ مجھ کو کہنا چاہیئے تھا آپ کی زبان سے کیونکر نکل گیا۔ آپ لکھتے ہیں کہ خدا جانے یہ شعر صحیح ہے یا نہیں۔ ایسے شبہات کی میں بہت قدر کرتا ہوں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے کمال ارادی اور ساری دنیا کے مذاق ادراک وفہم سے مستغنی ہو کر اپنا جذب دلی ظاہر کیا ہے اور اب اس کو خیال آیا کہ آیا یہ آواز اُس عالم گردو پیش کے موافق ہے یا نہیں جس میں فطرت نے اس کو جگہ دی ہے۔

کالج کے باب میں آپ نے پوچھا ہے زمانے کی موجیں ہیں دیکھتے رہیئے۔ یکجائی میں کیا دقت تھی۔ افتراق سے ضعف ہوگا ؎

شیعہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم داد خواہ ہیں سُنّی یہ کہہ رہے ہیں ہم بے گناہ ہیں
ممبر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم اہل جاہ ہیں لیڈر یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم رو براہ ہیں

صاحب یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم بادشاہ ہیں
کس کو خبر کہ حضرت اکبر تباہ ہیں

صفحہ ۱۱۴ (۸۲) ۸ر اپریل ۱۹۱۶ء

استغفر اللہ۔ نہ میرا خیال۔ نہ میری زبان۔ کچھ لوگ پیدا ہوئے ہیں خرافات بک کر میرے نام سے منسوب کر دیتے ہیں۔ مجھ کو اس لغو کی مطلق خبر نہیں۔ آپ فوراً تردید کر دیجئے۔ بلکہ اخبار میں چھپوا دیجئے مجھ کو بے حد غصہ آیا۔ اور افسوس ہوا۔ آپ کو فی الفور تکذیب و تردید کر دینی چاہئے تھی کہ اسلوب سخن پکار نہیں رہا ہے کہ میں اس کا مصنف نہیں ہو سکتا۔ میں تو پڑھ بھی نہیں سکا نہ سمجھ سکا۔

صفحہ ۱۱۴ (۸۸) ۱۰ر اپریل ۱۹۱۶ء

جو قطعہ میرے نام سے آپ کے پاس پہنچا تھا۔ اور آپ نے مجھ سے دریافت کیا تھا میں اُس کو پڑھ نہ سکا تھا۔ طبیعت اچھی نہ تھی اور ہنوز دل و دماغ پر قابو نہیں۔ تخیر کی شدت تھی۔ بدگمانی اور سوء خیال کے جوش میں سمجھا کہ اس میں کچھ توہین اور استہزا ہے خوب دہائی تہائی دی اور آپ کو لکھا کہ معاذ اللہ اس خرافات سے مجھ کو کیا تعلق۔ اس وقت عشرت نے پڑھ کر سنایا۔ مصنف نے کچھ بدنیتی نہیں کی۔ بارہ کی رعایت لفظی کی ہے لیکن نہیں معلوم کہ میرے نام سے کیوں منسوب کیا مجھ کو اصلا تعلق نہیں ہے۔ مصنف جو صاحب ہوں اپنے مضمون پر مستحق داد ہیں بہر حال خرافات بھی میرے نام سے مشہور ہیں خیال رکھئے گا۔

صفحہ ۱۱۶ (۹۱) ۱۵ر مئی ۱۹۱۶ء

آپ کے لئے موجودہ شغل کالج ضرور دلچسپ ہوگا۔ البتہ بے سود مباحث نفس نواز سے احتراز اولیٰ ہے بلکہ فرض لیکن سب آپ کے خیال کے ہوتے تو کالج کی ضرورت ہی کیا ہوتی۔ امید ہے کہ کالج سے تہذیب کی ترقی ہو میں تو کبھی ایسے خیالات سے دل کو تسکین دے لیتا ہوں۔

جھنجھوٹی میں یہ مصرعہ گا رہی تھیں رات بی مُنّی
شگوفہ نفس ہی کے ہیں نہ یہ شیعہ نہ یہ سُنّی

صفحہ ۱۲۲ (۹۷) جولائی ۱۹۱۶ء

تعمیل ارشاد نہ کر سکا صرف ایک شعر جو معما کی صورت میں ہے عرض کرتا ہوں۔

اَنَا مَدِینَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا۔

دکھا رہی ہے یہ ترکیب حسن طبع سلیم
علیؓ کی تم میں جگہ ہو تو بس وہ ہے تعلیم

ت علی م یعنی ت اور م کے اندر علی کو جگہ دیجئے۔

صفحہ ۱۲۳ (۹۸) ۱۹۱۶ء

"عارضی ہیجان نفس کو میں اصلی باطنی اور روحانی ترقی نہیں کہہ سکتا پالیٹکس میں یہ دیکھتا ہوں کہ

اے صبا مایہ سودا نہ تو داری و نہ من　　　بوئے آں زلف چلیپا نہ تو داری و نہ من

اور یوں تو دنیا چلی ہی جائے گی"۔

صفحہ ۱۲۷ و ۱۲۸ (۱۰۵) ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۱ء

معلوم نہیں 'فریاد بھرنے کا کیا ہوا۔ اشعار ہے ہوں تو مجھے بھی سُنا ہیے۔ میں نے بھی قافیہ پیمائی کی ہے ؎

ساغر دل میں شراب طرب ایجاد بھرے　　　نہ ڈرے شوق کہ غصے میں ہیں حساد بھرے

دوست رکھتا ہوں میں ایذا کو یہ ممکن ہی نہیں　　　آپ کے ظلم سے میرا دل ناشاد بھرے

خون بسمل کو پہنچنے دے ذرا دامن تک　　　یوں طرارے نہ عبث توسن جلاد بھرے

وعظ ایسا نہ ہو جو دل کو مکدر کر دے　　　خاک اس شیشہ میں کیوں صاحب ارشاد بھرے

چاہئے سینۂ شاگرد میں بھر دے وہ علوم　　　کیوں کتابوں سے عبث بکس کو استاد بھرے

وہ بھی کیا دن تھے جوانی و جنوں کے اکبرؔ　　　رہتے تھے جب مری محفل میں پری زاد بھرے

صفحہ ۱۳۲ (۱۱۴) ۳ راپریل ۱۹۱۷ء

میرے چند اشعار ہمدم میں چھپے ہیں لیکن صواب کی جگہ ثواب لکھ دیا ہے۔ بے معنی یہ بھی نہیں بے جوڑ ہے۔

صفحہ ۱۳۶ (۱۲۰) ۶ ر ستمبر ۱۹۱۷ء

اگر میری یاد صحیح ہے تو زہر عشق میں یہ شعر ہے ؎

میں اکسنے تلک نہیں پاتی　　　ورنہ اپنے کئے کو خود آتی

یعنی ذرا سر بھی اٹھانے نہیں پاتی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اکسنا اور اکسانا لازم و متعدی دونوں ہے۔ اسکانا تو بتی کے لئے مخصوص ہے لیکن چراغ کی بتی۔ اب تو اس لفظ کا چراغ ہی گل ہے لمپ کی بتی کو چڑھاتے ہیں یا پیچ اوپر کو گھماتے ہیں۔ اکسانا۔ تحریک کرنا۔ زیادہ عمل کرنا۔ میں تو

یہی سمجھتا ہوں۔ کوئی شعر یاد نہیں یہ مصرعہ کہہ سکتا ہوں ع خود تو دبکے ہوئے ہیں قوم کو اکساتے ہیں بتی کو اکسانا تاکہ روشن ہونے کی استعداد اس میں زیادہ ہو جائے معناً تو صحیح ہو گا لیکن محاورہ اسکانا ہی تھا۔ شعرا میں یہ لفظ زیادہ رائج نہ تھا وہ شمع اور گل گیر کے پروانے تھے۔

صفحہ ۱۳۷ (۱۲۳) ۳۰ ستمبر ۱۹۱۷ء

اپیل بہ جناب عزیز

ادھر میں نے آپ سے یاسؔ صاحب کا پتہ پوچھا۔ ادھر نظارہ میرٹھ میں ان کا ایک مضمون نظر سے گذرا جس میں انھوں نے میرے چند اشعار لکھے ہیں اور بہت مبالغہ آمیز مدح کی ہے اس کے پہلے بھی مجھ کو انھوں نے بہت داد دی۔ چراغ سخن میں بھی بہت کچھ تحریر فرمایا۔ ان کی محبت و مہربانی ہے کہ میری ایسی مدح کرتے ہیں جس کا میں مستحق نہیں ہوں لیکن میں نہیں سمجھتا کہ ایسی مدح سے جس سے لوگوں میں بددلی پھیلے۔ اور بدگوئی اور مخالفت پر آمادگی ضروری سمجھی جائے کیونکر لائق مسرت متصور ہو۔ غالبؔ کو میرے سامنے طفل مکتب کہنا کیا معنی رکھتا ہے۔ یاسؔ صاحب کے سامنے غالباً طفل مکتب ہوں گے لیکن میرے سامنے وہ استاد ہیں میں اندیشہ ناک ہوں کہ ناواقف حضرات یہ سمجھیں گے کہ میرے اشارے سے ایسا لکھا جاتا ہے یا فی الواقع میرا ایسا خیال ہے۔ حاشا و کلا غالبؔ تو غالب ہی تھے اسوقت بھی چند حضرات کے سامنے میں بالکل بے علم و مبتدی ہوں یہ خط آپ کو اس واسطے لکھتا ہوں کہ ہوسکے تو کسی مناسب طریقہ سے کوئی مضمون لکھئے۔ شائع کر دیجئے۔ مجھ کو بدگمانیوں سے بچائیے۔ میں نے یاسؔ صاحب کو بھی سابق میں لکھا تھا اب تو ان کا پتہ ہی نہیں معلوم۔ لکھئے کہ یہ پیرایہ بیان قابل تسلیم نہیں فتنہ انگیز ہے اور وہ خود یقیناً اس کو سخت ناپسند کرتے ہونگے ان کو مطلق دعویٰ نہیں ہے وغیرہ وغیرہ

صفحہ ۱۴۲ (۱۳۰) ۲۵ فروری ۱۹۱۸ء

رات بے ساختہ یہ مضمون دل میں آیا۔

اللہ کی تلاش جو ہو کھو بھی جائیے
جو آپ کہہ رہے ہیں یہی ہو بھی جائیے
بیداری حواس ہے ظلمت کدہ میں یار
افسانہ سن لیا ہے تو اب سو بھی جائیے

صفحہ ۱۲۲　　(۱۳۱)　　۲۷ر فروری ۱۹۱۸ء

زندگی باوجود ان داغ ہائے دل کے اگر بار نہ ہو تو اس کی زبردستی اور فطرت کا طلسمی اثر ہے لیکن زندگی شیریں نہ رہی۔

صفحہ ۱۵۴　　(۱۴۹)　　۵ر نومبر ۱۹۱۸ء

تنہائی میں دل دنیوی اندیشوں کو پیش کر دیتا ہے تو پریشان ہو جاتا ہوں۔ اسی خیال کو نظم کر دیا ہے ؎

خواہش پہ خواہش اس میں بھری ہر لحظہ ہے اک شوریدہ سری
اندیشوں کی کثرت اور غضب اک آتا ہے اک جاتا ہے
دنیا کی خلش جب نفس میں ہو پھر لطف سکون طبع کہاں
صحبت میں ہے غوغا دشمن جاں تنہائی میں دل سر کھاتا ہے

دل کے سر کھانے کو دیکھے گا۔

صفحہ ۱۵۵　　(۱۵۱)　　۲۰ر نومبر ۱۹۱۸ء

اشعار کے ضمن میں کبھی کبھی چیستاں اور معما پر بھی طبع آزمائی کر لیتا تھا از انجملہ یہ ہے۔
"وہ کون چیز ہے کہ اس کو دل میں رکھو تو ازل میں پہنچ جاؤ"!!
اس کا جواب راز دل کے اندر داخل کیجئے یعنی راز کے اول د اور آخر میں ل رکھئے تو دراز ل ہو۔

صفحہ ۱۵۷　　(۱۵۴)

وہی املا ہے جو آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ شطرنج کی بساط ظاہر ہے۔ یہ لوگ بھی اپنی چیزیں کسی تختہ وغیرہ پر پھیلا کر بیچتے تھے۔ لفظ بساطی وضع کر لیا گیا ہے میرا خیال ہے۔ بہر کیف بساطی کو ط سے لکھتے ہیں

صفحہ ۱۶۵　　(۱۶۲)　　۲۶ر جون ۱۹۱۹ء

میں خیال کرتا ہوں کہ مستی کا لفظ اس وقت میں مکروہ ہے جب ذم کا پہلو نکلے۔ شراب کی مستی گناہ ہے مگر شعرا میں بہت دل پسند ہے۔

صفحہ ۱۶۷ و ۱۶۸　　۱۶۶　　۹ر جولائی ۱۹۱۹ء

کئی دن ہوئے یہ دو شعر بے ساختہ موزوں ہو گئے۔ غلط یا صحیح لیکن میرے حسب حال ہیں ؎

دنیا سے تعلق جن کو ہے وہ خوش نہ سہی مشغول تو ہیں
پژمردہ سراپا بھی ہیں اگر شاخوں میں لگے ہیں پھول تو ہیں
آفت تو ہماری جان پہ ہے دنیا سے تعلق چھوٹ گیا
بس طوق گلو ہے رشتۂ جاں امید سے رشتہ ٹوٹ گیا

ہوش میں لائی ہیں اب مایوسیاں نشۂ امید فردا ہو چکا

صفحہ ۱۷۵ (۱۸۸) ۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

خواجہ صاحب نے سرسری طور پر نوٹ لکھدیئے۔ ان مضامین میں جس طور پر نوٹ کئے گئے ہیں بہت کسر ہے۔ میں آپ کے حسن عقیدت کو دیکھتا ہوں کہ آپ نے بے دریغ مدح کردی۔ ہر چیز میں ایک یہ قول فنیا غورث کا تھا اس کی تشریح ذرا اور ہونی چاہئے۔ آغوش فطرت بھی تشریح طلب ہے ؎

خیال وسعت تحقیق تا کجا اکبر کہ ہر نگاہ ہے محتاج اک فسانے کی

صفحہ ۱۷۶ (۱۸۹) ۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

میں نہیں سمجھا کہ فرد کو کس محل میں استعمال کرنا ہے کہ تذکیر و تانیث کی ضرورت ہے دوسرے مفہومات کے تابع خیال میں آیا۔ لکھنو کی فردیں زبان پر ہے۔ یہ شخص اپنے وقت کا فرد ہے۔
مثلاً بلبل مذکر واحد۔ بلبلیں مؤنث جمع۔

صفحہ ۱۷۷ (۱۹۱) ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

بہ اعتبار ذات مشارٌ الیہ کے میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں۔ بہرحال یہ صفت ہے تو خیال موصوف کا ضرور ہے اور جب ایسا نہیں ہے تو بلحاظ زبان کے میں آپ کے ساتھ اتفاق کرتا ہوں، اُردو میں تو بعض صفتوں کے ساتھ مذکر و مؤنث موجود ہے۔ بڑا بڑی۔ چھوٹا چھوٹی۔ اس کے متعلق ذرا طویل گفتگو ہے لکھنا بار ہے۔ ملنا ہوتا تو آپ میرا بیان سنتے اور یقیناً پسند کرتے خیالات کو وسعت ہوتی، دہلی میں بحث تھی "اس کا نظیر نہیں" "اس کی نظیر نہیں" جو کچھ میں نے کہا سب نے قبول کیا ____ میں نہیں سمجھا کہ خطوط کے چھپنے سے کیا فائدہ۔ میں اہل تو ہوں نہیں اور اس وقت زبان خود معرض تغیر میں ہے۔ رہا اخلاقی اور فلسفیانہ پہلو چند خطوں سے کوئی مکمل مضمون پیدا نہیں ہو سکتا۔ خیر دنیا ہے چلنے دیجئے۔

صفحہ ۱۷۹ (۱۹۲) ۵؍نومبر ۱۹۱۹ء

خواجہ حسن نظامی صاحب نے ایک پرچہ اپنی بیوی کی ایڈیٹری میں نکالا ہے "اُستانی" آج وہ پرچہ میرے پاس آیا کیا کہوں اُستانی آئی ہے یا آیا ہے۔ استانی کی تانیث میں کیا شبہ ہے۔ لیکن خیال پرچے کا ہے۔ خیر یہ تو گویا یہاں علم ہوگیا ہے۔ چند الفاظ وہ ہیں کہ تانیث و تذکیر باعتبار ان الفاظ کے ہے جن پر دلالت مقصود ہے اور بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک مستند شاعر کی جو رائے ہو جائے وہ سند ہے ورنہ بقول شمس العلماء ذکاءاللہ مرحوم جس کو خدا ہی نے مذکر مؤنث نہیں بنایا اس کو کون مذکر مؤنث کر سکتا ہے۔

صفحہ ۱۸۰ (۱۹۴) نومبر ۱۹۱۹ء

اوّل تو یہ مضمون کسی قدر دلچسپ ہے۔ اگرچہ میں اپنا وقت ان مباحث میں ضائع نہیں کرتا۔ دوسرے اتفاقاً لفظ فرد مذکر استعمال کیا گیا ہے۔ میں نے نشان کر دیا ہے۔ میرے اس خیال کی تائید ہوئی ہے کہ مدلول فرد کی تذکیر و تانیث پر قائل کی نظر ہوتی ہے۔ یہاں کوئی تخصیص عورت و مرد کی نہیں ہے۔ لیکن ایسی حالت میں مذکر ہی بولتے ہیں البتہ اگر کسی خاص چیز کو فرد کہنے لگیں تو میں آپ سے متفق ہوں۔ "اچھی فردیں ہیں"۔

یعنی چھپی ہوئی رضائیوں کے ابرے۔

صفحہ ۱۸۹ (۲۰۹) ۷؍فروری ۱۹۲۰ء

۷؍فروری کے ہمدم میں دیکھتا ہوں "مخمس بر غزل حضرت اکبر الہ آبادی از مولوی ظہور محمد تقرب صاحب۔

اپنی خوشی نظام کو واپس برار دے

یہ میری غزل نہیں ہے کوئی اور صاحب ہوں گے۔ مصنّف صاحب برائے مہربانی تصحیح فرمائیں ہمدم کو یہی لکھ دیجیے۔

صفحہ ۱۹۳ (۲۱۵) ۱۰؍مارچ ۱۹۲۰ء

گور غریباں تانیث ہے یہی ہونا بھی چاہیے تھا۔

صفحہ ۱۹۶ (۲۲۱) ۴ رجون ۱۹۲۰ء

"سالونیکا" کی داد پر اپنا یہ شعر یاد آیا ؎

وہ خرافات پر ہیں داد طلب — واہ وا پر عجب مصیبت ہے

نہایت دقت ہے کہ برسوں کے کہے ہوئے اشعار جو بیاض میں لکھے ہیں لوگ نقل کر دیتے ہیں، سمجھا جاتا ہے کہ یہ تازہ فکر ہے۔ سالونیکا والا شعر شاید جنگ طرابلس کے وقت کا ہے اس وقت تو کچھ معنی بھی تھے اب محض لغویت ہے میں نے خواجہ صاحب کو شکایت لکھی کہ آپ نے شعر کہاں پایا۔ کیوں چھاپا۔ انھوں نے معذرت لکھی۔ ایڈیٹر مشرق نے مجھ کو لکھا کہ نہ طبع ہونا چاہیے تھا۔ بہر حال اس کو فکر تازہ نہ خیال فرمایئے گا وہ سب شعر پرانے ہیں بجز اس شعر کے ؎

جو بُت سے پھر رہے ہیں اہل دل ہوتے ہوئے — جائے حیرت ہے یہ بات اللہ کے ہوتے ہوئے

صفحہ ۱۹۹ (۱۹۲) ۱۸ رجولائی ۱۹۲۰ء

ناتوانی اور افسردگی کی حد نہیں صرف فردائے آخرت پیش نظر ہے ؎

کیا کروں عہد وفا اپنے خیالات کے ساتھ — کہ خیالات بدل جاتے ہیں حالات کے ساتھ

دیکھ کر حضرت اکبر کو خدا یاد آیا — یہ مصائب یہ ہجوم ایسے کمالات کے ساتھ

صفحہ ۲۰۱ (۲۳۰) ۱۳ ر ستمبر ۱۹۲۰ء

اپنی حالت دیکھ کر اکبر یہ آتا ہے خیال — زندگی کیا ہے اک مرگ طویل النزع ہے

صفحہ ۲۰۸ (۲۳۸) ۲۷ ر دسمبر ۱۹۲۰ء

میری حسن عاقبت اور رفع تردداّت کے لئے دعا فرماتے رہیے ایک مطلع ملاحظہ ہو ؎

آئیں طرازیاں ہوں کہاں تک شعور کی — کچھ حد نہیں ہے وسعت شان ظہور کی

صفحہ ۲۱۰ (۲۴۳) ۱۲ ر فروری ۱۹۲۱ء

بیگانہ فروشی سے میرے نزدیک عمدہ اور صاف معنی پیدا نہیں ہوتے۔ میں اس وقت اس کو پسند کرنے پر آمادہ نہیں ہوں اظہار خیال کے لئے آزادی سے الفاظ کا استعمال ہوتا ہے لیکن ہر ایک کا مذاق اور انتخاب خلعت قبول نہیں پاتا۔ جلوہ فروش تو البتہ دل پسند ترکیب ہے۔

جلوہ بر من مفروش اے ملک الحاج کہ تو — خانہ می بینی و من خانہ خدا می بینم

لیکن مفسد کو بیگانہ فروش کتنا کھٹکتا ہے۔

صفحہ ۲۱۱ (۲۴۴) ۱۷ مارچ ۱۹۲۱ء

مزاج پرسی کا ممنون ہوں اپنا حال کیا کہوں۔

میں تو سمجھتا ہوں کہ بس اب مرا — لوگ یہ کہتے ہیں ابھی دیر ہے

صفحہ ۲۱۳ (۲۴۹) پرتاب گڈھ ۱۲ جون ۱۹۲۱ء

گرمی کی ایسی تکلیف اٹھائی اور اٹھا رہا ہوں کہ سال آئندہ اگر زندہ رہا تو دہرہ دون میں بسر کروں گا۔

صفحہ ۲۱۳ و ۲۱۴ (۲۵۰) پرتاب گڈھ۔ ۱۰ جون ۱۹۲۱ء

اس حوادث سے آپ کی تکمیل ہوتی جاتی ہے مجھ کو تو ایسے حوادث کا سامنا ہے کہ تصوف مبدل بہ جنون ہوجانے کا خوف ہے۔

عمر گذری تب کھلا دنیا کا حال — اور ہی کچھ دل میں اب آنے لگا

پہلے تنہائی سے گھبراتا تھا دل — زندگی سے اب تو گھبرانے لگا

آخری خط

(۲۵۳) الٰہ آباد۔ ۲۸ اگست ۱۹۲۱ء

سہل نہیں کہ اپنا حال لکھوں۔ زندہ رہا حواس درست رہے تو ستمبر میں قصد لکھنؤ کروں گا۔ عشرت پھر میرے بعد شاید کچھ بار اٹھائیں اور ذمہ داریاں محسوس کریں۔ حصہ اول و دوم کی بہت مانگ ہے۔ کیا آپ یہ محنت اپنے ذمہ لے سکتے ہیں کہ دونوں حصے چھپوایئے۔ پروف دیکھئے۔ حساب کرکے تخمینہ سے اطلاع دیجئے اور وقتاً فوقتاً جس قدر ضرورت ہو مطبع کو دیجئے دو دو ہزار کاپیاں ہوں۔ جواب جلد عنایت ہو تاکہ بعد انتظام سفر کام شروع ہو جائے۔

صفحہ ۹

۱۶ دسمبر ۱۹۱۱ء

قدم انگریز کلکتے سے دہلی میں جو دھرتے ہیں — تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسی کرتے ہیں

صفحہ ۹

۳ مارچ ۱۹۱۲ء

حضرت اقبال کی مشغولی فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔ جب لیلےٰ کی تصویر میں یہ محویت تھی تو لیلیٰ آفریں کی محبت میں کیا کچھ نہیں ہوسکتا۔ میں

ان کو مبارکباد لکھوں گا۔

میر نیرنگ صاحب کو بھی مبارکباد دوں گا خطاب العصر تو انھیں کا عطا کیا ہوا ہے۔ اللہ اُن کو فرید عصر کرے ــــــ زمیندار نے مجھ کو بھی ایک اسامی سمجھ رکھا ہے تار پر تار آئے کہ پیمبر نمبر کے لئے کچھ بھیجئے۔ اوّل پیمبر نمبر کیسا لیکن اس خیال سے چپ رہا

عہد انگلش میں ہے ہر چیز کے اندر نمبر	کیا تعجب ہے جو نکلا ہے پیمبر نمبر

اچھا نہ تھا طبیعت حاضر نہ تھی بالآخر چار مصرع لکھ بھیجے۔

مہر و مہ خوش ہیں روز خوش شب خوش	وحشی دشت خوش مہذب خوش
ہیں غرض آپ کی ولادت سے	مسٹر ابلیس کے سوا سب خوش

صفحہ ۹	۲۲ مئی ۱۹۱۲ء

فارسی بھول جایئے غصہ کم ہو جائے۔ نواب صاحب کے موٹر سے گرنے کا افسوس ہوا اور اپنا شعر یاد آیا۔

عزم کر تقلید مغرب کا ہنر کے زور سے	لطف کیا ہے لد لئے موٹر پہ زر کے زور سے

نواب صاحب کو آپ نے فرشتہ صفت لکھا ہے میں کہتا ہوں اس سے بھی زیادہ۔ فرشتے صرف نیک اور مقدس ہوتے ہیں۔ عقل کی ان کو ضرورت نہیں۔ کیونکہ صرف حکم خدا کی تعمیل کر دیتے ہیں نواب صاحب عقلمند بھی ہیں۔

صفحہ ۱۴ و ۱۵	۳ ر اگست ۱۹۱۴ء

ایک خط لکھ چکا ہوں یہ کیا معلوم کر جو کچھ لکھنا تھا سب لکھ دیا۔ قلم کے ساتھ رہیں تو ادائے مطلب ہو۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ قلم کہیں اور ہم کہیں۔ بار بار حواس کو مجتمع کرنا ہوتا ہے۔ پھر کیا سلسلہ قائم رہے کیا بیان مدعا کی تکمیل ہو۔ اکثر یہ ہوا ہے جوش دل سے کہا یا اللہ ایک سکنڈ میں دل ہی سے جواب سنا کہو کیا کہتا ہے اب بالکل بھول گئے۔ کیوں پکار اٹھا کیا گزارش کریں سبحان اللہ و بحمدہ کہہ کر رہ گئے ــــــ اس وقت مزاج پرسی کا کارڈ پہنچا ــــــ غش تو نہیں آتا۔ لیکن یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ تجبیر نے دماغ کی حالت دگرگوں کر دی تھی۔

اثر مرگ ہاشم

صفحہ ۱۵ ۳ رمئی ۱۹۱۴ء

تولیہ جو آپ نے مرحمت فرمایا اس کو بروزن اولیا پاکر ولی پاکی کے حق میں اچھا سمجھتا ہوں۔

صفحہ ۱۷ ۳ راگست ۱۹۱۰ء

شدت غیرت نے بہت کچھ خاموش کر دیا ہے ذہن کو نہیں بلکہ زبان قلم کو وہ زبان قلم نہیں جو حالات کو نوٹ کر لیتی ہے بلکہ وہ زبان قلم جو چل کر اڈیٹروں تک پہنچتی ہے۔ رات جب تخیر کی شدت تھی جیسا کہ قریباً ہر شب ہوا کرتا ہے ذہن بھی غافل نہ تھا یہ شعر کہا۔

ہو سخن کا جب اثر ظاہر تو روک اپنی زباں شعلہ زن ہو جائے جب آتش تو پھر کیوں پھونکیے

خیر یہ تو سخن کے متعلق تھا عام سوشل حالت اس وقت نہایت نازک ہے بالخصوص میری حدیں کچھ ایسی معین ہیں کہ وہم کو ان کی توسیع ہر طرف ہر فاصلے تک جائز ہے۔ یہ حالت سوہان روح ہے۔ مگر تا کے۔ جن واقعات پر یہ حالت مبنی ہے ان کی تفصیل کی نہ فرصت نہ طاقت نہ تحریر میں موقع۔

صفحہ ۱۹ ۲۵ رستمبر ۱۹۱۵ء

تصوف اور بے خودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی لذت کی گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معانی اُسی میں ہیں۔

صفحہ ۲۱ ۳ راکتوبر ۱۹۱۵ء

بعض حکما کا خیال ہے کہ نیکی اور عقلمندی ایک ہی چیز ہے۔ سر علی امام صاحب کو دیکھ کر اس کی تصدیق ہوتی ہے بہت شیریں نفس شخص ہیں۔

صفحہ ۲۲ یکم جنوری ۱۹۱۹ء

واحدی صاحب کو میں نے ایک مطلع لکھ بھیجا ہے۔

سخن میں یوں تو بہت موقع تکلف ہے خودی خدا سے جھکے بس یہی تصوف ہے

صفحہ ۲۴ ۱۲ رجنوری ۱۹۱۶ء

آپ کو عذر نہ ہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ اشعار شائع ہوں۔ ثقالت نہیں ہے۔

حضرت اقبال اور خواجہ حسن پہلوانی اُن میں ان میں بانکپن

جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے — آؤ گتھ جائیں خدا ہی کے لئے

ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی گو تصوف ہی سہی

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص — می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

صفحہ ۲۵ — ۲۰ر فروری ۱۹۱۶ء

ع - از کلید دیں در دنیا کشاد اگر رسول اللہ کے رنگ میں لیا جائے تو لیسنس کی ضرورت ہے۔ اگر دین صرف حصول دنیا کا ذریعہ سمجھا جائے تو بے دینی ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ کالج کے ذریعہ سے فکر معاش کی جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کالج کو کلید دیں کیوں کہا؟

صفحہ ۲۶ — ۱۴ر فروری ۱۹۱۶ء

ماجد میاں کے باب میں آپ کے خیال سے مجھ کو اتفاق ہے ماجد کے اس کہنے پر کہ میں خدا کو نہیں جانتا اتنا غصہ نہیں آتا جتنا غیر ماجد کے اس کہنے پر غصہ آتا ہے کہ میں آپ سے زیادہ خدا کو جانتا ہوں اس کے یہ معنی ہیں کہ میں خدا کو جانتا ہوں لیکن مانتا نہیں ادھر بھولا پن ہے ادھر خیرہ سری۔

تو و طوبے و ما و قامت یار — فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

صفحہ ۳۲ — ۱۸ر مئی ۱۹۱۶ء

میں خود ہنگامۂ مصائب میں مبتلا ہوں۔ کیا حالت اس زخمی کی ہوگی جس کے زخم مہلک ہیں۔ اور ہنوز قوت رفتار باقی ہے وہ گوشہ عافیت ڈھونڈ رہا ہے کہ مرنے کے لئے بستر لگائے لیکن گوشہ نہیں ملتا اور قوت رفتار جاتی رہتی ہے ۔

مطالب ہیں بہت وقت دعا کچھ کہہ نہیں سکتا — الٰہی فضل کر اس کے سوا کچھ کہہ نہیں سکتا

رنج آسماں میں ہے نہ راحت زمیں میں ہے — اپنے ہی حس کا جوش ہے سب کچھ ہمیں میں ہے

صفحہ ۳۲ و ۳۳ — ۲۵ر مئی ۱۹۱۶ء

مجھ سے ایک شخص نے پوچھا کہ آپ نے کبھی مراقبہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں ہر شعر مراقبہ کے بعد کہتا ہوں۔ یہ تو لطیفہ تھا لیکن عموماً یہی ہے کہ قافیہ پیمائی کے عوض زیادہ تر میری زبان بیان احساس میں مشغول رہتی ہے لیکن یہ مصرعہ جو آپ کو پسند آیا ہے ع اپنے ہی حس کا جوش ہے سب کچھ ہمیں میں ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ میرا ابتدائی احساس نہیں تھا۔ یہ درحقیقت اسی کتاب انگریزی کے ایک باب کا بلکہ کل کا خلاصہ ہے جس کا ذکر میں نے آپ کو لکھا تھا ایک شعر بیاض میں نظر آیا یاد نہیں کس عالم میں زبان سے نکل گیا تھا ؎

ہے بدگماں جو وہ بت پروا نہیں کچھ اس کی ہر برہمن ہے شیدا اکبر کی کافری کا

صفحہ ۳۴ ۵ رجون ۱۹۱۶ء

کل دوپہر کو میں نے چند شعر کہے، کہے کیا بے اختیار ذہن میں داخل ہو کر زبان پر آ گئے۔

صبح کو کہتا ہوں دیکھوں کس طرح کٹتا ہے دن شام اسے ایسا بھلا دیتی ہے گویا کچھ نہ تھا

عمر یوں ہی کٹ گئی آخر ہوا معلوم یہ عرصۂ ہستی بجز امروز و فردا کچھ نہ تھا

صفحہ ۲۷ یکم اگست ۱۹۱۶ء

میں نے حال ہی میں ایک غزل کہی ہے دو شعر یہ ہیں۔

صورت فانی سے آخر کیوں یہ پہچانے گئے مجھ کو حیرت ہے کہ یہ بت کیوں خدا مانے گئے

اک زمانے میں یہ خواہش تھی کہ جانیں ہم کو لوگ اب یہ رونا ہے کہ ہم کیوں اسقدر جانے گئے

آپ کا مضمون "غم نہ کرو" بھی لائق غور ہے اگر خوشی و غم اختیاری ہے تو بے شبہ غم نہ کرنا چاہئے میں تو یہیں تک ترقی کر سکا ہوں (وہ بھی پوری ترقی نہیں) کہ غم میں خوش رہوں اور اس کو اپنے حق میں مفید سمجھوں آپ کا بھی اصلی مقصد یہی ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ سر پر پتھر گرے تو چوٹ نہ لگنے دو یہی مطلب ہوگا کہ خوشی سے ہائے ہائے کرو۔ یہ ٹھیک مصیبت میں دل لگی پیدا ہو جائے ۔۔۔ میرا ایک نیا مطلع ہے کچھ واقعہ کچھ ظرافت۔

قید میں زیست کی بنیاد ہلی جاتی ہے پھر بھی ہے شکر کہ روٹی تو ملی جاتی ہے

صفحہ ۳۹ ۹ راگست ۱۹۱۶ء

میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا میں نے ان کا خط دیکھکر آپ کو مخاطب کر کے چند شعر کہے۔

اے خواجہ حسن کرو نہ اقبال کو رد تو می رکنوں کے ہیں نگہباں وہ بھی

تم محو ہو حسن کی تجلی میں اگر ہیں دشمن فتنۂ رقیباں وہ بھی

پریوں کے لئے جنون ہے تم کو اگر　　　دیوؤں کے لئے بنے سلیماں وہ بھی

صفحہ ۵۲
۱۶ر اکتوبر ۱۹۱۹ء

آپ کے قبلہ وکعبہ کے مضمون پر اخبار مشرق میں کسی صاحب نے بہت کچھ فضول لکھ ڈالا ہے۔ جی چاہتا ہے جواب لکھوں۔ میں نے تو ایک دفعہ لکھا تھا۔ جناب جامع مسجد دہلی مظلہ یہ کیا جناب من بات یہ ہے کہ ہر شخص سے بلحاظ مرتبہ خطاب مناسب ہے بالفعل جامع دہلی آیندہ ترقی کیجئے گا تو کعبہ بھی لکھو نگا

صفحہ ۵۲ و ۵۳
۱۷ر اکتوبر ۱۹۱۶ء

عشرت سلمہ کو میرے یہ اشعار بہت پسند آئے ہیں۔

گو سعی ہوائے شوق نے کی بُو اس کی نہ نکلی محفل سے　　　مجنوں نے اڑائی خاک بہت لیلی نے نہ جھانکا محمل سے
دنیا کے تغیر کا نہیں حس شیدائے جمال باری کو　　　پروانے کو مطلب شمع سے ہے کیا کام ہے رنگ محفل سے
ایذا کا مجھے حس ہی نہ ہوا فریاد و فغاں میں کیا کرتا　　　جو وقت تہ خنجر تھا گلا آنکھ اپنی ملی تھی قاتل سے

صفحہ ۵۷
۳ر نومبر ۱۹۱۶ء

ڑات مولوی احسان اللہ صاحب عباسی گورکھپوری جنھوں نے بلا اصل متن کے قرآن مجید کا اُردو ترجمہ شائع کیا ہے اور میرے مکرم اور آپ کے بھائی احسان کے اسوۂ حسنہ کے نامہ نگار ہیں۔ مجھ سے ملنے تشریف لائے تھے فرماتے تھے کہ درود جو نماز میں پڑھتے ہیں کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ کَمَا بَارَکْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ اس سے امامت بارہ اماموں کی ثابت ہے اور میں تو لکھنؤ جاتا ہوں تو شیعہ مجتہدوں کے پیچھے نماز پڑھتا ہوں البتہ ہاتھ باندھ کر پڑھتا ہوں کیونکہ عادت پڑی ہوئی ہے اور اس میں کچھ ہرج بھی نہیں ہے تبرا پر مزاحمت نہیں کرتا کیونکہ مزاحمت سے ضد بڑھتی ہے خلفائے ثلاثہ کو دنیوی بادشاہی حاصل تھی روحانی سلطنت بارہ اماموں میں تھی۔

آپ کے دوست اسوۂ حسنہ کے لئے یہ مضمون مفید عام مولانا سے کیوں نہیں حاصل کرتے۔

صفحہ ۶۰
۲۳ر نومبر ۱۹۱۶ء

اقبال صاحب نے مجھ کو خط میں لکھا ہے کہ مسئلہ امامت کو انھوں نے مان لیا لیکن یہ نہیں اقرار کیا کہ میں شیعہ ہو گیا خانہ ساز عقائد سے دوسرا مذہب تو قائم نہیں ہو سکتا شغل زندگی سمجھئے۔

اپنا حال کیا لکھوں۔ لاالٰہ الا اللہ اور خفقان۔ ہسٹری پر نظر کرنے کی نہ فرصت نہ ضرورت شیعہ سنی کو حلوا پلاؤ مبارک ہم کھا ہی نہیں سکتے ہضم ہی نہیں ہوتا۔ زندگی سے مجبور ہوں۔ ہوا جو ہم نفس قطرہ

ہوا جو ہم نفس قطرہ بن گئی دم بھر حباب نے بھی خودی کا مزا اٹھا ہی لیا

علاوہ بریں ؎

ترک دنیا کے خیالات کو دھوکا پایا غور جب ہم نے کیا سانس کو دُنیا پایا!

صفحہ ۶۱

۲۸ر نومبر ۱۹۱۶ء

اس وقت شیعہ و سنّی کے الفاظ بالکل بے معنی ہیں عملی پہلو کے لحاظ سے صرف ڈھانچے کا رکھ رکھاؤ سوشل مجبوری سے ہو رہا ہے۔ میرے دادا شیعہ تھے۔ پردادا کی خبر نہیں غالباً سنّی سپاہی تھے اب تو میں یہ کہتا ہوں ؎

شیعہ کو مجھ سے کچھ بھی خوف و خطر نہیں ہے ہو وہ علی تو باشد بندہ عمر نہیں ہے

آپ خدا کو مقدم رکھیں گے یعنی اللہ کو تو اکبر کو کیوں چھوڑنے لگے۔"

صفحہ ۶۵

۴ر دسمبر ۱۹۱۶ء

اپنی بیاض میں یہ ایک شعر پاتا ہوں۔

ٹھیک ہے مصرع کا مضموں قافیہ گو سخت ہے اس دل نالاں ہوں جس سے وہ بڑا کمبخت ہے

مضمون میں خفت نوں محل تامل ہے۔

صفحہ ۶۵

۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء

میرا یہ حال ہے جہاں تک دنیاوی زندگی کو تعلق ہے ؎

جان مردہ ہے بدن افسردہ ہے مانند خاک میں رہا ہوں گا کبھی لیکن اب اپنی قبر ہوں

صفحہ ۷۱

۲۰ر دسمبر ۱۹۱۶ء

آج صبح میں نے ایک مطلع کہا تھا ؎

فلسفۂ غم کا جسے معلوم ہے ہو مبارک وہ اگر مغموم ہے

صفحہ ۷۴

۲۶ر دسمبر ۱۹۱۶ء

آج صبح میں نے یہ دو شعر اپنے حسب حال موزوں کئے تھے ؎

نہیں ہے جنبش کی ان میں قوت جو گفتگو کو کھڑے ہوئے ہیں
بندھے ہوئے اُن کے ہاتھ دیکھے ہیں پاؤں اُن کے گڑے ہوئے ہیں
معاف رکھیں ہمیں خدارا انہی کو ہو لیڈری مبارک
ہم ایک گوشہ میں اپنے اچھے دبے دبائے پڑے ہوئے ہیں

صفحہ ۷۷
۲۴ جنوری ۱۹۱۷ء

حالت طبعی تو بہرحال قابل شکر ہے ع بہے جاتے ہیں بے مقصود بجز زندگانی میں ؛
جینا بُرا نہیں ہے لیکن اللہ جینے میں دل لگا دے ؎
خودی کے جس سے بھی ہوتا ہے انتشار اکبر کہاں رہوں کہ مجھے بھی مرا پتہ نہ چلے
ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی ؛ کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

صفحہ ۸۰
۴ فروری ۱۹۱۷ء

مجھے اپنا یہ مطلع اکثر یاد آتا ہے اور اس کے معنی پر غور کرتا ہوں ؎
اگرچہ تلخ ملا جام عمر فانی کا مگر محل نہیں ساقی سے بدگمانی کا

صفحہ ۸۲
یکم مئی ۱۹۱۷ء

مجموعۂ خطوط کا دیباچہ دیکھکر مصرعہ کہا ہے ؎
زمانہ مجھ کو گھٹا رہا ہے اور آپ مجھ کو بڑھا رہے ہیں

صفحہ ۸۲
۳ مئی ۱۹۱۷ء

خط لکھنے کا وعدہ کیا تھا نہ لکھ سکا لیکن کلک اندیشہ صفحۂ خاطر پر ہر وقت آپ کو خط لکھا کرتا ہے۔

صفحہ ۸۳ و ۸۴
۸ مئی ۱۹۱۷ء

میں کچھ نہیں جانتا کہ معاملات کہاں ہیں۔ خیالات کا کیا رخ ہے۔ گوشۂ عزلت و بے خبری میں رہتا ہوں۔ صرف قیاس کر لیا ہے کہ آسمان وہی ہے۔ رات ہے یا دن ہے، اللہ جانے۔
طبیعت اچھی نہیں رہتی۔ ہمہ تن تجز سوداوی ہوا جاتا ہوں ؎
اظہار عقل میں ہیں احباب گرم کوشش
اور مجھ کو فکر یہ ہے اپنا جنوں چھپاؤں

صفحہ ۸۷

۸ر جون ۱۹۱۷ء

پرسوں ایک قطعہ موزوں ہوگیا۔ شاید آپ کو بھی چوتھے مصرع پر لطف آجائے ؎

جویائے راز حسن ازل سے کہے کوئی
سن صوت سرمدی کو کلام مبین کو دیکھ

ارشاد ہے کہ شرک نہ کر اور نماز پڑھ
معنی یہ ہیں کسی کو نہ دیکھ اور ہمیں کو دیکھ

صفحہ ۸۷ و ۸۸

۲۷ر جون ۱۹۱۷ء

خوب ہے اُردو میں لکھے جس نے حالات کرشن
اُس مصنف کو مگر دلی ہی پیدا کر سکی

وہ بگولا خاک خسرو ہی کے پہلو سے اُٹھا
جس کی گردش طبع کو اکبر جنوں سے بھر سکی

یہ اُمنگ آخر نظام الدین سے اٹھی کہ جو
باسلیقہ ہاتھ ساز عشق حق پر دھر سکی

پھر لکھوں گا اس وقت دست و دل دونوں بیکار ہیں۔ حور کو ذوق طاعت مبارک۔ خواجہ بانو کو حسین کی خدمت مبارک اور دونوں کو کرشن بیتی کا مصنف مبارک۔

صفحات ۸۹ و ۹۰ و ۹۱

۴ر جولائی ۱۹۱۷ء

مجھ کو تو اسی شاعرانہ خیال میں مزا آتا ہے ؎

ہوں عرب میں تو اک برزن بھی سہی
ہند میں ہوں تو اک بھون بھی سہی

ہوم رول[1] کی نسبت میں نے بے ساختہ اشعار کہے اکثر بہت دلچسپ ہیں ؎

جو گایوں کے سینگوں میں ہو زور کچھ
تو شیروں کو روکیں بہت بن کے دوست

مگر اونٹ کا قول تو ہے یہی
تواضع ز گردن فرازاں نکوست

ایک نظم اور ہے جس کی نقل ملفوف ہے فرمایئے کیسی ہے لیکن اور بہت اشعار بہت زیادہ دلچسپ ہیں۔ شاید بھیج سکوں۔ کہہ تو لیتا ہوں لیکن صاف کرنا ادھر اُدھر بھیجنا اس دردسر کا تحمل مشکل ہوتا ہے ؎

شرق کی کیفیتی دیکھی ہے مغرب کی اجازت سُن لی ہے

نیٹو کی فقط اک مشق ہے یہ صاحب کی فقط خوش طبعی ہے

پبلک میں وہ ملکی حس ہی نہیں آزاد کوئی مجلس ہی نہیں

وہ جہل و تعصب مذہب کا سینوں میں ہر اک سو مخفی ہے

---

[1] ہوم رول (HOME RULE) حکومت خود اختیاری۔

اُردو بھی یہاں ہے گائے بھی ہے لعنت بھی ہے اور آمیں بھی ہے
کچھ صلح کل انساں ہوں بھی اگر تعداد ہی ان کی کتنی ہے
ہم کو تو یہ خطرہ رہتا ہے آپس ہی میں چھڑ جائے نہ کہیں
ادنےٰ ابھی ہے اک تحریک بہت پوشیدہ اشارہ کافی ہے
ضد اور عداوت چھوڑ کے تم لو عقل سے کام اور مرد بنو
بے اس کے حکومت ہو بھی اگر کون اس کو کہے گا اچھی ہے
لفظوں کا تموج کچھ بھی نہیں اک کھیل ہے یہ اک نقل ہے یہ
بازو کی بھی طاقت شامل ہو اس وقت میں وہ بامعنی ہے
نعمت ہے یہاں راحت کی گھڑی ہے امن کی برکت سب سے بڑی
نیچر بھی اسی سے راضی ہے اللہ کی بھی منظوری ہے
جو نقص ہے اس کو دور کرے ہر ہندو و مسلم غور کرے
احساس ہمارا کیسا ہے تعلیم ہماری کیسی ہے
جب ہوم ہے تو رول بھی ہو ہٹنی جو بنے تو پھول بھی ہو
اللہ کی مرضی جو کچھ ہو میں نے تو نصیحت کر دی ہے
اخلاق کی دیوی کہتی ہے یا مالوی ہوں یا مولوی ہوں
نیچے ہیں بہت اس درجہ سے کہتے ہیں جسے سلطانی ہے

HOME = گھر - RULE = حکومت - ہوم رول = حکومت خود اختیاری -

صفحہ ۹۴ ۱۴ر جنوری ۱۹۱۸ء

خوش ہوا کہ آپ حضرت غوث اعظم کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں آپ نے دانشمندی کی کہ اس وقت گذشتہ صدیوں میں قیام اختیار کیا۔

صفحہ ۹۶ ۷ر فروری ۱۹۱۸ء

تاجرانہ اور ایڈیٹرانہ اور لیڈرانہ اظہار علم کچھ اثر نہیں رکھتا۔ قرآن ہی کی نقل کیوں نہ ہو

لاکھ چھانٹیں وہ مذہبی باتیں فرق ہے شیخی و کلرکی میں

صفحہ ۱۰۲
۱۷ر مارچ ۱۹۱۸ء
فلسفیانہ تصوف، عاشقانہ تصوف، پولٹیکل تصوف میں فرق بھی ہے۔ میں نے صرف تذکرتاً لکھدیا تھا۔

دنیا چل رہی ہے اور ہنوز چلتی رہے گی کہ ہم چل چکیں گے
قافیہ خوب ملا ولی حسین پوچھتے ہیں کو تھی کو آئیں گے
میں کہتا ہوں چوتھی کو۔ کب کس تاریخ کو

صفحہ ۱۰۶
۱۲ر جون ۱۹۱۸ء
جو مجھ پر گذر رہی ہے جس پر یہ گذرے ایسا ہی ہو جائے ــــ لٹریری مذاق کی کرامت ہے کہ زبان اور قلم سے۔ مجھ کو نہ صرف زندہ بلکہ بیداری کے ساتھ زندہ ظاہر کرتی ہے ورنہ اگر زندہ ہوں بھی تو عبرت اور دنیا سے مایوسی کی گہری نیند میں سو رہا ہوں۔ کبھی پھر ملئے کیا مزا ہو اگر جواب دیجئے کہ " جب کہئے "، اقبال صاحب سے بھی بڑا لطف تھا لیکن افسوس کہ اب اُن کے سامنے شراب نہیں پی سکتا۔

۱؎ ادبی۔ ۲؎ کے اثر سے ۳؎ شراب تصوف اور مے عرفاں۔

صفحہ ۱۳۱
یکم جنوری ۱۹۱۹ء
چاہتا ہوں کہ زندہ بھی رہوں تو زندگی سے چھپ کر زندہ رہوں۔ کیا مشکل آرزو ہے۔

۱۰ جنوری ۱۹۱۹ء
غالباً تلاوت قرآن کی برکت ہے کہ حواس میں ہوں ورنہ اندرونی و بیرونی اسباب انتشار طبع مہلک نہ ہوں تو جنوں انگیز ضرور ہیں ــــ ان صاحب کو کچھ قوت دی گئی ہے۔ اُبھارے گئے ہیں میں ڈرتا ہوں کہ اگر شورش رفارم میں بے اعتدالی ہوئی اور چند نوخیزوں نے پبلک میں صلح کل اور سوشل آمیزش کا کھوکھلا اور ناپائدار رنگ دکھایا تو دوسری طرف مذہبی تعصب جو زبردست اور مقدس بڑے میاں کے لقب کا مستحق ہے مذموم کہا جائے گا اور فرق مختلفہ میں شدید جنگ شروع ہوگی جس سے روشن ضمیر نوجوان بھی بالآخر نہ بچ سکیں گے۔ میں خود عجیب دقت میں ہوں پبلک نے فرض کر لیا ہے کہ میں بڑا محب قوم اور اول درجہ کا رفارم خواہ ہوں حالانکہ میں

قوم ہی کے وجود کو نہیں تسلیم کرتا میں نے لامذہبی اور تبدیل وضع کے خلاف قدم اٹھایا تھا نہ کہ گورنمنٹ کے خلاف ــــ میرا وعظ محنت، توکل، سکوت، عبادت ہے لیکن یہ نہیں سمجھ سکتا کہ رفتار فطرت کس جانب ہے ہر شخص کو اپنی حد جاننا چاہئے میں نہ معین نہ مزاحم"۔

میں اب ہرگز شہرت و نمود کا طالب نہ رہا ــــ محل امن یہی ہے کہ سب بھلائے رہیں

صفحہ ۱۳۹ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۹ء

برن صاحب کمشنر بنارس کلکٹر الہ آباد کے پاس آئے تھے مجھ کو لکھا تھا کہ ۱۷ کو ۸½ صبح کو ملئے گا ــــ تیار ہوا۔ خبر آئی کہ سواری نہیں ملتی نہ ایکہ نہ تانگہ نہ گاڑی بلکہ سواری کو سڑک پر سے گذرنے ہی نہیں دیتے ــــ میں نے چٹھی بھیجدی کہ یہ حالت ہے کیونکر آؤں۔ صاحب نے افسوس ظاہر کیا کہ ملاقات کی اور تاریخ مقرر ہو گی ــــ یہ بھی لکھا کہ اس واقعہ پر آپ کچھ لکھئے۔ میں اپنے دل میں کہتا ہوں کہ آپ تو خود مصنف ان واقعات کے ہیں۔

۹ فروری ۱۹۲۰ء

محبت قائم رہے۔ کیوں کہ اللہ کے لئے یہی ملاقات ہے ورنہ ملاقات وقت کا ضائع کرنا یا سوشل ضرورتوں کو پورا کرنا ہے۔

ٹیلیفون سے آپ کو آرام ملے گا ــــ اگرچہ آج کل کون کس کی سنتا ہے۔

صفحہ ۱۰۵ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء

گرمی تیز ہوگئی سہ پہر کو اضطراب اعضا سے گرفت قلم دشوار ہوتی ہے ــــ امریکن پھر جفت برہمن۔ اس) دو آتشہ لیڈی نے صرف نیکی بدی کے تمیز کو حسن قرار دیا۔ یہ یوروپین پالسی) میں ہو سکتا ہے ہم اگر معصیت کریں اور جانیں کہ یہ معصیت ہے لیکن اس کو مخفی رکھیں تو نفس لوامہ سے کیونکر بچیں، اور جب اس اندرونی ملامت کی تکلیف رہی تو پھر حسن کہاں۔

ایک امریکن لیڈی برہمن سے منسوب تھی اُس نے خواجہ صاحب سے کچھ علمی گفتگو کی تھی۔

صفحہ ۱۵۱ ۲۰ اپریل ۱۹۲۰ء

ماتا پتا والا شعر محض ایک بے گناہ لطیفہ تھا۔ معترض صاحب نے بدگمانی کرکے فقط اپنی کمزوری ظاہر کی تاہم میں نے معذرت کا عریضہ ان کی خدمت میں اسی وقت روانہ کردیا اس شعر کا

ایسا پہلو تھا کہ کسی اخبار نے اس کو چھاپا کیوں مضموں نگار نے بھیجا کیوں مطلق خبر نہیں۔ ناک میں دم ہے پوری بات منھ سے نکلنے نہیں پاتی۔ نظرثانی کا موقع نہیں ملتا اور وہ بات غرب سے شرق اور شمال سے جنوب تک جا پہنچتی ہے۔ ظریفانہ پہلو طفل طبعوں کو بہت پسند ہے بہرحال امید ہے کہ میرا معذرت نامہ ایڈیٹر صاحب دلیش قبول فرمالیں۔

امام صاحب خطاب واپس کردیں تو کیا حرج ہے۔ گورنمنٹ پر ظاہر ہوجائے گا کہ جبراً یہ بات ہوئی ہے۔ بہت جلد یہ باتیں داخل افسانہ ہوجائیں گی۔

صفحہ ۱۵۱ و ۱۵۲

۲۶ر اپریل ۱۹۲۰ء

دلیش کو حسب ارشاد آپ کے لکھدیا لیکن نہیں جانتا تھا کہ ان اشعار میں کیا توہین کی گئی ہے اونٹ کا یہ کہنا کہ میں بھی عرب میں بجد مفید جانور ہوں مجکو کیوں ذبح کیا کرتے ہو۔ دیکھو ہندوؤں نے گائے کو ماتا بنا رکھا ہے تم بھی میری تقدیس کرو باپ بناؤ۔ یہ صرف ایک شاعرانہ اخلاقی لطیفہ ہے دلیش بھائی کیوں خفا ہوگئے۔ ضبط وتحمل سے کام لیتے۔ مجھ سے پوچھتے میں نے ان اشعار کو کبھی پاس نہیں کیا معلوم نہیں کس نے کس اخبار میں لکھ بھیجا اگر یہ اشعار قابل اعتراض تھے تو اخبار والے نے چھاپا کیوں جو انگریزی تعلیم اور زمانہ کے اثر نے طبائع کو بہت بے ادب اور بدگمان کردیا ہے میں تو اپنی تصنیف میں اس قسم کے اشعار پاتا ہوں ؎

قومی حالت میں ہندو اور تم یکساں — کیا روک ہے پھر کہ ان کو بھائی نہ کہو
بے شک اس بات پر تعجب ہے بجا — گنگا سے پلو اور اس کو مائی نہ کہو

کٹار پور والے معاملہ میں میں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

افسوس ہے کہ شاعرانہ لطائف پر دلیش بھائی نے ایسا مورد الزام کیا آپ میری یہ تحریر ان تک پہنچادیں۔ میں نے یہ اشعار اپنی بیاض سے خارج کردیے ہیں۔ میں پولیٹیکل رنگ کا مذاق تو کم رکھتا ہوں کیونکہ اپنا قانون ہی نافذ نہیں ہے لیکن صوفیانہ رنگ میں ہندو فلاسوفی اور ہندو میلان طبع سے بہت مانوس ہوں ——— دلیش بھائی سے میں انعام کا طالب نہیں ہوں۔ بڑی بات یہی ہے کہ ان کو رنج نہ پہنچے۔ بدگمانی نہ کریں معذرت چھاپ دیں اعتراض واپس لیں ان کو ذرا زیادہ زمانہ شناس اور عالی ظرف ہونا چاہیے۔ نیازمندان قدیم کو چشم زدن میں ساقط کردینا بڑائی کی بات نہیں ہے صاحب

لوگوں کا اقبال جو چاہے کرے مجھ سے تو ایک صاحب فرماتے تھے کہ ان اشعار میں شیخ صاحب کی ایک گونہ توہین ہے۔

صفحہ ۱۵۳ — ۴ / مئی ۱۹۲۰ء

اس مضمون سے میرا مقصود یہ بھی تھا:۔

عرب کے لئے اونٹ اس سے زیادہ ضروری ہے جس قدر گائے ہند کے لئے باوجود اس کے عرب اس کو ذبح کرتے ہیں۔ ضروری اور مفید ہونے سے ان کے نزدیک کسی جانور کی تقدیس نہیں لازم آتی رہا حکم مذہب وہ اس باب میں ان کی کتاب میں بہت صاف ہے باوجود اس کے جو اس وقت مسلمانوں نے گائے کی قربانی سے احتراز کرنے کا میلان ظاہر کیا ہے تو برادران ہند کو خیال کر لینا چاہئے کہ یہ محض خیال حسن معاشرت اور پاس ہمسایہ اور ازدیاد محبت باہمی و ہمدردی کے لیے ہے۔

وہ مضمون ناتمام تھا کسی صاحب نے بلا میری اطلاع کے اخبار میں بھیجدیا اور چھپ گیا۔ ویش بھائی بدگمان ہوئے۔ ماتا پتا کے الفاظ صرف شاعرانہ بندش تھی لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ رومی لوگ دریائے طبرس کو باپ کہتے ہیں " فادر ٹائیبر "۔ انگریز لوگ شاید دریائے ٹیمز کو بھی باپ کہتے ہیں لہٰذا ماتا پتا میں کچھ ہنسی کی بات نہیں ہے۔

ہم لوگوں کے لئے رونے اور دعا کرنے اور عاجزی کرنے اور محبت بڑھانے کا وقت ہے۔ ہنسنا اور توہین کرنا کیا معنی۔ مجھ کو ویش صاحب نے خط بھی لکھا ہے اور لکھا ہے کہ اب آپ کی وقعت و محبت میرے دل میں چہار چند ہوگئی کیونکہ آپ نے معذرت کی بہر کیف میں ان کا نیاز مند ہوں۔ میں مفصلہ بالا مضمون ان کو نہیں لکھ سکا۔

صفحہ ۱۵۴ و ۱۵۵ — ۲۶ / مئی ۱۹۲۰ء

اس وقت آپ کے مضمون ذاتی عمل پر اعتماد دیکھکر گو افسوس جاتا تو نہیں رہا لیکن اس کے زیادہ اظہار کی جرأت نہ ہوئی۔ آپ نے میرے یہ اشعار جو چھاپے کہاں پائے۔ میں تو اس وقت بہت احتیاط و سکوت سے کام لیتا ہوں آپ کو میری نزاکت تعلقات کا خیال نہ رہا اب یہ اشعار ترجمہ ہو کر مشتہر ہوں گے، بے نتیجہ اور ضرر انگیز بات سے بچتا ہوں ورنہ کیا بات ہے۔ آپ کو تو بڑا خیال رہتا تھا۔

معلوم نہیں اس وقت کہاں تھے۔ ہمدردی نہ سہی ضرر رسانی سے احتراز چاہئے۔ کم سے کم پوچھ لینا چاہئے۔ میں ضعیف اور تبخیر کے سبب سے اکثر اوقات ٹھیک نہیں کہہ سکتا، سالونیکا کا ذکر اب ترکوں کو چڑاتا ہے۔ اب شاید میری ظرافت کا اظہار مقصود ہوا۔ میری کوئی خطا ہو تو للہ معاف فرمائیے۔ چراغ سحری ہو رہا ہوں (رعیت میں ایک پرانا شعر سالونیکا والا چھپ گیا تھا)

صفحہ ۱۵۶

۲۹ مئی سنہ ۱۹۲۰ء

مجھ کو اپنا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

جو پوچھا دل سے اس جینے کا کیا مقصود آخر ہے — شکم بولا کہ اس کی بحث کیا خادم تو حاضر ہے

پیٹ بڑا لیڈر رہے چاہتا ہوں کہ خدا کے سوا کسی سے نہ ڈروں لیکن بیوقوف مشہور ہونے سے بھی ڈرتا ہوں۔

۱۲ جون سنہ ۱۹۲۰ء

میرا ایک شعر سن لیجئے ؎

یہ تو سچ ہے جی لگا کر چاہئے پڑھنا نماز — یہ بھی سن لو جی لگا کر سانس لینا چاہئے

مضمون ایسا ہے جہاں تک لکھئے گنجائش ہے۔

جناب من! گھوڑا مر گیا۔ تانگا ٹوٹ گیا۔ کیا اچھے فقرے تھے۔ مزا آگیا۔ شکستہ حالی بحال داتا کا خیال۔ فقر کا رنگ۔ طاعت کی امنگ۔ اللہ ہی کے آگے ہاتھ۔ زندگی کے لئے دنیا کا زبانی ساتھ درویشوں کا جتھا۔ حق حق اور برہم کتھا۔ خواجہ جئیں لاکھ برس۔ اللہ بس باقی ہوس۔ محمد حسین میاں رات کو کوچ کر گئے۔ ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔ ہمہ تن پرانا مضمون۔ اوپر خدا نیچے افیون۔ دل عبرت زدہ ہے دنیا غم کدہ ہے۔

حسن نظامی نے لکھا تھا گھوڑا مر گیا تانگہ ٹوٹ گیا۔

صفحہ ۱۶۱ و ۱۶۲

۲۶ جولائی سنہ ۱۹۲۰ء

(واحدی صاحب کے نام)

خواجہ صاحب کی نئی تصنیف میں گیارہ برس باقی ہیں کسی یوروپین کی تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے مجکو اپنا ایک شعر یاد آیا۔ میں نے ایک دوسری دلیل قرب قیامت کی پیش کی ہے ایک اور شعر

بھی اس کے ساتھ ہے ؎

ہوش میں لائی ہیں اب مایوسیاں　　نشۂ امیدِ فردا ہو چکا
عشق سے کہدو قیامت ہے قریب　　حسن کا سنتے ہیں پردا ہو چکا

(بے پردگی کا رواج) ایک اور شعر یاد آیا ؎

علمی خبروں میں یہ خبر بھی عجیب ہے　　شیطان کو ارتقائے دجال کیا

اس کی تائید بھی اسی تالیف سے ہوتی ہے۔ شاعرانہ ایک خیال یہ بھی ہے کہ کسی حسینن کی عمر اس وقت تین سال کی ہے لہٰذا گیارہ سال قیامت کو باقی ہیں۔ ایک پرانا مصرعہ یہ بھی ہے۔

ہے متوی قیامت تقسیم الشیاتک

ممکن ہے اس کی تکمیل کو گیارہ سال باقی ہوں۔

صفحہ ۱۶۲　　۶ر اگست ۱۹۳۰ء

خود اپنی ہستی کا احساس بار ہے نہ کہ ساری دنیا کے تعلقات۔ اس وقت مسلمانوں کو عظیم خطرات کا مقابلہ ہے ع اے قصہ گوئے بد ضرورت حراکی ہے۔

پولیٹیکل پہلو کو چھوڑ کر روحانی مذاق کی حفاظت کے لئے ایک جماعت قائم کیجئے۔

صفحہ ۱۶۴　　۱۱ر اگست ۱۹۳۰ء

کل نماز مغرب کے فرض کی دوسری رکعت میں ایک سُرخ بھڑ نے بائیں چھنگلیا میں اس زور سے کاٹا کہ سارے بدن میں درد اور تکلیف کی بجلی دوڑنے لگی۔ (لوگ) کہتے ہیں کہ فرشتوں نے بچالیا میں کہتا ہوں فرشتوں نے کاٹنے ہی کیوں دیا۔ حسن عقیدت کا یہ خیال ہے کہ کسی بیماری کی آمد تھی خدا کی طرف سے یہ اپریشن ہو گیا۔ خیر جو کچھ ہو۔ دنیا تکلیف کا گھر ہے امید فردا وقت ضائع کرنے کے لئے ایک نسخہ ہے۔

اگر ہم لوگ اسقدر نہ بلبلائیں لائڈ جارج اور پوپ کے حضور میں رونا نہ روئیں تو ان کو اپنی دست درازیوں اور فتاحیوں کا پورا مزہ نہ ملے۔ اس تصور سے بہت افسوس ہوتا ہے حوادث اپنا کورس پورا کر رہے ہیں۔

صفحہ ۱۶۷ و ۱۶۸　　۶ر اکتوبر ۱۹۳۰ء

حسینن کی لکنت زبان کی کچھ پروا نہ کیجئے۔ انشاء اللہ اس کی آیندہ عظمت میں خلل نہ پڑے گا۔

دل لغزش سے محفوظ رہے گا۔ یہاں ایک ڈاکٹر صاحب نے ہندی پڑھانا اس کا علاج بتایا تھا۔ میرا دل تو اس بات پر جما نہیں۔ ہندو ڈاکٹر تھے سمجھے کہ شین قاف میں پیچ پانچ ہے۔ کا کھا، گا گھا سیدھی راہ زبان کی ہے۔ کیا ہندی میں لکنت نہیں ہوتی۔ یہ لطیفہ سنئے گاندھی کے ساتھیوں میں جو ہیں وہ نیک بھی ہیں۔ مہراج اور مہاجر کے حروف ایک ہی ہیں لوگ پوچھتے ہیں ان ہنگاموں کا کیا نتیجہ ہوگا ؎

یہ دھوتی سے باہر وہ پتلون سے | غرض کس کو ہے آج قانون سے

شاید اچھا جواب یہ ہے کہ دنیا نتیجے کی جگہ نہیں ہے نتیجہ آخرت میں معلوم ہوگا۔

صفحہ ۱۷۰
یکم فروری ۱۹۲۰ء

مولوی صاحب نے بزور علم خوب تاریخ کہی۔ حور کے لئے پری ان کو داد دیتا ہوں لیکن شاعرانہ داد نہیں دے سکتا۔ مرد کے لئے پری چہر کچھ خوب نہیں۔ مصرعے جو لگائے گئے ہیں پری چہرہ کے ساتھ قافیے صحیح نہیں، بہرحال مولوی صاحب مستحق داد ہیں خوشی کا موقع ہے۔ ہجے لگانے کی ضرورت نہیں۔

حور بانو کی لڑکی کی ولادت پر ایک صاحب نے تاریخ کہی تھی جس میں پری چہرہ کا لفظ آیا تھا۔

صفحہ ۱۷۱
۳۰ مارچ ۱۹۲۱ء

زمیندار کا یہ اندھیر دیکھئے۔ دو تین اشعار پر مجھ پر بدگمانی ہے کہ پنشن کی لالچ سے چپ ہوں یا ادھر سے سازش ہے۔

میں تو چپ نہیں ہوں۔ پولیٹکل[1] کبھی نہیں رہا۔ فلاسوفیکل[2] صوفیانہ طرز ہے۔ میرے مضامین کی ان کو کیا خبر خواہ مخواہ کی کد ہے ــــ اگر ایسوں کی گواہی پر فیصلہ ہو تو جنت غیر آباد رہ جائے گی۔

[1] سیاسی۔ [2] فلسفیانہ۔

صفحہ ۱۷۳
۱۳ر اپریل ۱۹۲۱ء

عزیز لکھنوی مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میرے اس نئے شعر کی داد دی ؎

انہی الفاظ سے اب ذہن خفتہ کو جگاتا ہے
شریعت سر جھکاتا ہے طریقت دل لگاتا ہے

صفحہ ۱۷۵ ۱۶؍جون ۱۹۲۱ء

میری دنیا ہو چکی ہے زندگی باقی ہے اس کا بسر کرنا دشوار ہے ع

بہے جاتے ہیں بے مقصود بحر زندگانی میں

ایک خط میں ایک فقرہ لکھ گیا ہوں اختصار اور سعی کو دیکھئے۔ عشرت میاں چاہتے ہیں کہ آرام سے رہوں خوش رہوں لیکن آرام کی عمر میں خوشی کی عملداری نہیں۔ غالباً اس فقرے کو آپ لٹریری اور پبلک مال قرار دیتے ہیں۔

آخری خط الہ آباد۔ ۲۷؍اگست ۱۹۲۱ء

اپنا حال کیا لکھوں جس قدر میں زندگی سے تنگ ہوں زندگی کو اس کا اندازہ کرتی ورنہ میرے ساتھ ہمدردی کرتی اور ختم ہو جاتی۔

مکاتیب اکبر

صفحات ۱ و ۲ و ۳ و ۴ و ۶ و ۸ و ۹ و ۱۰ و ۱۱ و ۱۲ و ۱۴

"مدتیں گذریں میں نے جسمانی آرام اور دلی خوشی اور رنج کا مضمون پیش نظر رکھ کر خیال کیا تھا آرام اور رنج کا ساتھ ہو سکتا ہے اور تکلیف اور خوشی کا ساتھ ہو سکتا ہے یہ کوئی نازک خیالی نہ تھی مگر اس بنیاد پر ایک سلسلہ مضمون چل نکلا تھا پورا نہ ہوا اور میں اور کاموں میں الجھ گیا اسی ضمن میں، پین، پلیزر، اور چند دیگر الفاظ کے متعلق کچھ نوٹ کئے تھے الہلال میں یہ بحث دیکھ کر میں نے بغیر زیادہ غور کئے ایک خط ایڈیٹر صاحب کو لکھدیا جس کو انھوں نے چھاپ دیا۔ جہاں کانکریٹ ایڈیاز (CONCRETE IDEAS) تصورات مادی۔ تصورات محسوسات نہیں ہیں وہاں ایک زبان کے لفظ کے مقابلہ میں دوسری زبان میں کوئی لفظ پانا جو بلحاظ تمام نازک فروق معانی (SHADES MEANING) بالکل مطابق ہو بہت مشکل ہے۔ مجھ کو خیال آتا ہے کہ ہملٹن نے جو بلحاظ صفائی بیان کے بہت ممتاز ہے سنا جاتا ہے (اب تو وہ داخل دفتر ہو گیا۔ (SIR WILLIAM HAMILTON) سر ولیم ہملٹن انیسویں صدی کے ربع اول میں اسکاٹلینڈ کا مشہور فلسفی گذرا ہے" عبدالماجد) افسوس ظاہر کیا ہے کہ انگریزی میں یونانی فلسفہ کے الفاظ کا پورا

مفہوم ادا کرنے کو الفاظ نہیں ملتے۔ جب یہ صورت ہے تو غیر ذمہ دار لوگوں کے مشورے پر عمل کرنے میں آپ کا تامل حق بجانب ہے۔ بعد غور کے اپنے خط کو واپس لیتا ہوں۔ آپ نے کوئی شعر نہیں کہا۔ کہ میں کہہ سکوں کہ فلاں لفظ کے عوض میں فلاں لفظ ہو تو زیادہ معنی خیز ہو۔ آپ اصطلاحات علمی کی بنیاد قائم کرتے ہیں اگر ہماری زبان یا مشرقی لٹریچر میں اس نے رواج پا لیا (جس کی امید بہت کم ہے تو ان کی پابندی خواہ مخواہ لازم آئے گی) بلحاظ (DEFINITIONS) ڈیفینیشنس (تعریفات) کے ذہن مفہوم قائم کرنے میں خطا نہ کرے گا۔ راحت و الم۔ راحت و اذیت۔ لذت و اذیت۔ حظ و کرب وغیرہ میں جو چاہئے لے لیجئے۔ میں آپ کے شعر سن کر بہت محظوظ ہوا۔ اُن سے ملنے میں کچھ حظ نہ آیا۔ حظ نفسانی سے احتراز کرنا چاہئے۔ اُردو فارسی میں بلاشبہ یہ الفاظ بلیژرز کے مفہوم میں مستعمل ہیں۔ کرب تو عربی میں بھی تکلیف، مصیبت کے معنی میں مستعمل معلوم ہوتا ہے۔ قرآن پاک میں پڑھتا ہوں۔ ولقد مننّا علی موسیٰ وھارون ونجیناھما وقومھما من الکرب العظیم البتہ کرب شاید بین کا بڑھا ہوا درجہ ہے لیکن جیسا میں عرض کر چکا ہوں تعریفات لکھ کر جو اصطلاحات مقرر کر دیجئے گا اس کی پابندی ہو جائے گی۔ کم سے کم مفہومات میں اختلاف نہ ہوگا اور یوں تو ہر شخص کا دل ہے۔ کوئی عاشق آہ کرتے ہیں حضرت قیس کے سروں کا پابند نہیں۔ ہم لوگوں کو حق نہیں ہے کہ بغیر شرکت اور ذمہ داری کے آپ کو ٹوکیں۔

آپ کی کل تحریر سے مجھ کو اتفاق ہے بجز اس کے ہیپینس (HAPPINESS) کا ترجمہ لذت میں ابھی نہیں سمجھا لیکن تھوڑی سی گفتگو کے بعد سمجھ لینے کو تیار ہوں گا الفاظ کو ہمارے مفہومات کا تابع ہونا چاہئے مدت سے مجھ کو یہ آئیڈیا تھا لیکن کالکٹو سیکالوجی کا لفظ آپ سے سنا اور بہت خوش ہوا۔ میں نے الہلال کے آرٹیکل[ئے] نہیں دیکھے تھے صرف اسی پر نظر پڑی ہے حظ و کرب، لذت و الم کس کو ترجیح ہے۔ پہلے دونوں لفظ مانوس تھے۔ میں نے الہلال کو دو سطریں لکھ بھیجیں اس کے بعد میں نے آرٹیکل پڑھے آپ کی مشکلات کا خیال آیا لہذا میں نے دست برداری کی ؎

نگفتہ ندارد کسے با تو کار ولیکن چو گفتی دلیلش بیار

"دانم چرا نگویم" کی تو افراط ہے لیکن مدد اور کام کی بات بہت کم ہے۔

ئے مضمون = ARTICLE

عضویات (عبدالماجد صاحب نے لفظ مستعمل وظائف الاعضا کے بجائے فزیالوجی کے لئے عضویات کا لفظ پیش کیا تھا) مجھ کو بھی بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن یائے نسبت لگائیے تو الف اور ت کو حذف کر دینا ہی (یعنی عضوی) اولا نظر آتا ہے۔ طبیعات سے طبعی۔ لیکن متنازعہ لفظ تو حظ ہے اور شاید کرب بھی۔ اس کے متعلق کچھ نوٹ لکھدیئے ہیں (حضرت ماجد نے مصطلحات نفسیات کی فہرست رائے زنی کے لئے بھیجی ہے) کتابیں بند پڑی ہیں اور بے ترتیب ہیں کچھ مدد نہ لے سکا۔"

غالباً علمائے مصر نے ان علوم میں مغربی فلسفہ سے باخبر ہو کر تصنیف کی ہیں اگر ایسا ہو تو کیوں ان سے بشرط امکان موافقت نہ کی جائے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ ان جملہ الفاظ کو پبلک کے سامنے لغرض کرٹیسں ازم (CRITICSM تنقید مراد ہے) پیش کردیں اور بعد کسی بحث کے جو پیش ہو فیصلہ ہو۔

آپ نے خط میں جو مضمون متعلق الفاظ سابقہ (PREFIX) ولاحقہ (SUFFIX) وغیرہ کے لکھا ہے وہ نہایت صحیح ہے۔ HAPPINESS AND MISERY کا ترجمہ دکھ سکھ بہت اچھا ہے لیکن یہ الفاظ اس انجمن میں بے وقعت ہیں۔

اتفاقاً مولوی حمید الدین صاحب سے ملاقات ہوئی (مولانا حمید الدین صاحب بی۔ اے اعظمگڈھی جو اس وقت الہ آباد کالج میں عربی کے پروفیسر تھے) وہ فرماتے تھے PRESTIGE کا ترجمہ دھاک صحیح ہے۔ میں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن یہ خیال آیا کہ شاید رعب میں بھی مطلب پورا ہو جاتا ہے میں نے اردو میں مفہوم کے اعتبار سے سطوت کو پاکیزہ لفظ سمجھا تھا البتہ خود تاثری کی ترکیب صحیح نہ معلوم ہوئی۔ یائے توصیفی اسم صفت میں بڑھاتے ہیں۔ خود متاثری البتہ ہوسکتا ہے۔ بعد استعمال غیر مانوس نہ رہے گا۔

ABSTRACT IDEAS کا ترجمہ لوگوں نے منتزعہ کر رکھا ہے۔ انتزاع سے جن کے معنی کھینچنے اور نکالنے کے ہیں۔ آپ نے شاید کوئی اور لفظ لکھا ہے۔ وہ بھی ٹھیک ہوگا ورنہ شاید میں نظر کرتا۔ لیکن آپ نے نہ خیال کیا ہو تو اب خیال کر لیجئے اگر لفظ موضوع موجود ہو تو عدول کی کیا ضرورت۔

پرسٹج کے لئے ایک لفظ وقار رات میرے ذہن میں آیا لیکن صرف اردو بول چال میں یہ لفظ آئیڈیا کے قریب ہے۔ تمھارا وقار جاتا رہا۔ تمھارا بڑا وقار ہے۔ حظ (بہرہ مندی) کا ٹھیک اپوزٹ ٹرم (APPOSITE TERM لفظ مقابل) کو سوائے حرماں (بے نصیبی) کے کوئی نہیں لیکن حرماں

میں پین کا آئیڈیا صریحی نہیں ہے۔ اُردو میں مایوسی کے معنوں میں شعرا کی زبان پر ہے۔ یاس و حرماں غالباً کہہ سکتے ہیں وہ محظوظ ہوئے میں محروم رہا۔ لذت والم میں کچھ حرج نہیں لیکن واضع مصطلحات کو اختیار ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ لفظ وقار پرسٹج کے لئے نہایت اچھا بلکہ ٹھیک اسی سنس SENSE (مفہوم) میں ہے جس میں انگریزی پرسٹج کا لفظ یہاں استعمال کرتے ہیں۔ دھاک اور رعب اسٹرانگ ٹرمس (تیز الفاظ = STRONG TERMS) ہیں وقعت بہت ڈھیلا لفظ ہے۔ وقار سطوت کی طرح سجل سڈول اور آپ کی پسند کے لائق ہے اور روزمرہ میں داخل ہے اس کے لغوی معنی میں بھی (وزن، دباؤ گراں ہونا) پرسٹج کے لغوی معنی کا آئیڈیا تاویلاً موجود ہے۔

آپ نے محاورہ اُردو سے استدلال کر کے لفظ حظ و محظوظ کو میری نظر میں پلیژر سے ایسا موافق اور قریب کر دکھایا ہے کہ میں لذت کی سفارش اسی بنا پر کر سکتا ہوں کہ وہ بھی کام دیتا ہے اور شاید پاپلر (مانوس =POPULAR) ہے۔

آپ مس ماڈ (ایک مشہور رقاصہ انگلستان) سے آگاہ ہوں گے، برہنہ ہو کر ایسا ناچتی ہیں کہ شائقین سائنس داں کو وجد آجاتا ہے، ہندوستان آرہی ہیں لوگوں نے روکنا چاہا نہ رکیں پاینیر لکھتا ہے اگر اس ناچ کی اجازت ملی تو THE PRESTIGE OF WHITE WOMAN IN INDIA WOULD BE SOMEWHAT INJURED اب ذرا دیکھئے پرسٹج یہاں کس سنس میں مستعمل ہوا ہے۔ دھاک کا لفظ موزوں نہیں شاید سطوت بھی بے موقع ہو بلکہ وقعت کا لفظ ٹھیک معلوم ہوتا ہے وقعت میں بھی دھاک کا آئیڈیا موجود ہے، اطلاعاً لکھا گیا۔

میں نے پرسٹج کا ترجمہ وقار آپ کو لکھا اور اسی پر اطمینان ظاہر کیا لیکن غور کے بعد معلوم ہوا کہ جہاں تک "وہائٹ ومن" کے فقرے سے تعلق ہے وقار نہایت ٹھیک ہے لیکن انگلش ریس کا پرسٹج انڈیا میں وقار کے سنس میں بہت صحیح نہیں معلوم ہوتا ہم کبھی کہتے ہیں کہ فلاں مولوی صاحب کا حکام میں بہت وقار ہے اس سے رعب و سطوت کا مفہوم نہیں نکلتا لہذا آپ کی سطوت (عبدالماجد صاحب کا لفظ مجوزہ) قائم رہتی ہے۔ رعب ہو یا سطوت، رعب میں INTENSITY (گداز) زیادہ ہے۔ سطوت کے معنی حملے کے ہیں لیکن رعب کا مفہوم بھی ہماری زبان میں تو ہے۔

مکاتیب اکبر بنام حضرت عزیز لکھنوی

صفحات ۴۸ و ۴۹ و ۵۰ و ۵۱ و ۵۲ و ۵۵۔

"آمن کو مؤنث بولتا ہوں۔ قیاس ہے کہ میم مفتوح ہو مگر سنا ہے مکسور۔"

تنباکو کی بحث میں کلیم کے قلمی دیوان میں ایک شعر خوب مل گیا ؎

بزم عشرت روشنائی از کجا پیدا کند　　　آتش مے رفت و جایش دود تنباکو گرفت

(ارنجور صاحب)

اصلاح سخن کو ملاحظہ فرما کر دو چار دن میں واپس کیجیے۔ حضرت نامہ نگار کے نزدیک تمام الفاظ فارسی مثل شنبہ، عنبر وغیرہ کا املا غلط ہے۔ عرب کے تصرف بیجا کا نتیجہ ہے۔ تنباکو پر رفارم کیا گیا ہے شمبہ اور دمبہ بھی جائز ہے۔ دمبے میں تو دم کی رعایت بھی ہے۔ شعر ما بدرسہ کہ برد ہ کا حال ہے۔ تنباکو غیاث میں بھی موجود ہے اور تمام کتب فارسی میں یہی املا ہے ــــ میں دیکھتا ہوں کہ ایجاد اہل لکھنؤ میں تانیث ہے اور میری زبان پر بھی یہی ہے۔

نوح صاحب (شاگرد داغ) نے مجھ سے یہ امر دریافت کیا تھا میں نے لکھدیا کہ نون سے لکھنا صحیح ہے انھوں نے میرے حواشے سے اصلاح سخن میں ایک تحریر بھیجدی انھوں نے اور شواہد پیش کئے تھے۔ میرا بھی ذکر تھا۔ اگر کوئی یہ کہتا کہ اب تو لوگ تمباکو بھی لکھتے ہیں، صحیح ہو یا غلط رواج بھی ایک سند ہے تو وہ سچ کہتا۔ چالیس برس بعد یہ اُردو نہ رہے گی۔ ایک صاحب نے تو کمال کیا کہ فارسی کے اس اصول املا ہی کو غلط ٹھہرا دیا معلوم نہیں عربی اور عبرانی کو کیوں چھوڑ دیا۔ انصاف اسی کا مقتضی ہے کہ کہہ دیں املا کی تحقیق مدنظر نہ تھی چونکہ لوگ تمباکو لکھتے ہیں میں نے بھی غلطی سے لکھدیا لیکن پاس سخن کا مرض اور وہ اس سے محفوظ ہوں!! وہ ہرگز ایسا نہ کریں گے اور میں تو ڈرتا ہوں کہ جس نے تمباکو لکھا ہے وہ میم پر اڑ جائے گا، اصول رخصت، فارسی شکست کلکتے والے کی ڈگری لیکن زمین جنبد نہ جنبد گل محمد۔ میں نے جو لکھدیا وہی ٹھیک۔ تمام لغات فارسی ن کے شاہد ہیں۔ ایک نہیں بیسیوں شعر شعرائے ایران کے جن میں یہ املا ہے اور بلا استثناء یہ قاعدہ جاری ہے کم علمی۔ بے ہنری۔ عدم تحقیق کے ساتھ ضد اور حسد کا بھی زور ہے اگر یہ نہ ہوتا تو حریف کی خوش اقبالی

کیونکر ثابت ہوتی۔ اسی وجہ سے میرا دل نہیں چاہتا کہ میں زبان کھولوں یا قلم اٹھاؤں۔ میرا علم بھی نہایت کم اور نہایت ناقص ہے۔ انگریزی میں علم الالسنہ کی کتابیں دیکھکر وسعت اور مشکلات علمی کا اندازہ کرسکتا ہوں۔ ہاں صاحب تین البکا کی ذرا تشریح و توضیح کیجئے۔ تنباکو کن اعتبارات سے اس لفظ کا مدلول ہوسکتا ہے اور تین البکا کے کیا معنی ہیں۔ رونے کی سوکھی گھاس یا کیا۔

مضمون در تحقیق لفظ تنباکو

اصلاح سخن کا پرچہ لاہور سے مدت کے بعد شائع ہوا ہے۔ کسی صاحب نے جو فارسی لٹریچر سے ناواقف معلوم ہوتے ہیں خوب طبع آزمائی کی ہے لکھا ہے کہ ہم شکسپیئر کی ڈکشنری کو نہیں مانتے۔ تمباکو ٹھیک ہے۔ میں تو ان مباحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ علم گم ہوگیا ہے۔ مادہ تحقیق جاتا رہا ہے۔ محمد نوح صاحب رئیس نارہ ضلع الہ آباد نے جو حضرت داغ کے شاگرد ہیں مجھ سے ایک مرتبہ پوچھا کہ تنباکو کا املا کیا ہے، میں نے کہا ن سے ہے، انھوں نے جلیل صاحب کا رسالہ تذکیر و تانیث دیکھ کر کہا اس میں تو میم سے لکھا ہے۔ میں نے کہا مجھ کو تو ن ہی سے لکھنا سکھایا گیا ہے اور حضرت جلیل کا رسالہ تذکیر و تانیث کی سند ہوسکے املا کی تحقیق سے کیا تعلق، بعد اس کے میں نے دیوان ناسخ دیکھا جو مطبع نولکشور میں چھپا ہے۔ شاید ۱۰ دس، ۱۲ بارہ سال ہوئے اس میں یہ شعر ہے ؎

منہ لگاتے ہی نئے قلیان بنی ہے نے شکر ۔۔۔ دود تنباکو نسیم باغ رضواں ہوگیا

ن سے املا ہے، شکسپیئر ڈکشنری میں یہی املا تھا۔ اسی بنا پر محمد نوح نے اصلاح سخن میں کوئی مضمون لکھا تھا اب اس کی تردید چھپی ہے ملاحظہ فرمایئے، علاوہ ان سندوں کے جن کا ذکر کیا گیا میں نے بہار عجم کو دیکھا جو ایک مشہور کتاب ہے اور مطبع نولکشور میں چھپی ہے اس میں بھی لفظ تنباکو ن سے ہے۔ فارسی دیوان کلیم میں جس کا قلمی نسخہ بخط ولایت کئی سو برس کا لکھا ہوا مولوی شبلی صاحب کے پاس موجود ہے۔ اس میں یہ شعر ہے ؎

بزم عشرت روشنائی از کجا پیدا کند ۔۔۔ آتش مے رفت و جاتش دود تنباکو گرفت

صاف اور صریح طور پر ن ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارے لٹریچر میں تنباکو کا یہی املا تھا۔ اگر ہم نے اس کے مطابق لکھا تو کیا گناہ کیا۔ مولوی عبدالحلیم صاحب شرر کے دلگداز میں

تنباکو کا اشتہار ہے اس میں بھی ںؔ ہی املا ہے۔ رسالہ لسان العصر میں بھی لائق ایڈیٹر نے تنباکو کو نؔ ہی سے لکھا ہے۔ صرف شکسپیئر ڈکشنری کا اعتبار نہیں کیا گیا بلکہ قدیم فارسی کتابوں میں تنباکو کا املا نؔ سے ہے۔ ترقی کا زمانہ ہے۔ زبان اور املا مستثنیٰ نہیں ہے۔ لفظ پوچھنا (پرسیدن) کے معنی میں ہے۔ بہت لوگ پونچھنا لکھتے ہیں۔ سیکڑوں کو سینکڑوں لکھتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

جب بہت لوگ ایک طریق کو اختیار کر لیتے ہیں تو وہ امر برائے خود ایک سند ہے برف کو اس وقت لاکھوں آدمی بہ صیغہ تذکیر بولتے ہیں لیکن جو بہ تانیث بولتے ہیں ان پر اعتراض نہیں ہے۔

صفحہ ۱۴۱

تنباکو کا شکر گذار ہوں۔ دیکھوں گا کیسا ہے۔ آپ کی رائے تنباکو کی تذکیر و تانیث کی نسبت صحیح ہے لیکن ایک وقت میں مدعیان زباندانی اُردو کی لکھنؤ میں یہ رائے تھی کہ خوردنی تنباکو تانیث کے ساتھ بولا جائے لہذا یہ کہنا چاہئے کہ وہ مختلف فیہ ہے دونوں جائز ہیں۔

اپریشن ۱۵ دسمبر ۱۹۰۹ء بمقام کلکتہ

لسان العصر کی آنکھ کا اپریشن ہوا معاً ان کے دل میں ایک مضمون پیدا ہوا اور اسی وقت اشعار موزوں کر کے لکھوا دیئے

MILTON ON HIS BLINDNEES

WHEN I CONSIDE HOW MY LIFE IS SPENT
ERE HALF MY DAYS, IN THIS DARK WORLD AND WIDE,
AND THAT ONE TALENT WHICH IS DEATH TO HIDE
LODGED WITH ME USELESS, THOUGH MY SOUL MORE BENT
TO SERVE THEREWITH MY MAKER, AND PRESENT
MY TRUE ACCOUNT, LEST HE RETURNING CHIDE,—
DOTH GOD EXACT DAY-LABOUR, LIGHT DENIED ?
I FONDLY ASK; - BUT PATIENCE TO PREVENT
THAT MURMUR, SOON REPLIES; GOD DOTH NOT NEED
EITHER MAN'S WORK, OR HIS OWN GIFTS ! WHO BEST
BEAR THIS MILD YOKE THEY SERVE HIM BEST, HIS STATE
IS KINGLY; THOUSANDS AT HIS BEDDING SPEED
AND POST OVER LAND AND OCEAN WITHOUT REST
THEY ALSO SERVE WHO ONLY STAND AND WAIT.

میں نے مرشد سے کیا جا کر یہ اک دن التماس
کار دنیا نے بہت مجھ کو کیا ہے اب اداس
جلوۂ دنیا نے مجھ کو کر دیا ہے بے بصر
آخرت پر اب نہیں باقی رہی میری نظر
فلسفے نے مجھ کو دکھلایا فقط دنیا کا فیکٹ
میری چشم طبع کو عارض ہے غربی کیٹریکٹ
میرے حق میں کوئی فکر سالویشن کیجئے
ہو سکے تو مذہبی ایک آپریشن کیجئے
کی توجہ حضرت مرشد نے میرے حال پر
اک نظر ڈالی مرے اقوال پر اعمال پر
چشم باطن میں دیا نشتر نگاہ تیز کا
کٹ گیا وہ رنگ محسوسات کفر انگیز کا
پھر دل پر مرے تقویٰ کی پٹی باندھ دی
آنکھ پر شوق لقائے حق کی پٹی باندھ دی

(آپریشن نے بٹھایا ہے مجھے گوشہ میں)

اپریشن کے سبب سے ہوں پڑا گوشہ میں
اے ہجوم ہوس دیدنہ تو روند مجھے

پہلے تاریک و مکدر تھی نظر اے اکبر
اب جھکا جھک کے سبب سے ہے چکا چوند مجھے

۳۱ر دسمبر ۱۹۰۹ء

ڈاکٹر مینارڈ ہیں اپنے ہنر میں لاجواب
ہاتھ ان کا برق ہے نشتر شعاع آفتاب

ہفت سالہ تھا مرض اک پل میں زائل ہوگیا
آنکھ روشن ہوگئی جاتا رہا سارا حجاب

پانچ ہی دن میں نہ پٹی تھی نہ وہ بستر کی قید
حسن کلکتہ کا تھا اور میری نگاہ انتخاب

ڈاکٹر مینارڈ کو اللہ رکھے شاد کام
اور رہے خلق خدا اُن کے ہنر سے شاد کام

یہ نظم ڈاکٹر صاحب موصوف کے فرمائش سے لکھی گئی اس کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر صاحب کے یہاں فریم میں لگا ہوا ہے۔

غیر مطبوعہ کلام

یکم اپریل ۱۸۸۲ء۔ از بیاض سید اکبر حسین صاحب ریٹائرڈ سب رجسٹرار

تغزل

تری ترچھی نظر سے ہم کو ڈر کیا — محبت کی تو پھر دل کیا جگر کیا
تپ فرقت سے مر مر کے بچا ہوں — مگر سچ ہے تمھیں میری خبر کیا
عنایت دل سے بس کافی ہے مجھ — ادھر کے بیٹھنے میں کیا ادھر کیا
چلا جاتا ہے اک میلا ادھر سے — خدا جانے تماشے ہیں ادھر کیا
لبوں تک سو جگہ آتی ہیں رک کر — ان آہوں میں بھلا ہوگا اثر کیا
زباں سے کیا کہوں خود دیکھ لینا — ابھی دو دن کی الفت کا اثر کیا

سادگی

واللہ خوب ہی ہوئے یاروں کے جمگھٹے — مطلب یہ تھا سرور بڑھے اور دم گھٹے
کھانے بھی خوب کھائے اڑیں گلچھیں بھی خوب — لیکن ہوا یہی کہ بڑھے آپ ہم گھٹے

انقلاب

وہ دل ہی اب نہ رہا عشق کی تھی جس میں اُمنگ — طبیعت اب وہ کہاں جس میں تھا مذاق کا رنگ
ستم رسیدہ ہوں میرے لئے خوشی کیسی — جو دل ہی ٹوٹ گیا ہو تو دل لگی کیسی
کسی زمانہ میں ہاں ہم بھی رند مشرب تھے — اسیر گیسوئے پیچاں تھے کشتۂ لب تھے
اکڑ کے ملتے تھے یاران سرو قامت سے — غضب کا جوش تھا ڈرتے نہ تھے قیامت سے
خیال شام ہی رہتا تھا کچھ نہ فکر سحر — ہمیشہ دھنی تھی گیسو و رخ پہ اپنی نظر

خوش ہی رہتے تھے دن رات غم سے کام نہ تھا میان کوچہ افسردگی مقام نہ تھا
جو بزم رقص میں پہنچے تو رات بھر بیٹھے جدھر حسینوں کا جھرمٹ ہوا اُدھر بیٹھے
جگت مذاق سے خالی کوئی کلام نہ تھا وہ رنگ تھا کہ تکلف برائے نام نہ تھا
نگاہ پڑتی تھی ہر اک کی اپنی صحبت پر تمام شہر کو تھا رشک اپنی عزت پر

کہاں تلک کوئی باغ جہاں کی سیر کرے
دعا یہ ہے کہ خدا عاقبت بخیر کرے

معاشرت

کہا یہ حضرت واعظ نے مجھ سے آج اے اکبرؔ عبث شوق تن آسانی وہ جاہ و حکمرانی ہے
قناعت پیشہ ہو یاد الٰہی میں بسر کر دے یہ سب شور ظہور عالم ایجاد فانی ہے

جواب اس کا دیا میں نے کہ بیشک بات تو سچ ہے
مگر حضرت یہ طرز زندگی ہندوستانی ہے

تہذیب

کہتے ہیں اکبرؔ یہ میری عقل کا کیا پھیر ہے طبع تیری اس نئی تہذیب سے کیوں سیر ہے
عرض کرتا ہوں کہ حاضر ہوں گا میں بھی عنقریب ہو چکا ہوں پیر بس نابالغی کی دیر ہے

تغزل

لے لے گئے لحد سے تبرک سمجھ کے خاک مٹی خراب کی مرے اعمال نیک نے

سیاست

کمیٹی میں نہایت سچ کہا کل شیخ چھیدی نے
کرٹر کی کو مصیبت میں پھنسایا گھر کے بھیدی نے

ممبری

کیا خبط ہے کہ شان ریاست ہے ممبری
پبلک میں ایک ذریعۂ شہرت ہے ممبری
ہاں بے زروں کے واسطے دولت ہے ممبری
بے عزتوں کے واسطے عزت ہے ممبری
سچ پوچھئے تو قابل نفرت ہے ممبری

ایام انتخاب کے آئے قریب جب
ہونے لگیں خوشامدیں ووٹر کی روز و شب
بھائی، چچا کا پھر انھیں دینے لگے لقب
کہنے لگے تمھیں پہ ہے دار و مدار سب
اپنی تو بس تمھاری بدولت ہے ممبری

موٹر فٹن کی ڈاک ہے اکثر لگی ہوئی
ایک ایک کے سواری ہے گھر گھر لگی ہوئی
ہے ووٹروں کی جان بلا میں پڑی ہوئی
یاروں کی بھیڑ جن کے ہے در پر کھڑی ہوئی
جنجال ہے وبال ہے آفت ہے ممبری

طرہ یہ ہے کہ اس پہ ہے سارا زمانہ لوٹ
تلی مخالفوں میں ہے باہم غضب کی چوٹ
ہر ایک چاہتا ہے کہ مل جائے ہم کو ووٹ
پروا نہیں ہے شوق سے بک جائے ہیٹ کوٹ
فاقہ سے گر ملے تو غنیمت ہے ممبری

ممبر جو ہو گئے کہیں بھولے نصیب سے
پھرتے ہیں اینٹھتے ہوئے شکل عجیب سے
گذرا جو راہ میں کوئی ووٹر قریب سے
لیتے نہیں سلام بھی اب اس غریب سے
ناز و غرور و کبر و رعونت ہے ممبری

اس ممبری کو دور سے بس کیجئے سلام
ممبر وہ ہے خوشامدی ٹٹو کا دے جو کام
دانہ ہے اور گھاس کھریرا ہے صبح و شام
بیگاری اہل شہر کا حکام کا غلام
بیٹھے بٹھائے مفت کی خدمت ہے ممبری

پر چارہ کار بھی نہیں اس کے سوا ہمیں
کچھ انتظام کا نہیں ملتا پتہ ہمیں
بھائی یہ ممبر و جو کمیٹی سدا ہمیں
جی ہاں حضور کہنا مکرر بدا ہمیں
اس واسطے ذریعۂ شہرت ہے ممبری

قطعہ

دشمن دیں مبیں ... بدکیش لعیں
حیدرآباد سے جب کفر کا جمال آیا

اکبر زار بھی اس روز پئے استقبال
ریل تک ہانپتا اور کانپتا بدحال آیا

غیب سے آئی صدا سال ورود مردود
عیسوی سن کی قسم نائب دجال آیا

ممبری

ہاروں ہزار بار نہ آئے حیا بھی مجھے
تیوری پہ بل بھی آئے تو دینا سزا مجھے

دشمن کے آگے لاش بھی گر ہو پڑی ہوئی
اک بار پھر میں اینٹ اکھاڑوں گڑی ہوئی

ساتی کتاب خانہ قانون کی قسم
دوکانہائے غلہ و پرچون کی قسم

کاکا کو جو ہوا اسی طاعون کی قسم
بھاگوں نہ لالہ جی کی قلمدوں کی قسم

ہٹ جاؤں وہ ہی لاتوں میں بکیں نہیں ہوں میں
سمجھا ہے کیا اصیل ہوں گھاگس نہیں ہوں میں

اس ممبری کے واسطے سب گھر بھی ہے نثار
زر کیا ہے اس محلہ کا زرگر بھی ہے نثار

گھوڑا نثار اونٹ بھی خچر بھی ہے نثار
یہ پورے چھ ہزار کا موٹر بھی ہے نثار

جب بات آپڑی ہے تو دوکان بھی فدا
دوکان کون چیز ہے ایمان بھی فدا

دیکھیں ہرائے جائیں وہ کب تک ہرائیں گے
اب ہم کو بھی یہ ضد ہے کہ ہر بار جائیں گے

کتنا ہی زور ہم کو مخالف دکھائیں گے
تم دیکھنا کہ باز نہ ہم ہرگز آئیں گے

ہم سر پہ ایسی کتنی ہی چوٹیں اٹھا چکے
چپراسیوں کے ہاتھ سے دھکے بھی کھا چکے

اکبر یہ غور کرکے ذرا دل میں دیکھئے
تھکنے پہ بیٹھتے نہیں محل میں دیکھئے

غیرت نہیں ہے آنکھ کے بھی تل میں دیکھئے
امسال پھر بھی دوڑے ہیں کونسل میں دیکھئے

از بیاض مشتاق احمد صاحب ایم۔اے فائنل

تصوف

ملو گاندھی سے اے اکبر اگر سٹرکوں پہ بجے چاہو
جھکو سلطان کے آگے اگر فرمان رسے چاہو

شریک بزمِ رندِ عافیت جو آ کے ہو جاؤ
جو ذوقِ بیخودی اور دورِ جام سے چاہو

حالاتِ حاضرہ

آپ نے واپس یہ کیا کیوں خطاب
بیٹھے ہیں کیوں گوشہ میں مغموم و سُست
کہنے لگے اس کا اثر ہو گا گیا
ناز براں کن کہ خریدار تست

غلامی

شوخیِ غرب سے گھبرائی جو شرقی رندی
بت نے انگڑائیاں لیں دیر میں چمکی ہندی
لب پہ آیا یہ سخن کیسی اٹھی ہے آندھی
لہجۂ صبر و متانت میں یہ بولے گاندھی
ذہنِ عالی سے ترشنے لگے قانون نئے
عاجزی ہم کو سمجھانے لگی قانون نئے

تعلیمِ جدید

خوب ہنگامہ ہے جس کی ہر طرف تائید ہے
آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
ستحقانِ ادب نے آپ کو رُسوا کیا
آپ کے دعوئے عظمت کی بھی اب تردید ہے

انگلشن کو خدا نے بادشاہی دی ہے
رفتارِ زمانہ نے گواہی دی ہے
مدد بھی لگاتے ہیں مدریا کا دم
ہندو کو حلیم جو لالہ شاہی دی ہے

اثر دورِ فلک کا پڑ رہا ہے جو زمانے پر
تمھارے یہ ریزولیوشن اسے کم کر نہیں سکتے
کریں گے وہ ترقی ہم جو ہے ذاتی و روحانی
تمھارے ساتھ اس ذلت کا ماتم کر نہیں سکتے

RESOLUTION = تجویز - تحریک -

نشانِ شوکتِ گاندھی کجا بود
کہ اکبر صرفِ کشفِ ماجرا بود
بجائے ملک لیکن مدعایش
خدا بود و خدا بود و خدا بود

کس سوچ میں ہمارے ناصح ٹہل رہے ہیں
گاندھی تو وجد میں ہیں یہ کیوں اُچھل رہے ہیں
ہیں وفد اور اپیلیں فریاد اور دلیلیں
اور کبرِ مغربی کے ارماں نکل رہے ہیں

ستیاگرہ

شب وصال میں گاندھی کا وعظ آفت ہے — یہ حکم ہے کہ نہ بڑھئے مساس کی حد سے
ہر اک کی رگ میں نہیں ہے سکون روحانی — یہ ضبط سہل نہیں جذبۂ مجرد سے
نگاہ دور ہی رکھو خیال کافی ہے — بجز فساد کے حاصل نہیں کچھ اس کد سے

گاندھی سے کیوں ہو وحشت باطن کی مسٹری ہے — شوکت سے کیوں نہ کھسکیں انکی تو ہسٹری ہے

شیخ جی کو ذرا کھلانا ہے — لالہ صاحب کو دیکھے بھالے ہیں

دھوتی کے پیچ میں ہیں تہمد میں تن رہے ہیں — صاحب بنا رہے ہیں ہم لوگ بن رہے ہیں

تیغ زباں کی دیکھو ہر سو برہنگی ہے — بابو کی ہیں کلیلیں صاحب کی دل لگی ہے

طبع گاندھی و گورنمنٹ کو برہم نہ کرو — ہاتھا پائی سے شب وصل کی کچھ غم نہ کرو

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد — لیکن اڑجاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

جو گرہ میں تھا حریفوں نے اڑایا اس کو مفت — اب فقط اخبار میں اور من چہ گویم او چہ گفت

وہ اٹھنے دیتے ہیں خود فتنہائے بے حقیقت کو — کہ تا حاصل کریں اس کے فرو کرنے کی لذت کو

نہیں کہتا کہ چھوڑیں شغل ملکی دردمندی کا — بس اک نظارہ کرلیں آکے شملہ کی بلندی کا

اظہار جوشش طبع میں وقت اپنا کھو چکے — اونگھے جناب شیخ بھی گاندھی بھی ہو چکے

پنڈت سکھائیں بیچ میں پڑکے تو کیا کریں — کابل کے بل سے گائے جو بھڑکے تو کیا کریں

دور گردوں میں نیا ہر روز اک ہنگامہ ہے — شاہنامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے

مرگ ہاشم

مکاتیب اکبر بنام حضرت عزیز لکھنوی

الہ آباد۔ ۲۲ مئی ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۸۴

"ہاشم سلمہٗ اصرار کرکے بمبئی دیکھنے گئے تھے۔ میں بسبب گرمی اور اپنی ناتوانی کے نہ جاسکا

لیکن ان کا انتظام اور ان سے مراسلت قائم رکھنے کے لئے الہ آباد میں قیام ضروری تھا۔ ہاشم چوتھے روز بمبئی میں بیمار ہوگئے۔ یہ دانشمندی کی کہ فوراً واپس آئے۔ تپ میں بیہوش پہنچے۔ اِس وقت چیچک میں مبتلا ہیں غافل پڑے ہیں۔ اللہ شفا دے۔

۹ر جون ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۸۵

آپ کس طرح اس خبر کو سننے کو تیار ہوں گے کہ میرے نور نظر زندگی کے سہارے ہاشم نے ۵ر جون کو دنیا سے رحلت کی۔ بیس دن علیل رہا۔ چیچک نکل کر دانے ڈھل گئے تھے لیکن پھر تپ آئی اور بالآخر سرسام ہوگیا۔ جو حالات موجودہ تھے اُن سے آپ آگاہ ہیں اسی لڑکے سے گھر تھا میرے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ بہت کچھ ترقی کی۔ افسوس کہ چودھویں سال میں یہ مہ پارہ غروب ہوکر نظر کو تیرہ و تار کرگیا۔ میں زیادہ نہیں لکھ سکتا۔ ایسے ہونہار بچے کا اُٹھ جانا اور میرا دل شکستہ ہو جانا اس کی توضیح کے لئے مذہبی فلسفہ میں بہت تعمق چاہیے۔ میں اس وقت مضطرب ہوں ضبط کررہا ہوں لیکن ابا ابا کی صدا کانوں میں گونجتی ہے۔ اس لڑکے نے شعر اور اُردو لٹریچر میں بہت بصیرت حاصل کی تھی۔

۱۶ر جون ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۸۷

معیار میں اندراج خط کیا ضرور حسرت واندوہ کا بڑھانا ہے۔ خدا صبر دے اور حکمت و معرفت عطا فرمائے۔

یکم جولائی ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۸۷ و ۸۸

ابتداءً طبیعت میں ایک سخت ہیجان پیدا ہوا۔ خدا جانے کیا خیالات تھے اب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں کیا اور دنیا ہی کیا۔ زندگی بھی حیرت انگیز ہے جو افسردگی پیدا ہوگئی ہے وہ فقط فقدان غفلت ہے۔ مجھ کو معلوم نہیں میں نے خط میں کیا لکھا تھا اگر زیادہ بے صبری اور خدا فراموشی نہ ٹپکتی ہو تو شائع ہوسکتا ہے اصل یہ ہے کہ مجھ کو اب اس خیال کا بھلا دینا ہی جہاں تک ممکن ہو مناسب معلوم ہوتا ہے۔

الہ آباد۔ ۲۸ر اگست ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۸۹

دنیا کی بے ثباتی نظر سے اس قدر قریب ہوگئی ہے کہ حواس کو قائم رکھنے میں تکلف محسوس

ہوتا ہے ۵

زندگی کی انجمن میں وہ ہنوا ور میں رہوں ۔ اللہ اللہ یہ مصیبت بس اب آگے کیا کہوں
روکتا ہوں دل کو لیکن اس کی خواہش ہے یہی ۔ خون ہو کر آنسوؤں کے ساتھ ہی میں بھی بہوں
مقتضا قانون فطرت کے ادب کا ہے سکوت ۔ آرزو تو ہے یہی جب وہ نہیں میں بھی نہ ہوں

خیر جو کچھ ہو خدا سے ہے یہ اکبر کی دعا
امر طاعت پر رہوں قائم سہوں جو کچھ سہوں

۲۵ اکتوبر ۱۹۱۳ء ۔ صفحہ ۹۲

طبیعت پر غم مستولی ہے ۔ رات بے ساختہ یہ اشعار کہے

ناصحا آخر میں دل کی پاسداری کیا کروں ۔ یہ تو بتلا کر کے ترک آہ و زاری کیا کروں
وہ چمن ہی جل گیا جس میں لگائے تھے شجر ۔ اب تجھے پا کر میں اے باد بہاری کیا کروں
جان ہی کا جسم میں رہنا ہے مجھ کو ناگوار ۔ دوستوں سے ادعائے دوستداری کیا کروں
(شکل ہاشم سامنے ہے)
یاس ہے آنکھوں کے آگے ہر نظر ہے برق دل ۔ ایسی صورت میں علاج بے قراری کیا کروں

خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی

الہ آباد ۔ ۱۰ جون ۱۹۱۳ء ۔ صفحہ ۱۴

بیشک نازک وقت ہے اور آپ میرے پاس ہوتے تو اچھا ہوتا آپ شریک غم ہیں اور اہل دل میرے تمام خیالات اور فلسفہ پر ہنوز شدت الم غالب ہے ۔ سینہ میں الجھن، دماغ میں گرمی محسوس ہوتی ہے ۔ بہت کم روتا ہوں لیکن دل ہر وقت بھرا ہوا اور آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبائی رہتی ہیں کوشش کرتا ہوں کہ ہاشم کے بدلے ہاشم آفریں کا تصور کر کے اس سے فریاد کروں، مدد چاہوں لیکن وہ بھولی صورت اور پیاری آواز چشم و گوش پر ہنوز محیط ہے ۔ پھر اس بچے کے ارمان، اس کی بے بسی، اس کا اللہ اللہ کرتے رہنا، نازوں کو چھوڑ کر اس چودھویں سال کی عمر میں بیکسانہ اور عاجزانہ فریاد پر آجانا ۔

معاذاللہ ان باتوں کی یاد دل پر بجلی گراتی ہے۔ میں تو اُس کا مذہبی فلسفہ تلاش کرتا ہوں یا قرآن وحدیث سے کوئی توضیح تاکہ دل کو فی الجملہ تسکین ہو۔ وہ لڑکا میری طبیعت کے سانچے میں ڈھل رہا تھا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتا ہوں۔ افسوس ہے کہ اس کے معانی پر پیشتر سے غور کرکے ان حوادث کے لئے تیار نہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ کون تیار ہوتا ہے۔ انا للہ کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی خدا کے لئے لڑکا بھی خدا کے لئے۔ میں سمجھتا تھا لڑکا میرے لئے۔"

مکاتیب اکبر بنام عبدالماجد صاحب بی اے

۱۴ ستمبر ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۶

میرا لڑکا سید ہاشم جو نہایت ذہین، ہونہار، توانا، بالا بلند، موزوں طبع، عاقل، خدا پرست شعر فہم، میرا خادم ومشیر تھا اور جس نے چودھویں سال میں قدم رکھا تھا یکایک مرض سرسام میں مبتلا ہوکر مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگیا۔ بی بی پہلے مر چکی تھیں۔ وہی لڑکا دنیاوی زندگی کا سہارا تھا۔ مذہب اور فلسفۂ تصوف نے دیوانگی سے محفوظ رکھا لیکن بے حد افسردہ اور دنیا سے بے تعلق ہوگیا ہوں ہوش وحواس سے مجبوری ہے۔

مرگ ہاشم ۵ جون ۱۹۱۳ء

اک زمانہ تھا کہ مجھ کو اپنے دل پر ناز تھا
ہر مصیبت میں وہ میرا مونس ودمساز تھا

بزم ہستی میں کدورت سے رہا تھا پاک
گو حوادث کے لئے اک فرش پا انداز تھا

میرے ہر اندیشۂ مضطر کا تھا وہ غمگسار
ہر نفس میرے لئے وہ گوش برآواز تھا

انقلاب دہر سے بے اعتنائی تھی اسے
اس میں حیرت آفرینی تھی تو وہ طناز تھا

پیش آیا ناگہاں وہ اک فراق روح سوز
برق بیتابی بنا جو صبر میں ممتاز تھا

اب وہی آرام جان اک زخم پہلو ہوگیا
کیا یہی وہ دل ہے اکبرؔ مجھ کو جس پر ناز تھا

ہاں وہی دل ہے کہے گا تجھ سے اک دن ناز سے
تیرا صدمہ خوبیٔ انجام کا آغاز تھا

فریاد مجنونانہ

جس سے میری زندگی تھی مرگیا۔کیوں مرسکا
چرخ نے یارب ستم مجھ پر کیا۔ کیوں کرسکا

واقعات جانگزا کا کیوں ہوا ایسا وقوع
کیوں نہ میری آہ سے قانون فطرت ڈرسکا

صدمۂ فرقت میں کرکے مبتلا
آج ہاشم عازم جنت ہوا

قوت بازوئے عشرت چل بسی
اور مرا نور نظر رخصت ہوا

بڑے بھائی کے لئے چھوٹا بھائی قوت بازو ہوتا ہے۔

آغوش سے سدھارا مجھ سے یہ کہنے والا
ابا سنایئے تو کیا آپ نے کہا ہے

اشعار حسرت آگیں کہنے کی تاب کس کو
اب ہر نظر ہے نوحا ہر سانس مرثیا ہے

مرگ ہاشم

دست بستہ پا شکستہ دل فسردہ لب پہ مہر
کچھ نہ کچھ کرتا ہے ہر اک اے خدا میں کیا کروں

یہ دل بیتاب مجھ کو کر رہا ہے کیوں تباہ
ہوگئی اک بات تھا حکم قضا میں کیا کروں

نزع میں پیک اجل سے کہہ رہا تھا اک حسیں
تو قضا لایا ہے سر پر اب ادا میں کیا کروں

شکوۂ بیداد کرتا ہوں تو کہتا ہے فلک
خود بخود مجھ سے ٹپکتی ہے جفا میں کیا کروں

آخری لمحات زندگی

از شفق رضوی عماد پوری

۹ محرم ۱۳۴۰ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) ۳ بجے دن کو حضرت لسان العصر نے داعی اجل کو لبیک کہی آٹھ روز مرض پیچش میں مبتلا رہ کر رحلت سے دو دن پہلے بیہوشی طاری ہوگئی کسی کو نہ دیکھتے تھے نہ پہچانتے تھے۔ زندگی کی آخری رات سنبھالا تھا۔ ہوش آیا تو اٹھ بیٹھے اور فرمایا عینک لاؤ قرآن شریف پڑھوں گا کہا گیا رات ہے صبح کو تلاوت فرمائیے گا۔ نگاہ پر زور پڑے گا۔ ارشاد ہوا اب تک میری کوئی نماز تہجد سمیت قضا نہیں ہوئی اور نہ تلاوت ناغہ ہوئی اب بھی پڑھنا

ہتا ہوں یہ کہتے کہتے پھر غشی طاری ہوئی۔

حسن نظامی صاحب لکھتے ہیں:-

جمعہ کے دن گیارہ بجے میں دہلی سے الہ آباد پہنچا۔ اس وقت حضرت کے فرزند عشرت حسین کے سوا کوئی اور احباب و اقربا میں موجود نہ تھا حضرت گاؤ تکیئے کے سہارے لیٹے تھے، آنکھیں نیم باز تھیں پتلیاں اوپر کو چڑھ چکی تھیں، ناک کا بانسہ ڈھل گیا تھا، آخری پسینہ آرہا تھا پانوں سمیٹے ہوئے تھے قریب بیٹھا تو عشرت میاں نے کہا خواجہ صاحب دلی سے آگئے ہیں اس کا جواب نہ دیا، میں نے ہاتھ کو اٹھا کر چوما اور آنکھوں سے لگا جب بھی بظاہر ان کو خبر نہ ہوئی۔ اسکے بعد حزب البحر آواز سے پڑھنے لگا اور جب یہ فقرہ پڑھا نعم الرب ربی و نعم الحسیب حسبی (اچھا خدا میرا خدا اور اچھا ٹھکانا میرا ٹھکانا) عین اللہ ناظرۃ الینا (خدا کی آنکھ ہماری طرف دیکھ رہی ہے) تو اسی طرف ہاتھ کر دیا اور میں نے کئی بار تکرار کی حزب البحر کے بعد میں کلمہ پڑھنے لگا اور جب میں نے پڑھا لاموجود الا اللہ تو حضرت کے ہاتھ میں رعشہ کی جنبش ہوئی اور میں نے دیکھا ہونٹوں کو بھی جنبش ہے کچھ پڑھ رہے ہیں اسی طرح رفتہ رفتہ سانس ہلکی ہونے لگی اور تین بجنے میں تین منٹ باقی تھے کہ سانس ختم ہو گئی اور زندگی پوری ہو گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

تجہیز و تکفین

جناب مولانا عبدالکافی صاحب دام فیضہ نے غسل دیا شہر الآباد خسرو باغ کے قریب دہلی والی سڑک کے متصل جو قبرستان کالے ڈانڈے کے نام سے مشہور ہے اس قبرستان میں اپنے والد ماجد کے بائیں جانب دفن کئے گئے بارش زیادہ ہونے کے سبب شہر میں عام خبر نہ ہوئی رات کے دس بجے گئے تھے اس لئے آدمیوں کا مجمع نہ ہو سکا تقریباً پچاس آدمی جنازہ اٹھانے اور دفن کرنے میں شریک تھے قبر میں جب مرحوم کی لاش اتاری گئی اور کفن کھولا گیا تو آنکھیں کھلی ہوئی تھیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی چیز کو بہت غور سے دیکھ رہے ہیں اس وقت حاضرین کو ان کا یہ شعر یاد آگیا ؎

قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی نظر ۔ زہر سمجھا تھا جسے وہ شربت دیدار تھا

تاریخ وفات لسان العصر سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی

گفت با عقل اسد چوں بشنید | خبر ختم حیات اکبر
چیست تاریخ وفات اکبر؟ | گفت "تاریخ وفات اکبر" ۱۹۲۱

محمد اسد اللہ خاں، بی۔ اے، ملتان

خواجہ حسن نظامی

موت نے ۱۶ محرم ۱۳۴۰ھ کو جمعہ کے دن خود حضرت اکبر کی زندگی کا مباحثہ ختم کر دیا۔

(خطوط حضرت اکبر الہ آبادی)

سب سے آخری دو شعر

موت کی غشی طاری ہونے سے پہلے بیاض خاص میں دو شعر لکھے تھے جو کئی آدمیوں کی مدد سے بمشکل پڑھے گئے ؎

صاحب میں سب برائی لیکن وہ خوب چوکس | گاندھی میں سب بھلائی لیکن وہ محض بے بس
دنیا تو چاہتی ہے ہنگامہ پر وجن | اور یاں ہے جیب خالی جو ل گیا وہ بھوجن

عمر

قمری حساب سے ۱۲۶۱ھ سے ۱۳۴۰ھ تک = ۱۳۴۰ − ۱۲۶۱ = ۷۹ برس ایک دوست کو ۱۹۱۷ء میں خود لکھا تھا کہ میری عمر ۷۵ سال قمری سے تجاوز کر چکی ہے۔

انگریزی حساب سے ۱۸۴۶ء سے ۱۹۲۱ء تک = ۱۹۲۱ − ۱۸۴۶ = ۷۵ برس